دیارِ غیر میں رہنے والوں کا اپنے دیس اور وطن سے تعلق اور ان ٹوٹ رشتوں پر مشتمل ایک خوبصورت تحریر
ان لوگوں کا احوال جو کہیں بھی جائیں، اپنا وطن اور اپنا اصل ہمیشہ یاد رکھتے ہیں

فاصلوں کا زہر

طاہر جاوید مُغل

انگلینڈ میں کبھی بھی اس کی آنکھ اتنی سویرے نہیں کھلی تھی۔ اسے گھرر............ گھرر............ کی مدہم آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس نے دو تین مرتبہ کروٹ بدلی مگر نیند آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔ وہ بے چین سا ہو کر بستر سے اٹھ بیٹھا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر لیٹ گیا اور چھت کو گھورنے لگا۔ نیم تیرگی میں چھت کے پرانے جالے اور زیادہ اندھیرے دِکھ رہے تھے۔ پورے کمرے میں ایک بے نام سی بُو رچی ہوئی تھی۔ وہ جب انگلینڈ سے پاکستان آیا تھا تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے گاؤں میں رات گذارنا نصیب ہوگا۔

اس کی پیدائش پاکستان کی تھی۔ مگر جب وہ پانچ برس کا ہوا تو والدین کے ساتھ انگلینڈ شفٹ ہوگیا۔ اس کے ماموں کا انگلینڈ میں کافی بڑا کاروبار تھا۔ یہ لوگ پھر وہیں سیٹ ہوگئے۔ اس کی ماں بڑی رعب والی خاتون تھی۔ اس کا باپ اس کی ماں سے دبتا تھا۔ شاید اسی لیے وطن چھوڑنے پر مجبور ہوا تھا۔ اسے اپنا ملک چھوڑنا کسی صورت گوارا نہ تھا۔ مگر بیوی کی ناراضگی سے ڈرتے ہوئے اسے یہ قدم اٹھانا پڑا تھا۔

اس کے باپ کو فوت ہوئے تین سال گذر چکے تھے۔ اس کی خواہش رہی تھی کہ اس کا بیٹا نبیل پاکستان ضرور جائے۔ اس نے اکثر اوقات اپنی اس خواہش کا اظہار بیٹے کے سامنے کیا تھا۔ مگر وہ ناک بھوں چڑھا کر رہ جاتا تھا۔ بیوی خاوند کی عزت کرے تو اولاد باپ کا احترام کرتی ہے۔ نبیل نے کبھی باپ کی عزت نہیں کی تھی۔

''بیٹا! سچ بتا تیرا دل کبھی نہیں چاہا کہ تُو پاکستان جائے؟'' احسن نذیر نے بستر مرگ پہ لیٹے ہوئے کہا تھا۔

''آپ نے رات والی میڈیسن لی یا نہیں............'' وہ باپ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا!

احسن نذیر غم کے آنسو پی کر رہ گئے۔

''ماما نے کہا تھا رات والی میڈیسن کا ناغہ نہیں کرنا............'' وہ ساتھ پڑی تپائی کے دراز میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''بیٹا جب تُو پاکستان جائے گا نا............ تو اپنے گاؤں ضرور جانا .... گاؤں کے لوگوں کو بتانا کہ میں حسنے کا بیٹا ہوں............ پھر............ پھر............'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ ان کی آنکھوں میں جھلملاتے پانی میں عجیب سی چمک نمودار ہوئی اور وہ بھرپور انداز میں مسکرا اٹھے۔

نبیل اتنے میں کمرے سے باہر نکل چکا تھا۔ نبیل سے چھوٹے دو بہن بھائی تھے۔ دونوں ہی نبیل سے مختلف نہ تھے۔ ان کی ماں انوری بیگم نے ان کی تربیت ہی اس انداز میں کی تھی۔ انوری بیگم کا اکلوتا بھائی عرصے سے انگلینڈ میں مقیم تھا۔ اس نے اپنی بہن اور بہنوئی کو پاکستان سے بلا لیا تھا۔ جب وہ انگلینڈ پہنچے تو نبیل پانچ سال کا تھا۔

شکیل اور عینی کی پیدائش انگلینڈ میں ہوئی تھی۔ سیٹھ افضل نے اپنے بہنوئی احسن نذیر کو کاروباری طور پر مستحکم کر دیا۔ پھر وہ وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ احسن نذیر نے پاکستان جانے کی بارہا کوشش کی مگر کچھ ناگزیر مجبوریوں کے تحت نہ جا سکے۔ پھر............ وہ آ جا کر پتا نہیں کیوں نبیل کو ہی

پاکستان جانے کا کہتے تھے؟ حالانکہ چھوٹا بیٹا شکیل بھی تھا مگر انہوں نے کبھی اس سے اس خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔

نبیل کے ماموں کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ دونوں گھرانے آپس میں خاصے بے تکلف تھے۔ ماموں کی خواہش تھی کہ اس کی دونوں بیٹیاں بہن کے گھر چلی جائیں۔ بچوں کے ذہنوں میں خاصی ہم آہنگی بھی پیدا ہو چکی تھی۔ جب سوچوں کو ایک جگہ تک محدود کر دیا جائے، ان کی پرواز پر پابندی لگا دی جائے تو ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ دونوں لڑکوں کی بات ماموں کی لڑکیوں سے طے ہو چکی تھی۔ بس رسمی کاروائی باقی رہ گئی تھی۔ احسن نذیر کے علاوہ کسی کو ان رشتوں پر اعتراض نہیں تھا مگر ان کی کیا مجال تھی کہ بیوی کے سامنے بولتے۔ ان کی دلی چاہت تھی کہ نبیل کا رشتہ وہ اپنی مرضی سے کریں مگر وہ ایسا نہ کر سکے اور یہی خواہش لیے راہی عدم ہوئے۔ گویا کئی تمناؤں کا ایک باب ختم ہو گیا۔

اشک بار ارمانوں کا سفر تھم گیا۔ زندگی روانی سے دوڑی چلی جا رہی تھی۔ بڑی بڑی شاہراہیں، بلند پُر سکون عمارتیں، روشنیاں اُگلتے بازار، مستی میں چور بے ہودہ نائٹ کلب جہاں آزادی کے نام پہ شیطان برہنہ رقص کرتا تھا۔ جہاں انسانی اقدار کا بڑے بھونڈے انداز میں تمسخر اڑایا جاتا تھا۔ یہ ایک مشینی خود کار عمل تھا اور سب اس کے کل پرزے، نبیل کی اپنی گرل فرینڈز تھیں۔ عینی اور ماموں کی دونوں بیٹیوں سومی، رومی کے بھی اپنے اپنے بوائے فرینڈز تھے۔ گو وہ ایک دوسرے سے ایسی باتیں چھپاتے تھے مگر سب ایک دوسرے کے بارے میں جانتے تھے پھر بھی انجان بنے پھرتے تھے۔ جیسے انہوں نے بے ہودگی کے نام پہ ایک سمجھوتا کر لیا تھا۔ عشق و پیار ایسی جگہوں پہ ناپید ہوتا ہے۔ محبت ان مقامات سے کنی کترا کر گزر جاتی ہے۔

احسن نذیر کو وفات پائے تین سال ہو چکے تھے۔ اس دن نبیل جلد گھر لوٹ آیا تھا۔ اس کی طبیعت کچھ بوجھل ہو رہی تھی۔ وہ خواب آور گولیاں کھا کر سو گیا۔ اس کے باوجود آدھی رات کو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے کندھوں پہ انجانا بوجھ پڑا تھا۔ وہ خود کو تھکا تھکا محسوس کر رہا تھا۔ اسی شام اس نے اپنی سب سے محبوب گرل فرینڈ کو ایک لڑکے کے ساتھ دیکھا تھا۔ بظاہر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی مگر پھر بھی وہ کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔ انسان انسان ہوتا ہے معاشرتی اطوار اس کے احساسات کو نہیں بدل سکتے۔

اگلے دن وہ ایک پارک میں اپنی گرل فرینڈ ''میری'' سے ملا اور چھوٹتے ہی پوچھا۔

''کل تم کہاں رہیں.........؟''

''آفس کا بہت ضروری کام تھا۔ اسی سلسلے میں منیجر کے ساتھ گئی تھی۔''

''کام ہو گیا.........؟''

''کچھ ہو گیا ہے کچھ باقی رہ گیا ہے۔''

وہ لمبی سانس کھینچ کر رہ گیا۔

''نبیل! تم کچھ اُلجھے اُلجھے دکھائی دے رہے ہو.........'' اس نے پیار سے اس کے کندھے پر سر رکھ کر کہا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں.........'' وہ دلی کیفیت چھپاتے ہوئے بولا۔

''آؤ آج لمبی ڈرائیو پہ چلتے ہیں۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

اس نے کچھ تر ڈد کیا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ میری سرخ کار ڈرائیو کر رہی تھی اور اس کی نظریں کھلی چھت سے دور نیلے امبر کا نظارہ کر رہی تھیں۔ وسیع وعریض سڑک پر کاریں اور ٹرک دوڑے چلے جا رہے تھے۔ زندگی کتنی مصروف تھی۔ پوری دنیا میں اس وقت اَن گنت کاریں موٹریں، ٹرک دوڑ رہے ہوں گے۔ لوگ ایک دوسرے سے معاملات طے کر رہے ہوں گے۔ کاروباری لین دین ہو رہا ہوگا۔ مارکیٹ و بازاروں میں مناسب نرخوں کے لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر قائل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہوگی۔ کہیں محبت کی جا رہی ہوگی کہیں محبت کے نام پہ دھوکہ دیا جا رہا ہوگا۔

وہ سوچنے لگا جس کے ساتھ کار پر جا رہا ہے۔ اس نے کتنوں کو دھوکا دیا ہوگا، کتنوں کو اپنی جھوٹی محبت کا یقین دلایا ہوگا۔ ابھی اس نے کل ہی تو اسے ایک سیاہ فام لڑکے کے ساتھ دیکھا تھا اور آج وہ اس کے ساتھ لمبی ڈرائیو پر جا رہی تھی۔ اپنے جھوٹے پیار کا یقین دلانے جا رہی تھی۔ انسان اپنی اغراض کے لیے کتنا کمینہ ہو جاتا ہے۔ پھر اسے یاد آیا وہ بھی تو کمینہ ہے۔ اپنی ہونے والی منگیتر کو دھوکہ دے رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر کسی اور کی بانہوں میں دن گزار رہا ہے۔ مگر............ رومی کے بھی تو بوائے فرینڈ ز ہوں گے وہ ان کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے جاتی ہوگی اور اس کے کالج کا ایک لڑکا تو اس کے ساتھ گھر بھی آیا تھا۔ اس نے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا کلاس فیلو ہے اور بہترین دوست بھی ہے۔'' اس کا دم گھٹنے لگا۔

''دیکھو کتنی پیاری دھیمی ہوا چل رہی ہے۔'' میری بازو ہوا میں لہراتے ہوئے بولی۔

''ہاں............ شاید............'' اس نے بے دلی سے کہا۔ وہ سوچنے لگا۔

کہیں دنیا اس سے مختلف بھی ہوگی۔ جھوٹ و فریب سے پاک............ جواب آیا نہیں............ علاقے اور جگہیں بدل جانے سے انسانی فطرت نہیں بدل جاتی۔

مگر سب انسان ایک جیسے تو نہیں ہوتے اور اگر ایسا ہوتا تو خدا جنت، جہنم کبھی نہ بناتا اس کے دل کو ہلکا سا قرار آگیا۔ وہ مسلمان تھا مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ خدا اور نبی ﷺ پر یقین رکھتا تھا مگر بات اس سے آگے کبھی نہیں بڑھی تھی۔ بچہ ایک نازک کونپل کی مانند ہوتا ہے۔ اس کی پرورش کرنے والے اسے اپنے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ بچہ بڑوں کے اطوار اپناتا ہے۔ انوری بیگم اور اس کے بھائی کا گھرانہ صرف نام کا مسلمان تھا۔ آگے اولاد نے بھی وہی روش اپنائی تھی مگر اب نبیل میں اندر ہی اندر کوئی تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ وہ زندگی کی حقیقت کو جاننا چاہتا تھا۔ زندگی کی تمام رنگینیاں دیکھ چکا تھا۔ اب ستاروں سے آگے جو جہاں تھے انہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ شاید وہ ایک جیسی زندگی گزارتے گزارتے اکتا چکا تھا۔ کچھ اچھوتے پن کی تلاش میں تھا۔

مگر آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ جس سے بھی ملتا کچھ اکھڑا اکھڑا سا رہتا۔ اس کے دوست احباب کو اس سے شکایت رہنے لگی۔ اسے نفسیاتی مریض ہونے کا طعنہ دیا جانے لگا مگر وہ ان باتوں سے بے نیاز تھا۔ وہ جستجو میں تھا اسے کسی چیز کی تلاش تھی............

☆............☆............☆

ہر روز پروین صبح سویرے اٹھ جاتی تھی مگر آج آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ سورج کی تیز کرنیں اس کے حسین چہرے پہ پڑیں تو وہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ جلدی سے بکھری زلفوں کو دونوں ہاتھوں سے پیچھے کی طرف درست کیا اوڑھنی سختی سے کھینچ کر چہرے کے گرد لپیٹی۔ کہیں ایک بال بھی اوڑھنی سے باہر نہ رہ جائے۔ اوڑھنی کو سینے پر پھیلایا۔ جلدی میں سیڑھیوں سے نیچے اتری اور مٹی سے پوتے ہوئے کھلے صحن میں لگے ہوئے ہینڈ پمپ پہ جا کر وضو کرنے لگی۔

''پروین بیٹی! نماز کا ویلہ نہیں ہے اب.........'' جنت بی بی دودھ بلوتے ہوئے باورچی خانے سے بولی۔

''ماں، تو نے مجھے اٹھایا کیوں نہیں؟ تجھ سے کہا بھی ہے جب آنکھ نہ کھلے تو اٹھا دیا کر۔ وہ رو دینے والے انداز میں بولی۔''

''بیٹا! بھول گئی تھی.........اچھا اب نہیں بھولوں گی.........''

''تیرے اچھا کہنے سے میری نماز تو نہیں لوٹ آئے گی۔'' وہ ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

''میں صدقے جاؤں.........میری پیاری بیٹی.........'' جنت بی بی نے مکھن لگے ہاتھ پرے رکھتے ہوئے کہنی سے اسے ساتھ لگا لیا۔

''اچھا بیٹی! تو ذرا جلدی سے آٹا گوندھ میں چولہا گرم کرتی ہوں.........تیرا ابا ایڑیاں اٹھا اٹھا کر تیرا انتظار کرتا ہوگا۔'' جنت بی بی مکھن کا بڑا پیڑا تسلے میں رکھ کر بولی۔

''ماں! آٹا کہاں ہے.........؟''

''اندر کمرے میں چکی کے پاس پڑا ہے.........تسلے میں بھر لا.........''

پروین تیزی سے آٹا گوندھنے لگی۔ جنت بی بی چولہے میں لکڑیاں جھونکنے لگی۔ آٹا گوندھنے سے پہلے وہ اچھی طرح اوڑھنی جسم پہ لپیٹ لیا کرتی تھی۔ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکتا رہتا تھا۔ دراز سیاہ پلکیں یوں ساکت رہتی تھیں جیسے لرزنا نہ جانتی ہوں۔

روٹی رومال میں باندھے وہ کھیتوں کی طرف چلی جا رہی تھی۔ جلد ہی اسے ابا کھیتوں میں کام کرتا نظر آنے لگا۔ بیٹی کو دیکھتے ہی دین محمد نے کسی ہاتھ سے چھوڑ دی اور ایک پگڈنڈی پہ آ بیٹھا۔ اس نے پسینہ پونچھ کر بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ پروین نے سعادت مندی سے رومال سے روٹی کھول کر باپ کے آگے کر دی۔ دین محمد روٹی کھانے لگا اور لسی گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔

کھانے کے بعد وہ برتن واپس لے جانے لگی تو لسی کا کجا ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹ گیا۔ پروین کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ''کیا ہوا بیٹا۔ رو کیوں رہی ہو؟ ٹوٹنے والی چیز تھی ٹوٹ گئی۔'' دین محمد محبت سے بولا۔

''ابا تجھے نہیں پتا آج میری فجر کی نماز قضا ہو گئی ہے نا.........اس لئے.........اس لئے ہر کام الٹا ہو رہا ہے۔ ابھی سارا دن پڑا ہے۔ پتا نہیں اور کیا کیا ٹوٹے گا۔''

وہ قہقہے لگا کر ہنسنے لگا۔ ''او.........سوہنی.........بھولی دھیئے.........نماز قضا ہو گئی ہے تو قضائی دے لو.........اللہ میاں سے معافی مانگ لو.........وہ بڑا کھلے دل والا ہے.........'' بات پروین کی سمجھ میں آ گئی اور وہ گھر کو چل دی۔

جنت بی بی تمام کاموں سے فارغ ہو کر تسبیح پر کچھ پڑھ رہی تھی۔ پروین کو دیکھتے ہوئے ہاتھ کے اشارے سے باورچی خانے کی طرف اشارہ کیا۔ پروین ماں کا اشارہ سمجھتی تھی۔ اسے علم تھا ماں ذکر کرتے ہوئے نہیں بولتی۔ اس کے ہاتھ کا اشارہ کہہ رہا تھا ناشتہ کر لو۔ پروین دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ دونوں بھائی لاہور شہر میں کام کرتے تھے۔ ایک مہینے بعد گھر لوٹتے تھے ان لوگوں کو روپوں کی کمی نہیں تھی۔ وہ بارہا اپنے والد دین محمد سے کہہ چکی تھی۔ ''ابا تو کھیتوں میں کام کرتا ہے تو کچھ اچھا نہیں لگتا.......... جس کے دو جوان بیٹے ہوں اسے گھر بیٹھ کر آرام کرنا چاہیے۔''

''بیٹا! میں روپے پیسوں کے لیے تھوڑا کھیتوں میں کام کرتا ہوں.......... مجھے تو بس زمین سے پیار ہے۔ مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میں کھیتوں میں ہل نہ جوتوں گا، کسی کھالے کے قریب بیٹھ کر حقہ نہ گڑگڑاؤں گا تو میرا دم گھٹ جائے گا۔''

بیٹوں نے دین محمد کو اس کے حال پہ چھوڑ دیا تھا۔ انہیں علم تھا ''ہم سو کہیں ابا یہ کام چھوڑنے والا نہیں۔'' پھر جس حال میں وہ خوش تھا انہیں کیا ضرورت پڑی تھی ابا کو ناخوش کرنے کی۔

پروین ناشتے سے فارغ ہو کر اپنے حصے کے کام نمٹا کر رشیداں ملکانی کی حویلی میں چلی گئی۔ کھلے وسیع و عریض صحن کے درمیان میں بکائن کا بڑا درخت اپنی شاخیں پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کے نیچے چارپائیاں رکھیں تھیں۔ وہ روزانہ فارغ ہو کر یہاں چلی آتی تھی۔ گاؤں کی تمام لڑکیاں یہاں اکٹھی ہوتی تھیں۔ خوب محفل جمتی تھی۔ رشیداں ملکانی لڑکیوں کو لہک لہک کر اپنے بچپن کے قصے سناتی اور لڑکیاں دم بخود ہو کر وہ سب سنتیں۔

اسی دوران لڑکیاں مختلف کام بھی نمٹاتی جاتیں۔ جب کبھی رشیداں ملکانی اٹھ کر اندر چلی جاتی تو لڑکیوں کی اپنی باتیں شروع ہو جاتیں۔ وہ سرگوشیوں کے انداز میں ایک دوسرے سے باتیں کرتیں۔

''ڈوگراں کا بڑا لڑکا بڑا جوان نکلا ہے۔ سنا ہے ڈھائی من کی بوری ایک ہاتھ سے کندھے پر رکھ لیتا ہے۔''

''اور وہ پھیکا بھائی بھی تو کچھ کم نہیں.......... ماشاء اللہ خدا نے بہت زور دیا ہے اسے۔''

''اس دفعہ کبڈی ہمارا گاؤں ہی جیتے گا۔''

''اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا..........''

سنا ہے ''شاہ مدین'' کے میلے پر ساتھ گاؤں والوں سے کبڈی کا بڑا زوردار مقابلہ ہونے والا ہے۔''

''چاچا حیات مقابلے کے لئے لڑکوں کو بڑی تیاری کروا رہا ہے۔''

''پروین! بھائی فضل دین شہر سے کب لوٹ رہے ہیں.......... ان سا زور ان سی پھرتی پورے گاؤں میں کسی لڑکے میں نہیں ہے۔''

''آخر بھائی کس کا ہے..........'' پروین چنری سیدھی کرتے ہوئے بولی۔

اس کی جان جیسے بھائیوں کے اندر تھی اور دونوں بھائی بھی اس پر جان چھڑکتے تھے۔ وہ جب بھی شہر سے واپس لوٹتے پروین کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لے کر آتے۔ جب وہ دو چار دن گاؤں میں رہنے کے بعد شہر واپس جاتے تو پروین کے ہاتھ سے بنی ہوئی دیسی گھی کی پنیری اور چاولوں کی پنیاں اپنے ساتھ لے جاتے۔

شاید کسی علاقے کی مٹی اور پانی ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہاں کے لوگ بڑے محبت والے ہوتے ہیں۔ وہ پورا گاؤں گویا جسدِ واحد کی مانند تھا۔ دن ہو یا رات لڑکیاں جہاں چاہتی چلی جاتیں۔ کوئی ان پر بُری نگاہ ڈالنے والا نہیں تھا۔ گاؤں کے گھبرو جوان 'ماں بہن' کو دیکھ کر نگاہیں نیچی کر لیا کرتے تھے۔ گاؤں کا ہر فرد دوسرے کو اتنی اچھی طرح ہی جانتا تھا جتنا اپنے گھر کے فرد کو جانتا تھا۔ اگر گاؤں کے کسی فرد کے کردار پر شبہ ہوتا تو فضل دین اور علم دین کبھی اپنی جوان بہن کو چھوڑ کر شہر نہ جاتے۔

''پروین! ماسی عائشاں سے سنا ہے چاچی نے تیرا سارا جہیز تیار کر لیا ہے۔ کب شادی کروا رہی ہے۔ دلہا راجہ کیا شہر سے آئے گا.........'' ایک لڑکی نے اسے ٹہوکا دیا۔

شرم کی سرخی اس کے سارے چہرے پر پھیل گئی۔ اس کا جسم لرزنے لگا۔

''شرم تو نہیں آتی ایسی بات کرتے ہوئے.........'' وہ سر پہ اوڑھنی درست کرتے ہوئے بولی۔ ساری لڑکیاں کھلکھلا کر ہنسنے لگیں۔

''اری تجھے تو کوئی شہزادہ ہی بیاہنے آئے گا........... ہماری........... شہزادی جو ہوئی تو..........'' ایک لڑکی نے اس کے گال پہ چٹکی لی۔

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اتنے میں رشیداں ملکانی پہنچ گئی۔

''ارے........ پروین بیٹی کیوں رو رہی ہے.........''

''شادی کی بات پر بیچاری کے آنسو نکل آئے۔'' ایک لڑکی نے سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

ملکانی مسکراتے ہوئے اسے خود سے لگا کر اس کا گال تھپکنے لگی۔

''پگلی! یہ کوئی رونے والی بات ہے.........؟''

شام کو بھینسوں کو چارہ ڈال کر، گھر کے ڈھیروں کام سمیٹ کر اور دین محمد کا حقہ تازہ کر کے جب وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا رہی تھی۔ تو وہ تھکن سے چور تھی۔ ایسا روزانہ ہوتا تھا تھکن کی وجہ سے بستر پر پڑتے ہی نیند آ جاتی تھی۔ مگر نیند کی دیوی نہ جانے کیوں آج اس سے روٹھ گئی تھی۔ وہ بستر پر لیٹی تھی اور کانوں میں آواز گونج رہی تھی۔

''کب شادی کرا رہی ہے۔ دلہا راجہ کیا شہر سے آئے گا.........''

ہر لڑکی پر یہ وقت آتا ہے۔ جب وہ نہایت سنجیدگی سے اپنے ہونے والے جیون ساتھی کے بارے میں سوچتی ہے۔ لمحہ لمحہ اسکی سانسیں ٹوٹتی ہیں۔ کبھی وہ خود سے شرمانے لگتی ہے۔ کبھی دل گھبرانے لگتا ہے۔ کبھی پیاری شگفتہ ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ پروین کے ساتھ آج ایسا پہلی بار ہو رہا تھا۔

وہ آج نہایت سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔ وہ کون ہوگا جو اس کی آخری سانس تک کا ساتھی بنے گا؟ کیسا ہوگا؟ کہاں کا رہنے والا ہوگا؟ آج سے پہلے اس نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔ پھر آج کیوں یہ سوچیں ذہن پہ یلغار کیے جا رہی تھیں؟ یہی سوچیں سوچتی وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

☆..........☆..........☆

اسے خود علم نہیں تھا اسے کسی چیز کی تلاش ہے۔ گھر بار تھا، کار تھی، تمام آسائشیں تھیں۔ روپوں کی کمی نہیں تھی۔ یاری دوستی بھی خوب تھی۔ گھر والے اس سے خوش تھے۔ مگر کہیں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ اس کے دل میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا تھا جو پر ہونے میں نہیں آتا تھا۔ ایک تشنگی تھی جو سیراب ہونے میں نہیں آتی تھی۔ اس کی گرل فرینڈز تھیں، خوبصورت منگیتر روی تھی۔ پھر وہ کیوں اداس رہنے لگا تھا۔ شاید اس کے اندر کوئی زبردست تبدیلی آرہی تھی۔ دھندلی دھندلی یادوں کے من موہنے پنچھی اس کے وجود میں چہچہانے لگے تھے۔ دور کسی دور دراز علاقے سے کوئی سُر اٹھ رہا تھا، بکھر رہا تھا مگر اس تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ ہونٹ ہلتے نظر آتے تھے۔ مگر آواز ناپید تھی۔

وہ آگے بڑھنا چاہتا ان دھندلی یادوں کو سمجھنا چاہتا۔ مگر اندھیرا چھا جاتا تھا۔ تیرگی غالب آجاتی تھی۔ وہ اندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں چلانے لگتا۔ مگر ایسا کرنے سے اندھیرا نہیں چھٹتا، روشنی کی کرن نہیں پھوٹتی۔ ہاں روشنی کی کرن اس دن پھوٹی جب وہ ایک ریستوران میں بیٹھا بیئر پی رہا تھا۔ بیئر کا گھونٹ اندر انڈیل کر وہ سگریٹ جلانے لگا۔ میری نے اس دن اسے جارج پارک میں آنے کا کہا تھا مگر وہ نہیں گیا تھا۔ جس دن سے اس نے اسے ایک لڑکے کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کا جی اٹھ گیا تھا۔ وہ دھواں فضا میں چھوڑ کر سڑک کے اس پار دیکھنے لگا۔ جہاں ایک انگریز اپنے چھوٹے بچے کو کندھوں پر بٹھائے جھومتا چلا جارہا تھا۔ اس کے ذہن میں چمک سی نمودار ہوئی۔ دھندلی یادوں کی اندھیری چادر سے روشنی کی چھوٹی سی کرن پھوٹی۔

کندھوں پر بیٹھا وہ خود کو کتنا اونچا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے بہت بلند عمارت کی چوٹی پر کھڑا ہو۔ اس کے آس پاس کسی قدر ہجوم تھا۔ جیسے ساری دنیا کے انسان ایک جگہ پہ اکٹھے ہو گئے ہوں۔ اس کے ننھے سے ذہن کو مزا بھی آرہا تھا۔ ہلکے سے خوف کی آہٹ بھی پریشان کیے جارہی تھی۔

پھر یکدم سارا منظر آنکھ سے اوجھل ہو گیا۔ نبیل سٹپٹا کے رہ گیا۔ یہ دھندلی یادیں کس وقت کی تھیں؟ یہ نامکمل منظر کس زمانے کا تھا؟ وہ پھر سوچ میں غرق ہو گیا ماضی کو کھنگالنے لگا۔ دھندلا منظر پھر ابھرا۔ ایک دکان پہ مٹی سے اَٹے بہت سے خوبصورت کھلونے پڑے تھے۔ چابی والا ایک کھلونا کچی زمین پہ چل رہا تھا۔ چابی والے کھلونے کی شبیہہ اس کے ذہن پہ نقش ہو گئی۔ اس نے پورے انگلینڈ میں وہ کھلونا ڈھونڈا مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ وہ اکثر راتوں کو جاگنے لگا۔ دن کو بھی الجھا الجھا پھرنے لگا۔

ایک دن سیٹھ افضل نے نبیل سے کہا۔ ”بیٹا میں تمہیں بہت ضروری کام کے لئے پاکستان بھیجنا چاہ رہا ہوں۔“

”مگر.......... ماموں..........“

”مگر.......... وگر کچھ نہیں.......... شکیل کی طبعیت میں لاابالی پن ہے۔ ٹونی ابھی چھوٹا ہے۔ آجا کر تم ہی سمجھدار ہو اور تم ہی یہ کام کر سکتے ہو.......... کاغذات میں چند دن میں مکمل کروا دوں گا.......... تم تیاری کرو..........“

انوری بیگم نے بھی بیٹے کو جانے کی اجازت دے دی۔ حالانکہ اگر نبیل خود پاکستان جانے کی ضد کرتا تو انوری بیگم کبھی نہ مانتی..........

سیٹھ افضل کا انگلینڈ میں لیدر جیکٹس کا وسیع کاروبار تھا۔ اس کا نور منیجر بیوی کی زچگی کی وجہ سے چھٹی پہ تھا۔ مال کی سپلائی کے لیے پاکستان میں سیالکوٹ جانا بہت ضروری تھا۔ سیٹھ افضل نے چاروں طرف نگاہ دوڑا کر نبیل کا انتخاب کیا۔

وہ وسط جون کے دن تھے جب وہ پاکستان پہنچا۔

سیالکوٹ میں دو دن رہ کر اس نے ضروری کام نمٹائے۔ مال کی بلٹی جانے میں ابھی چار پانچ دن باقی تھے۔ اسے مال لوڈ کروا کر یہاں سے واپس جانا تھا۔ اتنے میں وہ گاؤں سے ہو کر واپس آ سکتا تھا وہ مرحوم باپ کی خواہش پوری کرنے کے لیے سویر پور گاؤں چل دیا۔ گاؤں کا مکمل پتہ اس کے پاس تھا اور وہ ایک کرائے کی کار پہ گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے گاؤں جانے کے لیے بڑے غلط وقت کا انتخاب کیا تھا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ جب وہ بمشکل پھوپھو کے دروازے پہ پہنچا تھا۔ گاؤں کا چوکیدار کار میں بیٹھ کر انہیں مطلوبہ دروازے پہ پہنچا کر گیا تھا۔

سویر پور گاؤں سویا پڑا تھا۔ اسے احساس ہوا وہ غلط وقت پہ چلا آیا ہے۔ بہر حال اس نے کواڑ پر دستک دی۔ دروازہ کسی ادھیڑ عمر شخص نے کھولا۔

''میں احسن نذیر کا بیٹا ہوں۔ انگلینڈ سے آیا ہوں.........''

''کون احسن نذیر پتر.........؟'' ادھیڑ عمر شخص نے نرمی سے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا۔

''ح.........حسنے.........کا پُتر ہوں جی میں.........''

ادھیڑ عمر حیرانگی سے نبیل کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر بے اختیار اسے خود سے لگا لیا.........''تو.........تو.........نبیل ہے نا.........'' اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک نمودار ہوئی۔

''ج.........جی ہاں.........'' نبیل بھی اس والہانہ پذیرائی پر حیران رہ گیا۔

وہ اس کے ہاتھ سے بریف کیس چھین کر اسے اندر لے گیا۔ اپنی گھر والی کو اٹھا کر بولا.........''دیکھ.........کون آیا ہے۔''

عورت اجنبی نظروں سے نبیل کی طرف دیکھنے لگی.........'' بھلی لوکے.........یہ تیرا بھتیجا نبیل ہے.........تیرے بھائی حسنے کا بیٹا.........''

عورت کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا اسے وہ زار و زار رونے لگی تھی۔ اس کے آنسو تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر نبیل کو ڈھیروں پیار دیا۔ اور پھر چارپائی پر بیٹھ شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے چادر کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر کھانے کے لیے کچھ لانا چاہتی تھی مگر نبیل نے منع کر دیا۔ تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں نبیل سفر کا تھکا ہوا تھا۔ اس کی پھوپھو نے تاڑ لیا۔ اس کا بستر لگا دیا گیا۔ وہ بستر پر لیٹ کر فوراً ہی سو گیا۔ سویرے اس کی آنکھ جلد ہی کھل گئی۔ گھر ر.........گھر ر.........کی مدھم آواز اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اجنبی جگہ ہونے کی وجہ سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔

وہ لیٹا ہوا چھت پہ لگے پرانے بالوں کی طرف تکے جا رہا تھا۔ ایک دو جگہ چڑیوں نے گھونسلے بنا رکھے تھی۔ ایک گھونسلے سے چڑیا بڑے دھیمے اور پیارے انداز میں چہچہا رہی تھی۔ وہ اس کی آواز غور سے سننے لگا۔ چڑیا چہچہاتی اور خاموش ہو جاتی پھر تھوڑی دیر بعد اپنے ہونے کا احساس دلاتی۔ چہچہانے کے بعد کی خاموشی میں بھی ایک گونج تھی ایک شور تھا۔ اسے لیٹے لیٹے مزا آنے لگا پھر وہ چڑیا پھر سے اڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

باہر اندھیرے میں روشنی کی ہلکی ہلکی جاگ لگنا شروع ہوگئی تھی۔ وہ اٹھ کر باہر آ گیا۔ گھرر گھرر کی آواز اب بھی ایک طرف سے آ رہی تھی۔ وہ اس طرف کو بڑھ گیا۔ اس کی پھوپھو چکی میں گندم ڈال کر پیس رہی تھی۔

وہ پھوپھو کے پاس ہی بیٹھ گیا............

''اٹھ گیا بیٹا!..........'' پھوپھو نے ایک ہاتھ سے چکی پھیرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے سر پہ پیار دیا.........

''جی ہاں پھپھو.......... یہ آپ کیا کر رہی ہیں..........؟'' نبیل چکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''بیٹا! گندم سے آٹا بنا رہی ہوں پھر آٹے سے تیرے لیے گرما گرم مکھن کے پراٹھے بناؤں گی..........''

جس گھرر گھرر سے نبیل کی آنکھ کھلی تھی وہ چکی کے پھیر کی ہی آواز تھی۔ نبیل کیلئے یہ نئی چیز تھی۔ وہ دلچسپی سے چکی سے آٹا نکلتا دیکھنے لگا۔

''لائیں پھپھو میں اسے گھماتا ہوں۔''

''رہنے دے بیٹا ہاتھ میں چھالے بن جائیں گے۔''

مگر نبیل زبردستی بیٹھ گیا۔ پھپھو کے ہاتھ سے چھین کر خود چکی کا پاٹ گھمانے لگا۔

☆..........☆..........☆

آج پھر اس کی آنکھ لیٹ کھلی تھی۔ وہ سلیقے سے دوپٹہ لپیٹ کر جلدی سے نیچے اتری سیڑھیاں کچے گارے سے بڑی نفاست سے پوتی گئیں تھیں۔ اس کا دل رو رہا تھا۔ آج پھر فجر کی نماز قضا ہوگئی تھی۔ اسے خود پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ ماں پر بھی ناراضگی ہو رہی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی باورچی خانے کی طرف بڑھی جہاں ماں آٹا پیس رہی تھی۔ چکی کی گھرر گھرر باہر بھی سنائی دے رہی تھی۔

''ماں! دیکھ آج پھر تو نے نہیں اٹھایا نا.......... میری نماز..........'' پھر اچانک اس کی نگاہ نبیل پر پڑی۔ ''ہائے میں مرگئی.......... مم..........ماں..........''

نبیل اکیلا بیٹھا چکی چلا رہا تھا۔ وہ بھی اسے دیکھ کے ٹپٹا گیا تھا۔

''وہ.......... دوسرے کمرے میں گئی ہیں گندم لینے..........'' نبیل ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

کھڑے کھڑے اس کا جسم ٹھنڈے پسینے میں ڈوب گیا۔ نہ وہ آگے بڑھ سکتی تھی نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی۔ پاؤں جیسے کچی زمین نے جکڑ لیے تھے۔ اس کا سر جھک گیا تھا اور چہرہ حیا کی سرخی سے گلابی ہو رہا تھا۔ ماں آئی تو زمین نے پاؤں چھوڑ دیے..........

''اٹھ گئی بیٹی.......... میں تو تجھے آوازیں دے دے کر ہلکان ہو جاتی ہوں۔ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتی پہلے تو تیری نیند ایسی نہ تھی..........''

وہ آگے سے کچھ نہ کہہ سکی اس کا سر تھوڑا سا اور جھک گیا۔

''بیٹی یہ دیکھ ہمارے گھر کون آیا ہے.......... یہ تیرے ماموں حسنے کا بڑا بیٹا نبیل ہے..........''

وہ دیدے پھاڑے حیرت سے اسے تکنے لگی۔ جنت بی بی بیٹھ کر دودھ بلونے لگی۔ اس نے پروین سے کہا ''بیٹی! آٹا اکٹھا کر کے گوندھ لے..........چل نبیل بیٹے تو باہر نلکے سے منہ ہاتھ دھو آ۔''

آٹا وہ روز گوندھتی تھی۔ مگر آج پتا نہیں کیوں اس کے ہاتھ نہیں چل رہے تھے۔ نظر بار بار باہر کو اٹھ رہی تھی اور دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔

جنت بی بی نے بڑی محبت سے نبیل کو ناشتہ کروایا۔ ایسا مزے کا ناشتہ اس نے زندگی میں پہلی بار کیا تھا۔ وہ انگلیاں چاٹتا رہ گیا۔ دن کا اجالا پھیل گیا تھا۔ وسیع صحن میں برگد کا درخت اسے بڑا بھلا دکھائی دیا۔ ''پھپھو!..........پھپھا کہاں ہیں..........'' نبیل نے جنت بی بی سے پوچھا تو پروین کھانا باندھتے ہوئے اسے تیز نظر سے دیکھنے لگی۔

''کھیتوں میں گئے ہیں..........کام کرنے..........''

''وہ کھیتوں میں کام کرتے ہیں؟'' نبیل نے کہا۔

''ہاں..........وہ ایسا نہ کریں تو بیمار پڑ جائیں۔ بہت سمجھایا ہے مگر نہیں مانتے..........''

''پھر تو میں بھی کھیتوں میں جاؤں گا ان کو دیکھنے..........''

پروین کا دل دھک سے رہ گیا۔

''پروین بیٹی! نبیل کو اپنے ساتھ ہی لے جا..........''

''اچھا..........ماں..........'' وہ چنری درست کر کے بولی۔ اس کی دراز پلکیں جھک گئیں تھیں۔ باہر کی چوکھٹ سے نکلنے لگی تو دونوں آپس میں ٹکرا گئے دروازہ چھوٹا تھا۔ پروین سر جھکا کر ایک طرف ہو گئی۔ نبیل تیزی سے باہر نکل گیا۔

ایک گلی چھوڑ کر جب دوسری گلی میں داخل ہوئے تو نبیل کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا وہ پہلے بھی یہاں آ چکا ہے۔ وہ گلی کی ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔

دور تک پھیلی کچی اور صاف ستھری گلی جس کے اطراف دو رویہ کچے اور صاف ستھرے مکان بہت خوبصورت نظر آتے تھے۔ جہاں کچے مکان ختم ہوئے تھے۔ وہاں سے دونوں اطراف وسیع کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ کچی دیواریں نیچی ہونے کی وجہ سے گھروں کے احاطے گلی سے نظر آتے تھے۔

تقریباً ہر گھر میں نیم، بکائن یا برگد کا درخت تھا۔ مکانوں سے ہرے لہلہاتے کھیت تاحدِ نگاہ پھیل گئے تھے۔ ایکطرف زمین فصل سے خالی پڑی تھی۔ وہاں نگاہ دور بہت دور ٹاہلی کے درختوں پر جا کر ٹھہرتی تھی۔ دیکھنے سے یوں لگتا ٹاہلی کے درختوں سے آگے زمین کا آخری کنارہ ہوگا۔

یہ سارے مناظر نبیل کی روح میں اتر گئے۔ اسکا دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ ہواؤں میں اڑنے لگا ہے۔ جیسے برسوں سے پنجرے میں قید پرندے کو کھلی فضاؤں کی آزادی مل گئی ہو۔ پروین بڑی سمٹ سمٹ کر چل رہی تھی۔ اسکی نگاہیں زمین پر گڑ کر رہ گئیں

تھیں۔

''یہاں سے ڈیرا کتنی دور ہے پروین..........؟''

نبیل نے پروین کو اس کے نام سے مخاطب کیا تو اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔

''بب..........بس.......... اس کھالے کے پار ہماری زمین ہے۔''

''پھپھا کو روزانہ صبح کھانا تم دینے جاتی ہو..........؟''

''جی..........ہاں..........''

''اتنا چلنے کے باوجود تھکتی نہیں ہو تم..........؟''

پروین کو پتا نہیں کیا ہوا چادر کا پلو منہ پہ رکھ کر ہنسنے لگی۔ نبیل حیرانگی کے عالم میں اسے دیکھنے لگا۔ اسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

نبیل نے جتنی بار یہ پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ کیوں ہنس رہی ہے۔ تو اس کے جواب میں وہ پرے منہ کر کے زور زور سے ہنس دی۔

کھالا پار کر کے وہ برگد کے ایک بڑے درخت کی طرف بڑھنے لگے۔ جون کی چلچلاتی دھوپ ہر سو پھیل چکی تھی۔ سورج ابھی سر پر نہیں پہنچا تھا۔ مگر اس کی تپش ابھی سے جسم پر چبھنے لگی تھی۔ نبیل کی کنپٹیوں پہ پسینہ چمکنے لگا تھا۔ برگد کے درخت کے نیچے دو دروازوں والا ایک کچی اینٹوں کا کمرہ بنا ہوا تھا ایک طرف ٹیوب ویل چل رہا تھا۔ ٹیوب ویل کے انجن کی ''کوکو'' بہت دور سے سنائی دیتی تھی۔ ٹیوب ویل کا جھاگ اڑاتا چاندی جیسا پانی ایک دو فٹ چوڑے کھالے میں بہتا ہوا فصلوں کو سیراب کر رہا تھا۔ دین محمد ان دونوں کو دور سے ہی زمین میں کسی چلاتا ہوا نظر آ گیا تھا۔ دونوں جلد ہی اس کے پاس پہنچ گئے۔ دین محمد نے انہیں دیکھتے ہی کسی چھوڑ کر صافے سے پسینہ پونچھا۔ اور دور سے ہی ہانک لگائی۔

''اوئے نبیل پتر! نہیں رہ سکا نہ.......... چلا آیا نا زمین پہ.......... آخر کو پتر کس کا ہے..........'' پھر قریب آنے پر مضبوطی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے بھینچا۔ ''چل آجا...... چھاؤں میں...... ارے پتر...... تجھے تو پسینہ آ رہا ہے...... یہ لے اس سے پونچھ لے..........'' وہ اپنا صافا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے صافا دوبارہ کندھے پہ ڈال لیا اور تیزی سے ڈیرے کی طرف بڑھا۔

''ٹھہر میں اندر سے صاف کپڑا لے کر آتا ہوں۔'' نبیل منع کرتا رہ گیا اور دین محمد اپنے بندوں کو آوازیں دیتا ہوا برگد کے نیچے بنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ پسینہ اب دھاروں کی صورت نبیل کے چہرے پر بہنے لگا تھا۔ جو لوگ ایسی مشقت کے عادی نہیں ہوتے ان کو گرمی بھی زیادہ لگتی ہے پسینہ بھی زیادہ آتا ہے۔ پروین نظریں چرا کر نبیل کی طرف دیکھ رہی تھی مگر نبیل کہیں اور ہی کھویا ہوا تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں گاؤں پہنچا تھا اور جب دن کے اجالے میں اس نے گاؤں کی بہاریں دیکھی تھیں تو دل میں اب بے نام سا درد جاگ اٹھا تھا۔ جیسے ماضی کے پردے سے کچھ وقوع پذیر ہونا چاہتا ہو اور نہ ہو پا رہا ہو۔ وہ خوش تھا اور نہیں جانتا تھا کس بات کی خوشی ہے، وہ غمگین بھی تھا مگر نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ غم کیا ہے۔ وہ ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ دور تک پھیلے کھیت' کھلی فضائیں' معطر ہوائیں' سرسبز درختوں کی گھنی چھاؤں' یہ سب ماضی کی دھندلکوں سے مشابہہ تھا۔ ایک عجیب سی کسک دل کو ٹھوکر لگائے جا رہی تھی۔ جیسے متوقع منظر پردہ ذہن پہ نمودار ہوتے ہوتے رہ جاتا تھا۔

وہ انہی سوچوں میں کھویا نہ جانے کدھر دیکھ رہا تھا کہ پروین نے چادر کا پلو کھینچ کر نبیل کے آگے کر دیا۔ نبیل نے پیار بھری نظروں سے پروین کی طرف دیکھا اور چادر کا پلو پکڑ کر اس سے اپنا سارا پسینہ پونچھ ڈالا۔ چادر میں سے اٹھتی ہوئی مہک اس کی روح تک اتر گئی۔ وہ پلو ہاتھ میں پکڑے عجیب انداز میں پروین کی طرف دیکھنے لگا۔ پروین نے فوراً پلو چھڑا لیا۔

دین محمد ایک سفید کپڑا اٹھائے ڈیرے کی طرف سے چلا آ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی کپڑا نبیل کو تھما دیا اور نبیل نے ایک مرتبہ پھر سے پسینہ خشک کر لیا۔

دین محمد دونوں کو لے کر پاپولر کے درختوں تلے جا بیٹھا۔ جو کھالے کے ساتھ ساتھ قطار اندر قطار ایستادہ تھے۔ باجرے اور جوار کے بلند کھیتوں کو لہلہاتی ہوا پاپولر کے پتوں سے بھی اٹکھیلیاں کر رہی تھی۔

''لے پُتر تو بھی کھا............''

''نہیں آپ کھائیں............ میں ناشتہ کر کے آیا ہوں۔''

وہ دین محمد کو کھانا کھاتے ہوئی بڑی محویت سے دیکھنے لگا۔ کھانا دین محمد کھا رہا تھا اور مزہ نبیل کو آ رہا تھا۔ جب برتن سمیٹ کر پروین جانے لگی تو دین محمد بولا۔ ''جا پُتر پروین کے ساتھ ہی گھر چلا جا میں بھی............''

''نہیں پھپھا! میں یہیں آپ کے پاس ہی رہوں گا............'' نبیل بات کاٹ کر بولا۔

''اچھا جا پُتر پروین............ اور اپنی ماں سے کہہ دینا۔ دوپہر کا کھانا ہم دونوں گھر پر ہی کھائیں گے۔'' پروین نے مڑ کر اچٹتی ہوئی نگاہ نبیل پر ڈالی اور گھر کو چل دی۔

دو بندے کھیت میں ہل چلانے لگے اور دین محمد نبیل کو ساتھ لے کر برگد کے نیچے آ بیٹھا۔ دین محمد کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ دھیمی ہوا برگد کے گھنے پتوں میں سرسرا رہی تھی۔ وہ حقے کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہیں دیکھتے ہوئے بولا۔

''نبیل پُتر! تیرا باپ بڑا جی دار بندہ تھا۔ پورے گاؤں کی آنکھ کا تارا تھا وہ............ اور گاؤں سے تو جیسے اسے عشق تھا۔ بچپن میں ہی اس کے ماں باپ فوت ہو گئے تھے۔ دو یتیم بہن بھائیوں کو پورے گاؤں نے پالا تھا۔ گاؤں کے بڑے ہی ان دونوں کا سب کچھ تھے۔ حسنا انہی گاؤں کی گلیوں میں کھیلا کودا تھا۔ انہی کھیت کھلیانوں میں اس کی جوانی پروان چڑھی تھی۔ پھر وہ پڑھنے کے لیے شہر چلا گیا۔ اتنا پڑھا اتنا پڑھا کہ بہت بڑا افسر بن گیا۔ بہن کی شادی کرنے کے بعد گاؤں کے لوگوں کے اصرار پر اس نے شہر ہی میں شادی کر لی۔ شادی کیا کر لی پھر وہ شہر ہی کا ہو کر رہ گیا۔ ایک دو بار گاؤں آیا۔ پھر پانچ سال کا طویل عرصہ گذر گیا وہ گاؤں نہیں آیا۔'' دین محمد دور فضاؤں میں دیکھتے ہوئے خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہو رہے تھے۔ کتنی دیر خاموشی چھائی رہی۔

نبیل کی آنکھیں دین محمد کے چہرے پہ جم کر رہ گئیں تھیں۔ ''پھر کیا ہوا پھپھا............؟''

اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے بلند ہوئی۔

''پھر حسنا سات سال بعد گاؤں آیا.........اس کے ساتھ تو بھی تھا۔ تیری عمر اس وقت بمشکل چار پانچ برس تھی۔ تیری ماں تیرے باپ کے ساتھ گاؤں نہیں آئی تھی۔

''تو اور تیرا باپ پورا ایک مہینہ گاؤں میں رہے۔ تیرا باپ پورا مہینہ تجھے گاؤں میں گھماتا رہا۔ اپنے بچپن میں کھیلی ہوئی جگہوں پہ انگلی پکڑ کر تجھے کھلاتا رہا۔ کھالوں کے پانی میں تجھے نہلاتا رہا ان دنوں خوشی اس کی آنکھوں سے پھوٹی محسوس ہوتی تھی۔ وہ دیوانہ ہوا پھرتا تھا۔

''ایک مہینہ گذارنے کے بعد وہ تجھے لے کر شہر چلا گیا۔ اسکے بعد اس کے خط تو آتے رہے مگر وہ خود کبھی نہیں آیا۔ اس کی بہن اس کا انتظار کر کر کے تھک گئی۔ گاؤں والوں کی نظر میں وہ ایک داستان بن گیا۔ آخر ایک دن اس کی موت کا خط انگلینڈ سے موصول ہوا جو اس کے کسی دوست نے لکھا تھا۔''

دین محمد صافے سے آنسو پونچھنے لگا۔ نبیل بالکل ساکت بیٹھا تھا۔ ذہن میں بڑے تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ یہ اس کے باپ کی زندگی کا وہ پہلو تھا۔ جو اس کی نظروں سے نہیں گذرا تھا۔ اس کا تذکرہ کبھی کسی نے اس کے سامنے نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ احسن نذیر نے بھی نہیں......... بڑوں کے تذکرہ کرنے سے ہی بندہ اپنے بچپن کی یادوں کا نقشہ اپنے ذہن میں بنا پاتا ہے۔ نبیل کی ماں نے بچپن کی جتنی باتیں نبیل کو بتائی تھیں ان میں کہیں گاؤں کا ذکر نہیں تھا۔ احسن نذیر بھی اپنی گاؤں کی یادیں، باتیں بیوی بچوں کو سنانے کی جسارت نہیں کر سکا تھا۔

دین محمد بولا۔ ''حسنا ہر وقت تیری ضدیں پوری کرنے میں لگا رہتا تھا۔ میں جب اس سے کہتا تھا کہ بچے کی ہر بات نہیں ماننی چاہیے تو وہ ہنس دیتا تھا آگے سے بولتا تھا ''بھاجی! میری جان اس کے اندر اٹکی ہوئی ہے۔ یہ ناراض ہو جائے تو میری جان نکل جاتی ہے۔''

''میں بچپن میں بہت ضد کرتا تھا؟'' نبیل دور کسی سوچ میں ڈوبے ہوئے بولا۔

''ہاں.........حسنے کے بے تحاشا پیار نے تجھے ضدی بنا دیا تھا.........''

نبیل آنکھوں میں اترے شفاف پانی کو صاف کر کے مسکرانے لگا۔ ذہن کی تختی سے بڑا پیارا منظر ابھرنے لگا۔ دھندلے ماضی کی یادوں کا انجانا منظر اسے لطف دینے لگا۔ اس نے ایک لمبی سانس کھینچی جیسے کھلی فضا کی ساری پاکیزہ ہوا سینے میں بھر لینا چاہتا ہو۔

''چھپا! یہ کون سی فصلیں لگی ہیں.........؟'' وہ خلافِ توقع ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

دین محمد اسے مسکرا کر دیکھنے لگا۔ ''پتر یہ چھوٹے قد والی فصل جوار کی ہے اور جو لمبے لمبے بوٹے نظر آ رہے ہیں وہ باجرے کے ہیں۔''

پھر وہ انجانے جذبے کے تحت اٹھ کر جوار اور باجرے کی فصل کے پاس چلا گیا۔

ان کے چوڑے پتوں اور لمبے ڈنڈلوں کو نرمی کے ساتھ ہاتھ سے سہلانے لگا۔

دین محمد بھی اس کے پیچھے چلا آیا۔ ''چھپا ان بوریوں میں کیا ہے؟'' وہ کھالے کے پانی سے بھیگتی ہوئی پٹسن کی بوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''پتر اس میں پنجی ہے۔ کل پنیری لگانی ہے نا.........اس لیے پانی کے نیچے رکھی ہوئی ہے۔''

''چھپھا! یہ منجی کیا ہوتی ہے اور یہ پنیری............؟''

دین محمد صافے سے منہ صاف کرتے ہوئے ہنسنے لگا۔''پتر ایک دن میں ہی سب کچھ پوچھے گا............چل آ گھر چلیں............کل جب پنیری لگائیں گے تو تجھے ہر چیز کے بارے میں بتاؤں گا............''

دین محمد کھیتوں میں کام کرتے ہوئے بندوں کو کچھ ہدایات دے کر نبیل کے ساتھ گھر کی طرف چل دیا۔ دور گاؤں کے کچے مکان مٹی کے ڈھیروں کی مانند دِکھ رہے تھے۔ وہ ایک پگڈنڈی پہ چلتے ہوئے کچی سڑک کی طرف بڑھنے لگے۔ بہت سے کھیتوں میں بے تحاشا پانی لگا ہوا تھا۔ گاؤں کے آدمی پانی لگے کھیتوں میں نرم مٹی کو پاؤں کی مدد سے ''گو'' رہے تھے۔ وہ جدھر گذرتے کھیتوں میں کام کرتے آدمی ہاتھ اٹھا کر دین محمد کو سلام کرتے۔ دین محمد بھی بڑی محبت سے ان کے سلام کا جواب دیتا۔ اس کا دل مچل رہا تھا کہ سب لوگوں سے نبیل کا تعارف کروائے مگر ابھی اسے گھر جانے کی جلدی تھی۔ اس نے طے کرلیا تھا۔ شام کو چاچا حیات کے ڈیرے پہ (جہاں سارے گاؤں کے بڑے جوان اور بچے اکٹھے ہوتے تھے) نبیل کا سب سے تعارف کروا دے گا۔

☆............☆............☆

فجر کی قضا نماز تو اس نے پڑھ لی تھی۔ خدا کے آگے روئی دھوئی بھی بہت تھی کہ آج کوئی کام خراب نہ ہو جائے۔ شاید اس کی دعا قبول ہوگئی تھی۔ اسی لیے کام خراب ہونے کی بجائے صحیح ہو رہے تھے۔ وہ صبح سے مشین کی طرح جتی ہوئی تھی۔ ایک کمرے کو خوب سجا سنوار دیا تھا۔ پورے صحن میں صفائی کر کے کوڑا کرکٹ اور سوکھے پتوں کو باہر پھینک دیا تھا۔ درخت کے نیچے کچی زمین پر جمی ہوئی بیٹھوں کو کھرپے سے کھرچ کر سارے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کر دیا۔ اتنے بڑے صحن کی صفائی اور پانی کا چھڑکاؤ معمولی کام نہیں تھا۔ ایک خوشبودار صابن کی ٹکیا اس نے لیھے کی دکان سے منگوا کر ہینڈ پمپ کے پاس رکھ دی تھی۔ تولیہ درخت کے موٹے تنے کے پاس کھڑی چار پائی کے اوپر ٹانگ دیا تھا۔ ان سب کاموں سے فارغ ہو کر اس نے مرغیوں کے ڈربے سے دو موٹی تازی مرغیاں نکال کر مولوی صاحب کے گھر کا رخ کیا مولوی خیر دین سفید ریش بزرگ آدمی تھے۔ پوری گاؤں میں جو عزت و توقیر انہیں حاصل تھی گاؤں کے چودھریوں کو بھی نہ تھی۔

جب وہ مرغیاں ذبح کر رہے تھے اس وقت پروین پرے ہو کر کھڑی ہوگئی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ مرغی ذبح ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ حالانکہ اس کی کھال وہی اتارتی تھی۔ گوشت کے ٹکڑے بھی خود ہی کرتی تھی۔

''بیٹی! نماز کی پابندی کر رہی ہو نا............؟'' میاں جی ذبح کی ہوئی مرغیاں اسے تھماتے ہوئے بولے۔ گاؤں کے سارے لوگ انہیں میاں جی کہہ کر پکارتے تھے۔

''ج ج............جی ہاں! میاں جی............بس............کبھی کبھار............فجر کی نماز میں دیر ہو جاتی ہے۔'' وہ پلکیں جھکاتے ہوئے بولی۔

''بھولی دھیئے! ماں باپ کوئی کام کہیں تو تم دیر نہیں لگاتی.......... اتنے بڑے مالک کے حکم کی تعمیل میں اتنی دیر کیوں..........؟''

''میاں جی! بس وہ کبھی کبھار آنکھ نہیں کھلتی نا۔''

''حکم کی عظمت دل میں ہو تو نیند اڑ جایا کرتی ہے؟''

وہ اثبات میں سر ہلانے لگی اور میاں جی کو سلام کر کے گھر کو چل دی۔ وہ گاؤں کی واحد لڑکی تھی جس نے ایف اے کر رکھا تھا۔ میٹرک تک وہ گاؤں کے سکول میں پڑھی تھی۔ بھائیوں نے زور لگا کر پرائیویٹ ایف۔اے کا امتحان دلوا ڈالا۔ وہ گہری باتیں کرتی تھی اور گہری باتیں سمجھتی تھی اوپر والے کمرے میں الماری کی ایک شیلف کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔ وہ اکثر فارغ اوقات میں مطالعہ کرتی رہتی تھی۔ ایف۔اے کرنے اور کتابیں پڑھنے کے باوجود اس کے روزمرہ کے معمولات میں فرق نہیں آیا تھا۔ وہ پہلے کی طرح گھر کے کام کاج کرتی تھی۔ اسے اس سادہ زندگی میں لطف آتا تھا۔ کیونکہ یہ زندگی سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ قدرت کے قریب ترین تھی۔

مرغی کا سالن بنا کر اور تندور پہ روٹیاں لگا کر وہ کمرے میں دسترخوان پر یہ چیزیں چن چکی تھی۔ چاٹی میں سے لسی انڈیل کر جگ میں ڈال دی تھی۔ اسی وقت باہر کا دروازہ کھلا اور دین محمد اور نبیل اندر داخل ہوئے۔ پروین پھرتی سے اٹھ کر لسی کا جگ اندر رکھ آئی۔ پتا نہیں کیوں اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔

جب دین محمد پروین کے سر پہ پیار دے رہا تھا تو اس کی جھکی نظروں نے اٹھ کر نبیل کی طرف دیکھا تھا۔ پھر دھیرے سے اس نے نظریں جھکا لیں اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

اس کی ایک انگلی برف توڑتے ہوئے زخمی ہوگئی تھی۔ اس نے خون روکنے کے لیے پٹی باندھ رکھی تھی۔ اور کوئی لمحہ ہوتا تو رو رو کر برا حال کر لیتی۔ وہ بہت تھوڑدلی تھی۔ مگر آج پتا نہیں کیوں وہ ساری تکلیف بھولی ہوئی تھی۔ وہ صبح سے مشین کی طرح کام کر رہی تھی۔ اب بھی وہ چاق و چوبند تھی۔ ہلکی گلابی چنری اس نے سختی سے چہرے کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ اس میں دمکتا ہوا کتابی چہرہ دیکھنے والے کو مبہوت کر دیتا تھا۔

دین محمد اور نبیل کھانا کھانے لگے۔ جنت بی بی بھی ان کے پاس آ بیٹھی۔ اس کی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں۔ وہ بڑی شفقت سے کھانا کھاتے نبیل کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی نظریں بظاہر نبیل کے چہرے پر تھیں مگر وہ دور بہت دور دیکھ رہی تھی۔

☆..........☆..........☆

حسنا اس سے تین سال چھوٹا تھا۔ وہ اسے گود میں کھلایا کرتی تھی۔ بھائی سے اسقدر پیار کرتی تھی کہ تیز ہوا بھی چلے تو اسے لے کر اسٹور میں چھپ جایا کرتی تھی۔ وہ دن رات اس سے کھیلتی تھی۔ اسے گود میں اٹھا کر بہت دور نکل جایا کرتی تھی۔ اس وقت وہ خود بھی بہت چھوٹی تھی۔

چنری چہرے کے گرد لپیٹ کر ایسے رکھتی جیسے بہت سمجھدار خاتون ہو۔ ایک دفعہ حسنے کا سر پھٹ گیا وہ پاگلوں کی طرح ننگے پاؤں ابا کو بلانے کھیتوں کی طرف بھاگ گئی۔ اپنا پیر لہولہان ہو گیا مگر اسے اپنی کچھ پرواہ نہ تھی۔ جب حسنے کی مرہم پٹی ہوگئی تو سب کا دھیان اس کے پاؤں کی

طرف گیا اس کے پاؤں کے نچلی طرف گھبرا گھاؤ لگا تھا۔ سب ہی اس کی بھائی سے دیوانہ وار محبت پہ حیران رہ گئے۔

جب ماں باپ دونوں وقفے وقفے سے داغ مفارقت دے گئے۔ تو جنت بی بی نے بھائی کو سینے سے چمٹا لیا اور گاؤں والوں نے دونوں کو محبت کی آغوش میں لے لیا۔ کسی بچے سے اتنی محبت نہ کی جاتی تھی جتنی ان دونوں سے گاؤں والے کرتے تھے۔ چاچا حیات' دینو موچی' بشیر کمہار' شرفو نائی' دتہ ترکھان' مولوی عمیر دین سبھی ان دونوں کو اپنی اولاد کی طرح پیار کرتے تھے۔ دونوں چاچا حیات کی بڑی حویلی میں رہتے تھے۔ پھر چاچا حیات نے ہی اپنے ہاتھوں سے جنت بی بی کو رخصت کیا۔ حسنا اس وقت شہر میں پڑھتا تھا۔ بہن کی شادی کے بعد وہ زیادہ شہر میں رہنے لگا۔ گاؤں والوں کے اصرار پر اس نے پھر شہر میں ہی شادی کر لی۔ شادی کیا کر لی وہ شہر ہی کا ہو کر رہ گیا۔ بہن بھائی کے دیدار کے لیے ترستی رہی مگر وہ نہ آیا۔ پتا نہیں کیا مجبوری تھی اسے......... پھر سات سال کے طویل عرصے کے بعد حسنا گاؤں آیا تھا۔ جنت بی بی اس وقت تندور سے روٹیاں لگوا کر گھر جا رہی تھی۔

جب اس نے بھائی کو گھر کی طرف آتے دیکھا تو بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔ بہن اور بھائی کا ملاپ دیکھنے کے قابل تھا۔

وہ بھائی سے لگ کر جی بھر کے روئی تھی۔ حسنے کے آنسو بھی تھمنے میں نہیں آ رہے تھے۔ حسنا پھر پورا ایک مہینہ گاؤں میں رہا۔ چار سالہ نبیل اس کے ساتھ تھا۔ جنت بی بی اسے پیار کرتے ہوئے تھکتی نہ تھی۔ ایک دن حسنا اور جنت بی بی اکیلے بیٹھے ہوئے تھے۔ حسنا بولا۔ ''باجی! دل چاہتا ہے سب چھوڑ چھاڑ کر گاؤں واپس آ جاؤں۔ گاؤں کی یادیں مجھے شہر میں رلاتی ہیں۔''

''ویرا! چھوڑ سب کچھ آ جا گاؤں میں۔ پھر ہم بیٹھ کر بچپن کی یادیں دہرایا کریں گے۔ بچپن کے قصے سنایا کریں گے۔ کتنا عرصہ ہوا چاچا حیات کے حویلی والے کھوہ پر بیٹھے ہوئے۔ تجھے یاد ہے نا بچپن میں تو اور میں بکائن کے نیچے کھوہ کے پاس بیٹھ کر کوڈیوں سے کھیلا کرتے تھے۔ ماسی زلیخاں بکائن کے نیچے ہی چرخا کاتا کرتی تھی۔ رنگیلے دھاگے کو جوڑ جوڑ کر ہم لمبا دھاگہ بنا لیا کرتے تھے۔ پھر دھاگے کو تہہ در تہہ کر کے موٹا سوتر بنا لیا کرتے تھے۔ پھر دونوں اسے توڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر بہت کوشش کے باوجود بھی نہیں توڑ سکتے تھے۔

میرے بس میں ہو تو ایک دن میں گاؤں واپس آ جاؤں۔ مگر نبیل کی محبت میں، میں ایسا نہیں کر پا رہا۔ اگر نبیل نہ ہوتا تو میں کب کا اس عورت کو چھوڑ کر یہاں آ گیا ہوتا۔'' وہ بہتے آنسوؤں کو پونچھ کر کہتا۔

''ویرا! آخر تجھے کیا مجبوری ہے۔ کیا دکھ ہے تجھے.........؟'' وہ غمگین ہو کر کہتی۔

''باجی! تو نہیں جانتی میری مجبوری کو......... اور شاید کبھی جان بھی نہ سکے۔ مگر......... میرے دل نے ایک سپنا دیکھ رکھا ہے۔ جب......... میرا نبیل بڑا ہو جائے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نبیل کو تیری سوہنی دھی کے ساتھ بیاہوں گا۔ پھر ہمارا رشتہ، ہمارا تعلق اس موٹی ڈوری کی طرح مضبوط ہو جائے گا جو توڑنے سے بھی نہیں ٹوٹتی تھی۔''

جنت بی بی فقط مسکرا کر رہ گئی اسے معلوم تھا ایسا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ جو عورت گاؤں آنے پر راضی نہیں وہ اپنے بیٹے کا رشتہ کیسے گاؤں میں کر دے گی۔ اسکی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ حسنا سمجھا خوشی کے آنسو ہیں۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا بہن کے من میں غم کا پہاڑ ٹوٹا ہے۔

حسنا نبیل کو لے کر گاؤں سے چلا گیا۔ پھر کسی نے گاؤں میں اسکے بعد اس کی شکل نہیں دیکھی۔ وہ انگلینڈ جانے کے بعد بھی مسلسل خط لکھتا

رہا اور آخر ایک دن حسنے کی موت کا خط گاؤں پہنچا سب کچھ ختم ہو گیا۔ کہانی تمام ہو گئی۔ بھائی کا رستہ تکنے والی آنکھیں چھلک پڑیں۔ پھر ان آنکھوں نے کسی بے درد کا انتظار کرنا چھوڑ دیا۔

آنکھوں نے انتظار کرنا چھوڑا تو اسی اداس، ویران رستے میں بہاریں امڈ آئیں حسنا نہ آیا مگر حسنے کا خون چلا آیا۔ پیاسی بہن کو بھتیجے کی شکل میں بھائی نظر آنے لگا۔

''پھوپھو! آپ بھی کھانا کھائیں ناں..........''

وہ یکدم چونک کر خیالات کی دنیا سے باہر آ گئی۔

''پُتر! تو کھا میں پروین کے ساتھ کھا لوں گی.........'' وہ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کر کے بولی۔

''پھپھو! جب آپ صبح اٹھیں گی نا تو مجھے بھی اٹھا دیجئے گا۔ جب آپ آٹا پیستی ہیں، دودھ بلوتی ہیں، پراٹھے بناتی ہیں تو مجھے دیکھ کر بہت مزہ آتا ہے۔''

''اچھا پُتر!..........'' جنت بی بی مسکرا کر بولی۔

کھانا کھا کر اور لسی پی کر اس پر غنودگی چھانے لگی۔ دین محمد کھانا کھا کر کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

اور نبیل آرام کرنے کیلئے کمرے میں لیٹ گیا۔ کمرا نہایت صاف ستھرا اور سادہ تھا۔ باہر کچے وسیع و عریض صحن میں چمچلاتی دھوپ نے ہر چیز کو کندن رنگ کر دیا تھا۔ کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ چھوٹا چھت والا پنکھا دھیرے دھیرے چل رہا تھا۔ چار پائی پر سفید بے داغ چادر بچھی ہوئی تھی۔ پاؤں کی طرف نیلی اور سرخ دھاریوں والا کھیس پڑا ہوا تھا۔ کمرے میں ایک عجیب ٹھنڈی سی مہک تھی۔ جو غنودگی کو سوا کر رہی تھی۔ نبیل بستر پہ پڑتے ہی سو گیا۔ اتنی میٹھی اور گہری نیند اسے دوپہر کے وقت کبھی نہیں آئی تھی۔

وہ پتا نہیں کتنا وقت سوتا رہا۔ کروٹ بدلتے ہوئے غنودگی میں اس کی آنکھ کھلی تو کچے فرش پر اسے دو سفید اور دودھیا پاؤں نظر آئے، جیسے پاؤں نہ ہوں دو نہایت سفید کبوتر ہوں۔ نبیل نے اپنا بازو چہرے کے آگے کر لیا اور پھر بازو کی نچلی اوٹ سے دھیرے دھیرے نظریں اوپر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ پروین کا پورا جسم نبیل کی آنکھوں سے گذرنے لگا۔ اس کا جسم کسی سنگ تراش نے بڑے انہماک سے تراشا تھا۔ بجلی جا چکی تھی۔ پروین چارپائی قریب کھڑی ہو کر ہاتھ سے پنکھا جھل رہی تھی۔ وہ اپنے کام میں منہمک تھی۔ اس کی آنکھیں محویت سے نبیل کو دیکھ رہی تھیں۔ نبیل اس کی محویت توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ انجان بن کر بے سدھ ہو گیا اس کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر وہ پوری طرح بیدار تھا۔ پروین تقریباً آدھا گھنٹہ پنکھا جھلتی رہی۔ بجلی آنے پر وہ باہر چلی گئی۔ نبیل کو اس عجیب وغریب لڑکی پر حیرت ہو رہی تھی۔ دین محمد دن ڈھلنے سے پہلے ہی گھر لوٹ آیا۔ نبیل بھی نہا کر چاق وچوبند ہو چکا تھا۔

شام کو کھانا کھانے کے بعد دین محمد نبیل کو لے کر چاچا حیات کے ڈیرے پر چلا گیا۔ زمین سے ذرا اونچے وسیع قطعے پہ پکی اینٹوں کا کشادہ کمرہ تعمیر تھا۔ اس سے دس پندرہ گز پرے ایک بہت بڑی بیری کھڑی تھی۔ بیری سے ہٹ کر اگلی طرف بہت سی چار پائیاں پڑی تھیں۔

چار پائیوں پر بیٹھے گاؤں کے بڑے بوڑھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ اور باتیں کر رہے تھے۔ بیری سے پرے ہٹ کر پچھلی طرف کچھ بالڑیاں کچھ ادھ کڑیاں کوئی کھیل کھیل رہی تھیں۔ کبھی کبھار کسی چھوٹے بچے کے رونے کی آواز آتی آواز اگر مسلسل آئے جاتی تو بڑوں میں سے کوئی پکار کر بچے کو چپ کرانے کا حکم دیتا۔ بچوں کی ایک ٹولی کتے کے گلے میں رسی ڈال کر اسے بھگاتی پھرتی تھی۔ بچوں کے بھاگنے کی وجہ سے دھول اڑتی تو بڑوں میں سے کوئی جوان اٹھ کر بچوں کو بھلے انداز میں ڈانٹتا بچے پھر دور نکل جاتے۔

نبیل جب دین محمد کے ساتھ ڈیرے پہ پہنچا تو اسے عجیب سی اپنائیت کا احساس ہوا۔ اسے وہ خوشی محسوس ہوئی جو نا قابلِ بیان تھی۔ پورے دنوں کا چاند جوار اور باجرے کے کھیتوں کے اوپر اپنی ٹھنڈی چاندنی بکھیر رہا تھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں ڈیرے کا منظر خوابناک سا لگ رہا تھا۔ چار پائیاں، چار پائیوں پہ بیٹھے لوگ، چار پائیوں کے پایوں کے پاس رکھے ٹھنڈے پانی کے ڈول، اپنی سریلی آوازوں سے چیختی ہنستی قہقہے لٹاتی بالڑیاں، کتے کو للکارتے شور مچاتے بچے، جیسے یہ سب اس کی گم گشتہ جنت تھی۔ جیسے یہ سب اسکے جسم کا جدا ہو جانے والا حصہ تھا۔ جب دین محمد نے وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں سے نبیل کا تعارف کروایا تو ایک سیکنڈ کے لیے جیسے مکمل خاموشی طاری ہوگئی۔ پھر جیسے یکدم خوشیوں اور مسرتوں کا ریلہ اٹھا اور نبیل اس میں ڈوبتا چلا گیا۔ جہاں چاہا جانے والا ایک اور چاہنے والے بے تحاشا ہوں تو حواس چھومنتر ہو جایا کرتے ہیں۔ نبیل کو کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ کس کس سے گلے مل رہا ہے۔ ہر ایک کے ملنے میں جوش تھا اپنائیت تھی۔ والہانہ پن تھا۔ اسے اس والہانہ پذیرائی کی فوری طور پر کچھ سمجھ نہ آئی۔ وہ بے چارہ نہیں جانتا تھا۔ برسوں کے بچھڑے دوست حسنے کو مل کر آنسوؤں کے دریا بہا رہے تھے۔ حسنا نہیں رہا تھا۔ حسنے کا خون تو ان کے درمیان تھا۔ کوئی سر پہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ کوئی کمر پہ تھپکیاں دے رہا تھا۔ آخر میں چاچا حیات کتنی دیر نبیل کو سینے سے لگائے کھڑا رہا۔ اس کے آنسو ٹپ ٹپ آنکھوں سے گرتے رہے۔ ہونٹ لرزتے رہے۔

زبان کچھ نہ بولی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک منظر تھا۔ جس میں حسنا ضد کر رہا تھا ''چاچا مجھے چابی والا کھلونا لے کر دے.......... مجھے نہیں پتا مجھے کھلونا لے کر دے..........''

کئی آنسو بیک وقت چاچا حیات کی آنکھوں سے ٹپکے اور وہ ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتا ہوا نبیل سے جدا ہو گیا۔

''پتر! اتنے پیسے ہی نہیں تھے تیرے چاچے کے پاس، جس دن پیسے آئے تُو ہی گاؤں چھوڑ گیا۔''

''چاچا جان! آپ نے مجھ سے کچھ کہا..........؟'' نبیل حیرانگی سے چاچا حیات کی طرف دیکھ کر بولا۔

چاچے حیات نے نبیل کی بات نظر انداز کر کے اسے پکڑ کر اپنے پاس چار پائی پر بیٹھا لیا۔

چاچا حیات اپنی لَے میں بولتا جا رہا تھا۔ وہ بار بار نبیل کی بلائیں لیتا، شفقت سے اس کی پیٹھ پہ ہاتھ پھیرتا، اچانک خاموش ہو جاتا کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔ پھر پورا ایک گھنٹہ چاچا حیات نبیل کو گاؤں کی پرانی باتیں سناتا رہا اور اس سے انگلینڈ کا حال پوچھتا رہا۔

''تو شیر کا پتر ہے۔ میرے حسنے کا پتر ہے۔ اب تجھے ہم واپس نہیں جانے دیں گے۔''

''ہاں..........ہاں..........نبیل پتر اب یہیں رہے گا۔'' سب نے چاچا حیات کی تائید کی۔

''چاچا جان! مجھے دو دن بعد یہاں سے چلے جانا ہے۔ کام کے سلسلے میں آیا تھا۔ ابا جان کی بڑی خواہش تھی کہ میں جب پاکستان جاؤں تو گاؤں ضرور جاؤں۔ مجھے نہیں علم تھا یہاں اتنے محبت کرنے والے لوگ بستے ہیں۔ اب تو میرا بھی دل نہیں چاہتا یہ سب چھوڑ کر جانے کو مگر مجبوری ہے۔ ہاں.......... میں انگلینڈ میں کام وغیرہ نمٹا کر ضرور پاکستان آؤں گا۔ پھر گاؤں میں آ کر بہت دن رہوں گا۔''

نبیل جب وہاں سے اٹھا تو ڈھیروں پیار سمیٹ کر اٹھا تھا۔ اس کا دامن انجانی خوشیوں سے بھر چکا تھا۔ سونے سے پہلے پروین دین محمد کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ نبیل ساتھ والی چارپائی پہ نیم دراز تھا۔

وہ چھت پہ لیٹا کھلے آسمان کو تکے جا رہا تھا۔ گہرے شفاف آسمان پر اس قدر ستارے بکھرے ہوئے تھے کہ نبیل کو خوف آنے لگا۔ اس نے انگلینڈ میں کبھی رات کو آسمان پر اتنے زیادہ ستارے نہیں دیکھے تھے۔ چارے کے کھیتوں کو لہلہاتی کھلی فضاؤں کی پاکیزہ ہوا چھت پر بھی انکھیلیاں کر رہی تھی۔ آج وہ دین محمد کے ساتھ چھت پر سو رہا تھا۔ عجیب طرح کی سی خوشی تن بدن کو گدگدا رہی تھی۔ چارپائی پہ بچھے صاف ستھرے بستر میں بھی عجیب سی دل آویز ٹھنڈک اور نرمی تھی۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔

''پتر دو دن بعد چلا جائے گا۔ پھر کب آئے گا..........؟'' دین محمد نے نبیل سے پوچھا۔

پروین کو باپ کے سوال پر ٹھیک ٹھاک جھٹکا لگا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے جیسے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ نبیل واپس جانے کے لیے ہی آیا ہے۔ وہ کرنوں سے چلے آتے روگ کا شکار ہو چکی تھی۔ وہی ازلوں سے جاری و ساری جذبہ جسے عام زبان میں عشق کہتے ہیں۔

وہ رومانی مزاج کی نہیں تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح شریر اور تیز و طرار بھی نہیں تھی۔ پھر کیا تھا؟ جو اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ اس نے خود سے تو کوئی تمنا نہیں کی تھی۔ اپنے دامن میں ارمانوں کے دیپ نہیں جلائے تھے۔ پھر یہ کیسی خودسر خواہش تھی جو سانسوں کے زیر و بم کے ساتھ ڈوب اور ابھر رہی تھی۔ یہ کیسی اندھی تمنائیں تھیں جو دل کی دھڑکنیں بے ترتیب کر رہی تھیں۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکا رہی تھیں۔

''چچا! شادی کے بعد انشاء اللہ ضرور اپنی بیوی کو لے کر گاؤں آؤں گا۔ اسے دکھاؤں گا کہ گاؤں کیسا ہوتا ہے۔ گاؤں میں بسنے والے لوگ کتنے پیارے ہوتے ہیں۔''

کچھ نہیں ہوا تھا۔ تھوڑے سے وقفے کے لئے پروین کا دل ہی تو رکا تھا۔ پھر دھڑ ادھڑ دھڑ کنے لگا تھا۔ سینے میں غم کا ایک پہاڑ ہی تو ریزہ ریزہ ہوا تھا۔ ان اچھلتے کودتے پہاڑی پتھروں نے اس کے علاوہ کسی اور کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ کسی کا دل تو نہیں دکھایا تھا۔

''پتر! ہم تیرے ساتھ اپنی دھی رانی کا بھی انتظار کریں گے.......... کب کر وا رہا ہے شادی..........''

''بس.......... دو سال کے اندر اندر.......... ماموں کی بیٹی کے ساتھ بات پکی ہونے والی ہے میری.......... ماموں شادی کے سلسلے میں فکرمند ہیں وہ جلد اس فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتے ہیں۔''

''اللہ سوہنا تمہارے لیکھ اچھے کرے..........'' دین محمد نہایت دھیمی آواز میں بولا۔

پروین کو پتا نہیں کیا ہوا تھا وہ ٹانگیں دباتے دباتے اٹھ کر نیچے چلی گئی تھی۔ نبیل اور دین محمد دونوں نے پروین کے وہاں سے ایسے اٹھ جانے

پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

دھیرے دھیرے دین محمد کو نیند آنے لگی اور وہ حقے کی نے کو پرے کر کے بستر پر دراز ہو گیا۔ نبیل نے اپنی بائیں طرف دیکھا تو دن بھر کا تھکا ہارا دین محمد سو چکا تھا۔ وہ بھی سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر سوچوں کے جال نے نیند کی دیوی کا رستہ روک لیا۔ اس کے سینے میں گاؤں کی محبت و اپنائیت کا ایک جھرنہ سا پھوٹ پڑا تھا۔ جو سارے جسم کو سیراب کیے جا رہا تھا۔

دھندلی یادوں کے عکس صاف ہونے لگے تھے۔ الجھی ہوئی گتھیاں سلجھنی شروع ہو گئی تھیں۔

آج صبح جب وہ پروین کے ساتھ کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ تو وہ کچی دُھول اڑاتی گلی اسے کتنی مانوس لگی تھی۔ تو کیا وہ بچپن میں اس گلی میں کھیلتا رہا تھا؟ گاؤں میں ہر کسی نے کہا تھا کہ وہ بچپن میں اپنے والد احسن نذیر کے ساتھ پورا ایک مہینہ یہاں گاؤں میں رہا تھا۔ تو کیا وہ ساری دھندلی یادیں، نافہم نامکمل باتیں اسی دور کی تھیں۔

اسے گاؤں آئے پورے چوبیس گھنٹے گذر چکے تھے۔ ان چوبیس گھنٹوں میں جو سرور و لطف اسے حاصل ہوا تھا۔ اس کے آگے انگلینڈ کی ساری روشنیاں، رنگینیاں ہیچ تھیں۔ دھیرے دھیرے یہ یقین اس کے دل میں راسخ ہوتا چلا جا رہا تھا کہ یہاں کے باسیوں کے دل میں کھوٹ نہیں ملاوٹ نہیں، یہ بھولے لوگ منافقت سے قطعی پاک ہیں۔ اسے محسوس ہونے لگا جیسے وہ خود بھی یہیں کا ہے۔ اسی مٹی سے اس کا خمیر اٹھا ہے۔

☆..........☆..........☆

ابھی تیرگی ٹھیک طرح سے نہیں چھٹی تھی۔ جنت بی بی نبیل کو اوپر سے اٹھا لائی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا نیچے آ گیا۔ اس کی طبعیت اتنی سویرے اٹھنے کی وجہ سے کچھ بوجھل سی ہوئی۔ مگر جب وہ ہینڈ پمپ کے تازے پانی سے ہاتھ منہ دھو کر جنت بی بی کے پاس آ بیٹھا تو ہشاش بشاش ہو گیا۔

''پتر! تجھے بڑی دیر سے اٹھا رہی تھی۔ تُو اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اگر تُو نے اٹھانے کا نہ کہا ہوتا تو تجھے سویا رہنے دیتی.......... پروین بھی ایسے ہی کرتی ہے۔ رات کو کہہ کر سوتی ہے مجھے نماز کے لیے اٹھا دینا صبح بڑی مشکل سے اٹھتی ہے.......... اچھا ہوا مجھے یاد آ گیا.......... ابھی اسے اوپر والے کمرے سے اٹھا لاؤں..........'' یہ کہتے ہوئے جنت بی بی جنوبی سمت والی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی جس طرف چند بالے اور شہتیر ڈال کر چھوٹا سا کمرہ بنایا گیا تھا اور جو پروین کے لیے مخصوص تھا۔ جنت بی بی کے آنے سے پہلے نبیل چکی کے پاس بیٹھ کر اسے گھمانے لگا۔ چند منٹوں بعد جنت بی بی آ دھمکی۔ وہ کچھ پریشان اور الجھی ہوئی تھی۔ نبیل نے کیفیت بھانپ لی۔

''کیا بات ہے پھپھو خیریت ہے ناں..........؟'' نبیل سنجیدگی سے بولا۔

''کچھ نہیں.......... بس یوں ہی.......... پروین کو اٹھانے گئی تھی۔ دیکھا تو پلنگ پر بیٹھی بیٹھی سوئی ہوئی تھی اٹھایا تو آنکھیں سوجی ہوئی تھیں پوچھا تو کہنے لگی پیٹ میں درد ہے۔ مجھے لگا ہے ساری رات جاگتی رہی ہے۔'' جنت بی بی بولی نبیل بھی پریشان ہو گیا۔

''آج سے پہلے تو کبھی اسے ہلکا سا بخار تک نہیں ہوا۔ بڑی سخت جان ہے چھوٹی موٹی تکلیف ہو تو بتاتی بھی نہیں ہے۔ پتا نہیں کیا

ہوا.........؟'' جنت بی بی ہاتھ کا پنجہ گھما کر سوچ میں ڈوب گئی۔

نبیل نے دیکھا کہ وہ صحن میں لگے ہینڈ پمپ پہ وضو کر رہی ہے۔ پھر وہ اچانک ہی غائب ہوگئی۔

نبیل کچھ دیر تو پھوپھی کو چکی سے آٹا پیستے ہوئے دیکھتا رہا پھر آنکھیں چرا کر اوپر پروین کے کمرے میں چلا گیا وہ نماز پڑھ کر مصلیٰ تہہ کر کے رکھ رہی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں کے سفید پردے گلابی ہو رہے تھے۔

''پروین اب کیسی طبعیت ہے؟ پھپھو بتا رہی تھیں.........تمہیں ساری رات درد ہوتا رہا.........''

''اب میں بالکل ٹھیک ہوں.........'' وہ چیزیں درست کرتے ہوئے قدرے مسکرا کر بولی۔

''تمھاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ روتی رہی ہو کیا؟'' نبیل بے تکلفی سے بولا۔ ایک لمحے کے لیے دل دھڑکا اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ زبان کے اوپر کچھ آتے آتے دم توڑ گیا۔ ''نہیں.........ایسی تو کوئی بات نہیں.........'' پروین نے یکدم کسی کام کے بہانے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور لرزتے ہوئے آنسو جلدی سے پونچھ ڈالے.........''

''آج اتنی جلدی کیسے اٹھ گئے.........؟'' وہ نبیل کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

''میں تو کل بھی بہت سویرے اٹھ گیا تھا.........ویسے ایک بات تو بتاؤ.........بجلی ہے تمام سہولتیں ہیں۔ پھر تم لوگ خراس کیوں نہیں لگا لیتے پھپھو ہاتھ سے چکی پیستی رہتی ہیں۔''

''آپ کی پھپھو کو شوق ہے ہاتھوں پہ چھالے پڑوانے کا.........کہتی ہیں۔ ساری زندگی ہاتھ کا پیسا ہوا آٹا کھایا ہے۔ اب بھی ہاتھ سے ہی چکی پیسوں گی۔''

ہاتھ کے پیسے ہوئے آٹے اور خراس میں پیسے ہوئے آٹے میں فرق ہوتا ہے؟''

''آؤ نیچے چلیں.........ماں انتظار کر رہی ہوگی.........''

نبیل پروین کے ساتھ نیچے آ گیا۔ ''کہاں چلا گیا تھا پتر! لے دیکھ لے مکھن نکلتا ہوا۔'' نبیل فوراً جنت بی بی کے پاس جا بیٹھا اسے ان چیزوں کا بڑا تجسس تھا۔ وہ مکھن نکلتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بڑے غور سے دیکھتا رہا اور جنت بی بی چاٹی میں ہاتھ ڈال کر ہاتھ میں پاؤ پاؤ کے مکھن کے پیڑے نکالتی رہی۔

اس کے بعد چولہا جلانے اور روٹی لگانے کا مرحلہ تھا۔

وہ چولہا جلاتی جنت بی بی کو بڑے انہماک سے دیکھنے لگا۔ جب وہ آٹے کے پیڑے میں مکھن لگاتی اس کی تہہ لگا کر روٹی بناتی اور اسے توے پر ڈالتی تو اس کی خوشی دو چند ہو جاتی۔ اس کے اندر بیٹھا شریر بچہ قلقاریاں مار کر ہنسنے لگتا۔ گرم گرم پراٹھے پر مکھن کا پیڑا، دیسی اچار اور چاٹی کی لسی۔ اس کے لیے دنیا کی مرغوب ترین غذا بن گئی تھی۔

پھپھو کے ہاتھوں میں جیسے جادو تھا۔ اس کے کاموں میں جیسے سحر چھپا ہوا تھا۔ وہ تحمل مزاج اور بردبار پھپھو کو کام کرتے ہوئے دیکھ کر

پھولے نہ سماتا۔ اس کے کاموں میں بھی تحمل مزاجی اور برد باری آ گئی تھی۔ جیسے وہ پھپھو کا خاموش پرستار بن گیا تھا۔

''پتر اب کیسی طبیعت ہے............؟'' جنت بی بی پراٹھے کو توے پر گھی لگاتے ہوئے بولی۔

''ماں! اب میں ٹھیک ہوں۔'' وہ آہستگی سے بولی مگر دل میں ایک ٹیس برابر تنگ کئے جا رہی تھی پتہ نہیں کیوں وہ اس کے سینے میں پھانس سی اٹک گئی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر دیوانہ وار رونا چاہ رہی تھی مگر نہیں رو پا رہی تھی۔

''پھپھو! جب میں انگلینڈ چلا گیا تو کبھی آپ کے ہاتھوں کے پراٹھوں کو نہیں بھلا سکوں گا۔ مجھے آپ کی یاد بہت ستائے گی..........'' نبیل اپنا سر پھپھو کے گھٹنے پر رکھ کر بچوں کی طرح منمنایا۔

جنت بی بی اس کے ریشمی بالوں پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگی۔ ''پتر! زیادہ دن انتظار نہ کرانا جلد ملنے چلے آنا..........''

''میرا بس چلے تو آپ لوگوں کو چھوڑ کر ہی نہ جاؤں..........''

''کون کمبخت جانے کو کہہ رہا ہے.......... آپ یہیں رہیں..........'' دل کی بات پروین کی زبان پر نہ آ سکی۔

''پروین پتر! تیرے ابے کو کھانا میں دے آتی ہوں۔ تو نبیل کو اچھی طرح سے ناشتہ کروا دینا..........'' جنت بی بی کھانا باندھتے ہوئے بولی۔

جنت بی بی جب جا چکی تو نبیل بولا۔ ''پروین! تم کتنی خوش قسمت ہو کہ اتنے خوبصورت گاؤں میں رہتی ہو۔ اتنے کھرے اور پیارے لوگوں میں رہتی ہو۔ انگلینڈ میں یہ سب نہیں ہے۔ وہاں ہر کوئی اپنی.......... صرف اپنی زندگی جی رہا ہے۔''

''آپ.......... بھی۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

''ہاں شاید میں بھی.......... میں ایسی زندگی گذارنا نہیں چاہتا مگر کیا کروں ماحول کے سانچے میں ڈھل کے سب کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔''

''زندگی ایک بار ملتی ہے بار بار نہیں۔ آپ اپنی من چاہی زندگی نہیں گذار سکتے تو چھوڑ دیں ایسی جگہ کو یا پھر خود کو اتنا مضبوط بنا لیں کہ آپ کی من چاہی زندگی میں کوئی بیرونی دباؤ سے اندر داخل نہ ہو سکے۔'' نبیل حیرانگی سے پروین کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ معصوم حسین لڑکی بڑی بڑی باتیں کر رہی تھی۔ یہ روپ نبیل کے لیے نیا تھا۔

''پروین! تم نے تعلیم کہاں تک حاصل کی ہے..........؟''

پروین مسکرانے لگی اس کی آنکھوں کی سوجن ابھی ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ ''میں نے ایف۔ اے کر رکھا ہے مطالعے کا شوق رکھتی ہوں بہت سی کتابیں میں نے اوپر شیلف میں رکھی ہوئی ہیں۔''

نبیل کا تجسس بڑھنے لگا۔ اسے بھی اردو ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس نے انگلینڈ میں بھی بہت سی بہترین کتب جمع کر رکھی تھیں۔ اکثر وہ پریشان ہوتا تھا تو دروازے کو لاک کر کے بند ہو جایا کرتا تھا اور گھنٹوں ان کتابوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اس کے ماموں کو بھی مطالعے سے گہرا شغف

تھا۔ وہ اکثر ماموں کی شیلف سے بھی کتابیں نکال لایا کرتا تھا۔

''پلیز تم مجھے اپنی کتابیں دکھاؤ گی..........'' نبیل بے چینی سے بولا۔

''آپ پہلے ناشتہ کرلیں..........پھر اوپر چلتے ہیں..........''

ناشتے کے بعد پروین نبیل کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ پرانی طرز کے پلنگ کے بائیں طرف الماری میں بہت سی کتابیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ کتابوں سے اوپر والی شیلف پر دو فریم شدہ تصویریں پڑی تھیں۔ نبیل کے پوچھنے پر پروین نے بتایا کہ دونوں بھائیوں کی تصویریں ہیں۔

''پروین! تم اتنی بھاری بھاری کتابیں پڑھ لیتی ہو..........؟'' نبیل حیرت سے بولا۔

''یہ سب پڑھنے کے لیے ہی رکھی ہوئی ہیں۔''

''چاہے سمجھ میں کچھ آئے یا نہ آئے..........'' نبیل کا لہجہ طنزیہ تھا۔

پروین ایک لمحے کے لئے مسکرا اٹھی اس کے ساتھ ہی غم کی ایک ٹیس بھی سینے کو چھلنی کرتی ہوئی گزر گئی۔

''آپ مذاق اچھا کر لیتے ہیں..........''

''میں پیار بھی بہت اچھا کر لیتا ہوں..........''

پروین کا سانس اوپر کا اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا۔

''کک..........کیا مطلب..........''

''میں کتابوں سے بے انتہا پیار کرتا ہوں..........''

''کبھی انسانوں سے بھی پیار کیا..........؟''

''ہاں..........کیا..........''

''کس سے..........'' اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''اپنی ہونے والی بیوی سے..........'' نبیل نہایت سنجیدگی سے بولا۔

پروین کا زخمی دل جل کر راکھ ہو گیا..........حلق میں کانٹوں بھرا گولا سا پھنس گیا۔ آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ وہ کھانڈ کی گڑیا تھی شیشے سے بھی زیادہ نازک دل تھا اس کا..........پچھلے بارہ گھنٹوں میں اس نازک دل نے بہت سے غم سہے تھے۔ مگر پھر بھی وہ دیوانہ کچھ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ سب کچھ ختم ہو جائے۔ سارے رستے مسدود ہو جائیں مگر پھر بھی ایک رستہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ امید کا رستہ..........جس دن یہ رستہ بھی بند ہو گیا..........اس دن کائنات کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

''تم نے کبھی کسی سے پیار کیا..........؟'' نبیل پروین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

اس کے دل کی دھڑکن ناقابل یقین حد تک بڑھ گئی۔ اس نے مضبوطی سے پلنگ کے پائے کو تھام لیا۔ بہت کوشش کے باوجود بھی وہ

ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر قابو نہ پا سکی۔

''آئیں نیچے چلتے ہیں میرا خیال ہے ماں آ گئی ہے۔'' اس نے بمشکل کہا اور نبیل کا انتظار کیے بغیر نیچے چل دی۔ نبیل بھی اس کے پیچھے نیچے چلا آیا۔ نبیل کو محسوس ہونے لگا جیسے پروین دو لڑکیوں کا ایک نام ہے۔ ایک لڑکی گاؤں کی سادہ اور سیدھی سادی زندگی گزارتی ہے۔ دوسری لڑکی ادب سے گہرا شغف رکھتی ہے۔ موٹی موٹی کتابیں پڑھتی ہے اور کسی سے بھی گھنٹوں ادب کے موضوع پر سیر حاصل بحث کر سکتی ہے۔ اسے پروین کی شخصیت میں دلچسپی نظر آنے لگی۔ اس کی شخصیت کے مخفی پہلوؤں کے بارے میں تجسس ہونے لگا۔

جنت بی بی کھیتوں سے واپس آ چکی تھی اور پروین سے نبیل کو ٹھیک طرح سے ناشتہ کروانے کا پوچھ رہی تھی۔ نبیل کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر بولی۔

''پتر! تیرا پھپھا تجھے کھیتوں میں بلا رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ پنیری لگتی ہوئی دیکھ لے......''

''دھت تیرے کی.........'' نبیل نے ٹانگ پہ ہاتھ مارا۔ کھیتوں میں جانا ہی بھول بیٹھا تھا۔ ''رات میں نے ہی تو پھپھا سے کہا تھا میں نے پنیری لگتے ہوئے دیکھنی ہے۔'' اس نے خود کلامی کی۔ ''لیکن مجھے کھیتوں کا رستہ یاد نہیں.........''

''پروین پتر! جا نبیل کو کھیتوں تک چھوڑ آ.........''

پروین خاموشی سے نبیل کے ساتھ چل پڑی۔ سارے رستے پروین نے نبیل سے کوئی بات نہیں کی۔ خاموشی نبیل نے ہی توڑی۔

''پروین! میں جو بات کرنے لگا ہوں میرے خیال سے وہ بات تمہارے علاوہ یہاں کوئی نہ سمجھ پائے گا.........شاید.........تم بھی نہ سمجھ پاؤ گی.........'' نبیل دور کسی سوچ میں ڈوبتے ہوئے بولا۔

پروین گہری نظروں سے نبیل کی طرف دیکھنے لگی۔

''پروین! میرے اندر کوئی بڑی حیرت انگیز تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ جسے میں شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔ تم واحد فرد ہو جس سے آج میں اپنے دل کا حال کھول کر بیان کر رہا ہوں۔ انگلینڈ میں میں کچھ عرصے سے بہت الجھا الجھا اور بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا۔ مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے میں کسی دور دراز علاقے کی بھٹکی ہوئی روح ہوں۔ جو غلطی سے ان رنگینیوں کی طرف نکل آئی ہے۔ مگر......... جب سے میں گاؤں آیا ہوں مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے۔ جیسے بھٹکی ہوئی روح کو منزل مل گئی ہے۔ مٹی سے جدا خمیر مٹی سے آ ملا ہے۔

''ان کھلی ہواؤں اور ان فضاؤں کو میں نے پہلی دفعہ دیکھا ہے۔ مگر پھر بھی یوں محسوس ہوتا ہے۔ یہ سب میرے لیے نیا نہیں۔ ان سب مناظر کا عکس میرے اندر پہلے سے موجود تھا۔''

پروین نبیل کی پُر سوچ آنکھوں کی طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔

''ایسے کیوں دیکھ رہی ہو.........؟''

''سوچ رہی ہوں۔ باہر سے نظر آنے والا انسان اندر سے کتنا مختلف ہے۔''

''میرے بارے میں بدگمان ہو رہی ہو............؟''

''آپ کی شخصیت کے دو روپ دیکھ کر محظوظ ہو رہی ہوں.............''

''غالباً ایک انگلینڈ والا، دوسرا گاؤں والا۔''

''ہاں..........شاید کہہ سکتے ہیں۔'' وہ ہلکا سا مسکرائی۔

اس وقت وہ نبیل کو گاؤں کی ان پڑھ، سادہ سی لڑکی نہیں لگ رہی تھی۔ بلکہ کسی بڑے شہر کی یونیورسٹی کی ہونہار طالبہ دکھ رہی تھی۔ جو یونیورسٹی کے سرسبز باغیچے میں اپنے کلاس فیلو کے ساتھ فلسفیانہ گفتگو کرتی جا رہی ہو۔

پروین نبیل کو کھیتوں سے تھوڑا پہلے چھوڑ کر واپس چلی گئی۔ وہ اسے دور تک جاتے دیکھتا رہا۔ بہت دور جا کر پروین نے مڑ کر دیکھا نبیل اس وقت دیکھ رہا تھا۔ اسے اتنی دور سے بھی پروین کا چہرہ یوں چمکتا ہوا نظر آ رہا تھا جیسے چودھویں کا چاند ہو۔ جونہی پروین نے مڑ کر دیکھا نبیل نے اپنا رخ پھیر لیا اور کھیتوں کی طرف چل پڑا۔

دور سے ہی پھپھا اسے کھیت کے کنارے بیٹھا نظر آ گیا۔ ''آ بھئی پتر نبیل! اتنی دیر لگا دی.......... میں تو سمجھا اب آئے گا ہی نہیں..........''

''نہیں پھوپھا ناشتہ ذرا لیٹ کیا اس لئے دیر ہو گئی...........''

''آ..........بیٹھ جا یہاں میرے پاس میں تجھے بتاتا ہوں پنیری کیسے لگاتے ہیں۔''

وہ بڑے تجسس سے پھپھا کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ دیکھ اسے منجی کہتے ہیں۔'' وہ چھلکا لگے چاول نبیل کو دکھا کر بولا۔ ''کل جو بوری تُو نے کھالے کے پاس پڑی دیکھی تھی منجی کی ہی تھی۔ پنیری لگانے سے پہلے منجی کی بوری کو پانی میں رکھ دیں تو یہ راتوں رات پھوٹ پڑتی ہے۔ پھر اس منجی کو تیار ہوئی زمین پر چھٹوں کی صورت میں بکھیر دیا جاتا ہے۔ یہ دیکھ بندے منجی زمین پر پھینک رہے ہیں۔'' وہ ایک طرف اشارہ کر کے بولا جہاں دو بندے ہاتھوں میں منجی لیے تیار کردہ زمین پر پھینک رہے تھے۔ ''یہ منجی تقریباً ایک مہینے میں تیار ہو کر لاب کی شکل میں آ جاتی ہے۔ لاب اس پہلے سے ایک پتے والے بوٹے کو کہتے ہیں جو نو دس انچ تک لمبا ہو جاتا ہے۔ جب لاب تیار ہو جاتی ہے تو اسے تنکا تنکا کر کے زمین سے نکال لیا جاتا ہے اور چھوٹی چھوٹی گڈیاں بنالی جاتی ہیں۔ پھر اس تنکا تنکا لاب کو منجی کے لیے تیار ہوئی زمین میں ایک ایک کر کے نو دس انچ کے فاصلے سے لگا دیا جاتا ہے۔''

''پھوپھا! پھر چاول کب تیار ہوتے ہیں..........؟'' نبیل گہری دلچسپی سے بولا۔

''او سوہنے پُتر! چاول تو چار پانچ مہینے میں جا کر تیار ہوتا ہے۔ تُو ادھر ہوتا تو میں تجھے دکھاتا کیسے بوٹا بڑا ہوتا ہے اس پر منجریں لگتی ہیں۔ منجروں پر ہرے دانے آتے ہیں۔ دانوں میں دودھ سا بنتا ہے اور پھر وہ دودھ گاڑھا ہو کر چاول کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔''

''سچ پھوپھا! کیا واقعی پہلے چاول دودھ کی شکل میں ہوتا ہے؟'' نبیل حیرت انگیز جوش سے بولا۔

''ہاں پُتر! ہرے دانوں میں بھرا دودھ ہی آہستہ آہستہ سخت ہو کر چاول کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔''

''پھوپھا! کاش میں چاول کو تیار ہوتے دیکھ سکتا.........''

''پُتر! دو تین مہینے بعد پھر چلے آنا.........کام کے سلسلے میں تو تمہیں پاکستان آنا پڑتا ہے۔ یہاں بھی چلے آنا.........''

نبیل خاموش پیپل کے درختوں سے پرے دور کھلے آسمان کو دیکھنے لگا۔ جہاں بہت سے کبوتر ہوا میں اڑ رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا ان کی زندگی کتنی پیاری ہے۔ وہ آزادی سے کیسے کھلی فضاؤں میں تیرتے چلے جا رہے ہیں۔ کاش میں بھی ان کی طرح آزاد ہوتا.........کاش۔

☆.........☆.........☆

''ماما! کیا نبیل بھائی پاکستان سے واپس نہیں لوٹے.........'' عینی جاگرز سمیت صوفے پر چوکڑی بھرتے بولی۔

''میں تو تنگ آ گئی ہوں اس لڑکے سے.........بھائی جان موبائل پہ رابطہ کر کے تھک چکے ہیں۔ مگر وہاں سے جواب نہیں آتا۔ پتا نہیں کیسا غیر ذمے دار لڑکا ہے۔ آلینے دو وہاں سے خوب خبر لوں گی.........اس کی.........''

''ماما! ہیلو ہاؤ آر یو.........آر یو فائن.........'' شکیل کمرے میں داخل ہوتا ہوا چلانے لگا۔

''شکیل تمہیں کتنی دفعہ منع کیا ہے اتنی اونچی آواز میں مت بولا کرو.........میرا دماغ پھٹ جائے گا کسی دن.........''

''محترم نبیل صاحب پاکستان سے تشریف لائے یا نہیں.........؟'' وہ ماتھے پہ بل ڈال کر بولا۔

کوئی جواب نہ پا کر وہ باہر کی طرف لپکا۔ ''میں ماموں کی طرف ہوں کھانا لگ جائے تو بلوا لیجئے گا۔'' وہ وسیع باغیچے کو عبور کر کے ماموں کی طرف باغیچے میں پہنچ گیا۔

سرسبز باغیچے میں دھری سفید کرسیوں پر سومی، رومی اور ٹونی بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔ شکیل کو دیکھ کر ایک نعرہ بلند ہوا پھر شکیل سب سے ہاتھ ملا کر خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''ہیلو فرینڈز! کیسے منصوبے بن رہے ہیں۔ سوئمنگ پول بنانے والا منصوبہ کامیاب ہوا یا نہیں.........؟''

''ڈیڈی نہیں مان رہے.........'' سومی ماتھے پر تیوری ڈال کر بولی۔

''ایسی بات ہے تو سب مل کر انکے سامنے احتجاج کریں گے۔'' شکیل ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے بولا۔

''وہ نہیں مانیں گے.........'' رومی تلخی سے بولی۔

''یارا! یہ تمہارا بھائی نبیل کیا چیز ہے۔ بالکل ہی بونگا ہو گیا ہے چپ چپ سا رہتا ہے نہ کسی سے بات کرتا ہے نہ اب اسے کبھی ہنستے مسکراتے ہوئے دیکھا ہے.........''

''کہیں کسی سفید چمڑی والی سے عشق وغیرہ تو نہیں لڑا بیٹھا'' رومی طنزیہ انداز میں مسکرائی۔

''بھائی صاحب کی مجھے بھی کوئی سمجھ نہیں آتی۔ ویسے مجھے تو کچھ کچھ ابنارمل نظر آنے لگے ہیں دن بدن نفسیاتی مریض بنتے جا رہے

ہیں..........'' شکیل کے جملے پر زبردست قہقہہ بلند ہوا۔

''بری بات..........ہمیں کسی کی پیٹھ پیچھے برائی نہیں کرنی چاہئے۔'' چھوٹا ٹونی سنجیدگی سے بولا۔

''تم بات بے بات نصیحت کرنا نہ بھولا کرو..........'' اس دفعہ سوی چہکی اتنے میں رومی کی ماں ٹراؤزر شرٹ پہنے لاؤنج کی طرف سے چلی آ رہی تھی۔ اس نے بڑے بھونڈے انداز میں گھاس کی طرح کترے بالوں کو پونی ٹیل کی صورت باندھ کر رکھا تھا۔

''بیٹا شکیل! نبیل سے ابھی تک پاکستان رابطہ نہیں ہو سکا۔ ٹور منیجر سے فون نمبر پوچھ کر پاکستان رابطہ کیا تو پتا چلا صاحب زادے کسی گاؤں کی سیر کو نکلے ہوئے ہیں۔ آج دوسرا دن ہے واپس نہیں لوٹے۔''

اتنے میں انوری بیگم بھی لان میں پہنچ چکی تھیں۔ رومی کی ماں نعمانہ کی بات سن کر اسکا غصہ آسمان کو چھونے لگا۔ کیا

''کہا بھابھی! وہ پاکستان میں کسی گاؤں میں ہے اس وقت..........؟''

''جی ہاں، بہن انوری! برخوردار کسی گاؤں کی سیاحت پر ہیں۔''

''آ لینے دو واپس..........صاحب زادے کے ہوش ٹھکانے نہ لگائے تو انوری بیگم نام نہیں میرا..........''

انوری بیگم غصے سے پھنک رہی تھی۔

''بہن جی! میرا خیال ہے اس کی شادی کل کرنی ہے تو آج کر دیں..........سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میری بیٹی بے حد سیانی ہے۔ چند دنوں میں سیدھے رستے پر لے آئے گی..........''

''ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ اس لڑکے نے تو میرا دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔''

رومی تیز نظروں سے ماں اور پھوپھی کی طرف دیکھ کر ہلکا ہلکا مسکرانے لگی۔ اسے خود پر پورا یقین تھا کہ وہ چند ہفتوں میں ہونے والے شوہر نبیل کے سب کس بل نکال دے گی۔ پھر اس پر کاٹھی ڈال کر اپنے اشاروں پر چلائے گی۔ رومی جیسی تیز طرار لڑکی کے لیے نبیل ایک بدھو سا نوجوان تھا اور اسے ایسے ہی بدھو شوہر کی ضرورت تھی۔

☆..........☆..........☆

سورج کی سنہری دھوپ ہر سُو پھیل چکی تھی۔ کچا صحن اور صحن میں پڑی ہر چیز زرد رنگ ہو چکی تھی۔

برگد کی گہری چھاؤں تلے ننھے پرندے اپنے گھونسلوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ کھلے صحن سے پرے درخت اور درخت کے پار زمین سے ذرا اونچا لکڑی کا ادھ کھلا دروازہ جس سے گرم لو والی ہوا فراٹے بھرتی اندر داخل ہو رہی تھی۔ پروین اوپر اپنے کمرے میں بستر پر دراز تھی۔ اسکی آنکھوں کے گوشے بھیگ رہے تھے۔ اس کی اوڑھنی پلنگ کے پائے پر دھری تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آدھا گریبان کھلا ہوا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ دور کسی نامعلوم صحرا میں تنہا کھڑی ہے۔ لُو اس کے جسم کو جُھلسائے جا رہی ہے۔ مگر اسے تکلیف کے بجائے مزا آرہا ہے۔ اس کے کپڑے پھڑ پھڑا رہے ہیں۔ تیز ہوا کی وجہ سے اس کے بال پیچھے کی طرف لہرا رہے ہیں۔ ادھ کھلے گریبان سے حیات بخش حرارت سینے میں منتقل ہو رہی ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہیں۔ وہ کسی پتھر کی طرح بالکل ساکت و جامد کھڑی ہے۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو ریت کے ذرّے آنکھوں میں چبھنے لگے۔ آنکھیں افق کی سرخی کا منظر پیش کرنے لگیں۔ اس سرخی سے بے تحاشہ آنسو ابلنے لگے۔ اس نے آنسوؤں کو روکنا چاہا مگر ناکام ہو گئی۔

''انسانوں سے بھی کبھی پیار کیا؟''

''ہاں.........کیا.........''

''کس.........سے.........''

''اپنی ہونے والی بیوی سے.........اپنی ہونے والی بیوی سے.........''

اس آواز کی بازگشت اس کے لیے بڑی روح فرسا تھی۔ اسے معلوم تھا اس کی شادی ماموں کی بیٹی سے ہونے والی ہے۔ اس نے پچھلے چند گھنٹوں سے اپنے دل کو بہت بہلایا تھا۔ مگر وہ دل ہی کیا جو مان جائے۔ وہ اس ویران صحرا میں اکیلی کھڑی تھی۔ کسی کا ساتھ نہیں تھا۔ کچھ امیدیں تھیں۔ کچھ خیالی سوچیں تھیں۔ جو ہر کاب تھیں۔ جھلستے ہوئے صحرا کی گرم ہوا کبھی سرور دینے لگتی کبھی من جلانے لگتی۔ وہ امید و ناامیدی کے درمیان ڈوب ابھر رہی تھی۔ اتنی جلدی یہ سب کیا ہو گیا تھا.........دیکھتے ہی دیکھتے اس کا دل اس کا اپنا نہیں رہا تھا۔ یکدم نیچے سے کسی کے اوپر آنے کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے اٹھی جھپٹ کر چنری اٹھا کر سر ڈھانپا۔ چنری کو سینے پہ پھیلایا۔ اتنے میں اوپر آنے والا دروازہ کھٹکھٹا چکا تھا۔

''میں اندر آ سکتا ہوں؟'' نبیل ادھ کھلے دروازے سے بولا۔

پتا نہیں کیوں یکدم نبیل کی آمد سے اس کے دل میں میٹھا سا درد اٹھتا تھا اور دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتی تھیں۔

''آئیے.........'' وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

پھوپھا نے کہا گرمی زیادہ ہو گئی ہے گھر جا کر آرام کرلو۔ میں گھر چلا آیا نیچے تو کوئی نہیں ہے۔ پھوپھی کہیں گئی ہوئی ہیں.........''

''ماں نیچے نہیں ہے.........؟''

''میرا خیال ہے.........نہیں.........'' نبیل آنکھیں مٹکا کر طنزیہ انداز میں بولا۔

''لگتا ہے ماں.........ملکانی جی کے گھر سے چاولوں کی پنیاں لینے گئی ہوگی.........'' وہ پُرسوچ لہجے میں آہستگی سے بولی۔ اس کی آواز

نبیل کے کانوں تک پہنچ گئی۔

''جس کی اتنی جوان دھی ہو۔ وہ ماں کام کرتے ہوئے کچھ اچھی نہیں لگتی۔'' نبیل شرارت سے بولا۔

''جج.........جی کیا کہا..........''

''میں کہہ رہا تھا۔ تمہارے جیسی سوہنی دھی اللہ ہر کسی کو دے.......... پھوپھی کتنی خوش قسمت ہیں..........''

پروین کا سارا خون چہرے کی طرف لپکنے لگا۔ وہ شرمندگی سے زمین میں گڑھی جا رہی تھی۔ ''آپ آپ بیٹھیں ناں..........'' وہ شرمندگی دور کرنے کے لیے بولی وہ نبیل کی پہلی والی بات سمجھ چکی تھی۔

''پروین! میں کل صبح جا رہا ہوں۔'' پروین کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ ''کوشش کروں گا تم لوگوں کو انگلینڈ سے خط لکھتا رہوں۔ اگر قسمت نے یاوری کی تو جلد گاؤں دوبارہ آؤں گا۔ جتنے دن میں نے گاؤں میں گذارے انکی یادیں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔''

پروین کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ دل چاہا کہ نبیل سے کچھ کہے۔ کسی کو تو دل کا راز داں بنالے مگر وہ طاقت بے چاری کہاں سے لاتی جو اس سے سب کچھ اگلوا سکتی۔

''پروین! تم رو کیوں رہی ہو..........'' نبیل حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''کچھ.........پھر پیٹ میں تکلیف ہو رہی ہے۔'' وہ تھوڑا سا جھک گئی۔

''کوئی میڈیسن وغیرہ لا دوں۔'' نبیل پریشانی کے عالم میں بولا۔

''ضرورت نہیں ہے..........ابھی آرام آ جائے گا..........'' پھر وہ اپنے ہی فقرے پر غور کرنے لگی۔

''ابھی آرام آ جائے گا.........کیا ایسا ہو جائے گا کیا ایسا ہو سکتا ہے؟''

نبیل ہاتھ آگے بڑھا کر اسے دلاسہ دینا چاہتا تھا مگر ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

چند منٹ خاموشی کے گذر گئے..........پروین نے چہرہ اوپر اٹھالیا۔

''اب میں ٹھیک ہوں۔'' وہ نبیل کو پریشان دیکھ کر بولی۔

''آئیں نیچے چلتے ہیں۔'' وہ نبیل کو لے کر نیچے آ گئی۔ ''آپ اندر لیٹ کر آرام کرلیں ابھی ماں آتی ہے تو پھر کھانا کھالیں گے..........''

وہ بستر پر لیٹ گیا اور واپس پلٹتی ہوئی پروین کو عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ بستر پر لیٹے ہوئے اسے باہر کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ سنہری دھوپ نے ہر طرف اپنا جال بچھایا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا پروین ہینڈ پمپ کے پاس بیٹھی وضو کر رہی تھی۔ اسکا سنہری چہرہ کندن کی مانند دمک رہا تھا۔ پھر وہ برگد کے درخت تلے پتھر کی سل پر مصلیٰ بچھا کر نماز پڑھنے لگی۔

''چوں.........چوں.........چچوں.........چچوں.........'' چھت میں بنے گھونسلے میں بیٹھی چڑیا وقفے وقفے سے اپنا راگ الاپ رہی تھی۔ کائنات کے وسیع سمندر میں جیسے سناٹا تھا۔ خاموشی تھی۔ کوئی لہر' کوئی آواز' کوئی آہٹ نہیں تھی۔ صرف..........وقفے..........وقفے سے

چڑیا کے خوبصورت چہچہانے کی آواز تھی۔ وہ خاموشی اداس دل کو گدگدا رہی تھی یا نظروں کے سامنے وہ حسین مورت تھی جو نماز پڑھ لینے کے بعد بیٹھی قرآن پاک پڑھ رہی تھی۔ درخت کے اس حصے پر کپڑا باندھا ہوا تھا۔ کوئی بیٹ کوئی گندگی پتھر کی سل پہ نہیں گرتی تھی۔ دودھیا دوپٹے میں لپٹی قرآن پاک پڑھتی وہ کوئی اپسرا تھی۔ کسی اور دنیا کی باسی تھی۔

اتنے میں جنت بی بی آ گئی۔ جنت بی بی نے نبیل کو کھانے میں ساگ اور مکئی کی روٹی دی۔ وہ انگلیاں چاٹتا رہ گیا۔ کھانے کے بعد وہ گہری نیند سو گیا۔ اس کی آنکھ تب کھلی جب دین محمد کھیتوں سے واپس لوٹ چکا تھا۔ دین محمد کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ نبیل کو بھوک نہیں تھی اس لئے اس نے کھانا نہیں کھایا۔

''نبیل پتر! گاؤں میں رہنے کا مزہ بھی آیا یا نہیں.........'' دین محمد لقمہ پیتا ہوا بولا۔

''پھوپھا! کیسی بات کرتے ہیں۔ میرے بس میں ہو تو یہاں سے واپس نہ جاؤں۔''

''ولایت جا کر ہمیں بھول تو نہیں جائے گا۔'' جنت بی بی کی آنکھوں میں پتا نہیں کہاں سے اتنے آنسو اُمڈ آئے۔ نبیل چارپائی سے اٹھ کر جنت بی بی کے پاس آ بیٹھا اور پھوپھی کو کندھوں سے تھام کر بولا۔

''پھوپھو! اب میں اتنی جلدی آپ لوگوں کی جان نہیں چھوڑنے والا.........اب آنا جانا لگا رہے گا۔'' دین محمد کا حقہ تازہ کرتے ہوئے پروین کا ہاتھ کانپا اور گرم راکھ اسکے ہاتھ پہ گر گئی اس کی گھٹی گھٹی چیخ بلند ہوئی۔ اس نے ضبط کرنے کے چکر میں اپنا نچلا ہونٹ دانتوں سے زخمی کر لیا۔

عشاء کی نماز پڑھ لینے کے بعد دین محمد نبیل کو لے کر چاچا حیات کے ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ پہلے عشرے کا چاند مہین لائن کی صورت آسمان پہ دکھ رہا تھا۔ اس سے نیچے دور بہت دور درختوں کے دھند لکے سائے نظر آ رہے تھے۔

''او ہو دیکھو نبیل پتر آ ہی گیا.........کب سے اسے اڈیک رہے تھے.........'' دتو ترکھان نے آتے ہوئے دین محمد اور نبیل کی طرف اشارہ کیا تو سب اس طرف دیکھنے لگے۔

چاچا حیات نے نبیل کو اپنے پاس بڑے منجے پر بٹھالیا۔ ''پتر! آج سارا دن کہاں غائب رہا۔ ہم لوگ تیرا انتظار ہی کرتے رہے۔''

بس چاچا! کچھ تھکا ہوا تھا آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا تھا.........''

''پتر نبیل سنا ہے تم کل واپس جا رہے ہو۔'' دینو موچی تاسف سے بولا۔

''تو بھی ناں بس اُلو کا اُلو ہی رہے گا.........بڈھا ہو گیا پر عقل نہیں آئی.........ہم نبیل کو جانے دیں گے تو جائے گا ناں.........'' بشیر کمہار تیز آواز میں بولا۔ دینو موچی اور بشیر کمہار کی آپس میں نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔

دینو موچی بھی اوپر چڑھ کر سیدھا ہو گیا۔'' مجھے بوڑھا ہو کر عقل نہیں آئی تو تُو نے اس عمر میں کونسے تیر چلا لیے ہیں۔ کھوتوں کے ساتھ رہ رہ کر خود بھی.........''

''بس.........بس اس سے آگے ایک لفظ نہیں کہنا۔'' بشیر کمہار تنک کر بولا۔

''بس رہنے دے.......... میرے کہنے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ جو تو ہے.......... وہ تو ہے ہی..........'' سب لوگ بلند آواز میں قہقہے لگانے لگے۔ کئی منچلے بوڑھے پیٹ تھامے لوٹ پوٹ ہوئے جا رہے تھے۔ بشیر کمہار طیش میں آ کر گالیاں دینے لگا تھا۔ جوں جوں گالیوں میں شدت آتی جاتی قہقہے بھی بلند ہوتے جاتے۔ سب کو علم تھا یہ دو بوڑھوں کی لڑائی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ بشیر کمہار صافے سے پسینہ پونچھ کر خاموش ہو گیا۔

اتنے میں شرفو نائی نے اسے چھیڑ دیا۔ ''چاچا بشیر! چاچے دینو نے تیرے ساتھ اچھا نہیں کیا بیٹھے بٹھائے تجھے'' وہ بنا دیا۔''

''بھوتنی کے تو چپ ہو جا.......... میرا دماغ اور کھراب مت کر.......... نبیل پتر کے ہوتے ہوئے میں تم لوگوں سے ریت برت رہا ہوں۔ نہیں.......... تو..........''

''نہیں.......... تو کچھ بھی نہیں..........'' چاچا حیات مسکرا کر بولا۔ اکثر وہی انکی نوک جھونک اور لڑائی بند کروایا کرتا تھا۔

''کاش پتر نبیل! واپس نہ جاتا.......... دو مہینے بعد شاہ مدین کا میلہ آنے والا ہے۔''

''شاہ مدین کا میلہ.......... چاچا یہ میلہ کہاں لگتا ہے..........؟'' نبیل تجسس سے بولا۔

''پتر! یہاں سے پندرہ میل دور اک پنڈ ہے وہاں یہ میلہ لگتا ہے۔ آس پاس کے سارے پنڈوں کے لوگ وہاں پہنچتے ہیں۔ وہاں چاروں طرف انسانوں کے سر ہی سر نظر آتے ہیں یوں لگتا ہے انسانوں کا سمندر بہہ رہا ہے۔''

''کاش میں وہ میلہ دیکھ سکتا..........'' نبیل اداس ہو کر بولا۔

''پتر میلہ سون کی دس تاریخ کو لگتا ہے۔ ابھی دو مہینے دس دن پڑے ہیں۔ کوشش کرنا کام کے سلسلے میں ایک اور چکر لگ جائے۔'' دین محمد حقے کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا۔

نبیل ایک طویل سانس خارج کر کے بولا۔ ''دیکھو.......... جو خدا کو منظور ہو..........''

سب کا دل چاہتا تھا کہ نبیل واپس نہ جائے۔ اس لیے وہ کہتے بھی تھے پتر! ہم تجھے جانے نہیں دیں گے۔ مگر وہ سب جانتے تھے یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ اس سہانی رات وہ لوگ خلافِ معمول بارہ بجے تک بیٹھے گپیں ہانکتے رہے۔ انہیں معلوم تھا صبح نبیل کو چلے جانا ہے۔ صبح ان کے حسنے کا بیٹا ان سے جدا ہونے والا تھا۔ وہ تو ٹھیک طرح اس سے مل بیٹھ بھی نہ سکے تھے۔

جب دین محمد نبیل کو لے کر گھر واپس آیا تو دین محمد کا جسم تھکن سے چور تھا۔ جنت بی بی کمرے میں سو چکی تھی۔ پر دین کے کمرے کی لائٹ بھی بجھی ہوئی تھی۔ دونوں کا بستر چھت پہ لگا ہوا تھا۔ دین محمد تو پڑتے ہی سو گیا۔ البتہ نبیل دو گھنٹے تک کروٹیں بدلتا رہا اور بہت کچھ سوچتا رہا۔ آخر اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔ مگر اس گھر میں ایک فرد تھا جو ابھی تک جاگ رہا تھا۔

پر دین کے کمرے کی لائٹ بجھی ہوئی تھی۔ وہ بستر پر چت لیٹی پٹ پٹاتی آنکھوں سے اندھیری چھت کو گھورے جا رہی تھی۔ گرم آنسو بہہ کر بستر میں جذب ہو چکے تھے۔ مگر کنپٹیوں اور کانوں کی لوؤں پہ اپنے نشان چھوڑ گئے تھے۔ صبح نبیل جا رہا تھا۔ کیا وہ بھی ماے حسنے کی طرح پھر کبھی اپنی شکل نہ دکھائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو وہ جیتے جی مر جائے گی۔ خدا کرے وہ ضرور واپس آئے.......... بے شک.......... اپنی بیوی کو ہی ساتھ لے کر

آئے.......... یہ الفاظ بے اختیار اس کی زبان پر آئے تھے۔ یا شاید یہ پیار کی انتہا تھی جس نے اتنے بھاری الفاظ اگلوائے تھے۔ اک دم دل کو کھینچ سی پڑی اور اس کی آنکھوں میں بے تحاشا آنسو امڈ آئے.......... یہ دو تین دن میں اسے کیا ہو گیا تھا۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ سوچتے سوچتے یونہی ایک دیوانی سی سوچ اس کے ذہن میں آنے لگی شاید.......... وہ بھی مجھ سے پیار کرتا ہو؟.......... شاید اس کے دل کے کسی کونے میں میرے لیے تھوڑی سی ہی جگہ ہو۔ قبر جتنی جگہ جس میں اک مردہ سما جائے۔ اک بے جان وجود سمٹ جائے۔ مگر اسے پتا تھا یہ اس کی خوش فہمی کے علاوہ کچھ بھی نہیں اس نے تو اس کے سامنے دوٹوک الفاظ میں کہا تھا کہ میں اپنی ہونے والی بیوی سے پیار کرتا ہوں۔ یہ الفاظ وہ گرم انگارے تھے جو اس کے وجود کو جھلسائے جا رہے تھے۔ اس کے بنائے ہوئے پیار کے خیالی محلات کو نذرِ آتش کر رہے تھے۔ رات کے آخری پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ بمشکل ایک گھنٹہ سوئی تھی کہ جنت بی بی نے اٹھا دیا۔

''پتر پروین نماز کا ویلہ ہو گیا ہے۔'' جنت بی بی نے کندھے سے پکڑ کر ہلکا سا جھنجھوڑا تو وہ جھٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ چنری درست کر کے تیزی سے نیچے آ گئی۔ گھر کی ہر چیز اداس اداس دِکھ رہی تھی۔ برگد کا بلند درخت بھی جیسے اس کے غم میں برابر کا شریک تھا۔ اس نے جلدی جلدی وضو کیا اور نماز کے لئے کھڑی ہو گئی۔

نبیل بھی اٹھ کر باورچی خانے میں پہنچ چکا تھا۔ پروین کمرے میں مصلیٰ ڈال کر نماز ادا کر رہی تھی۔ جبکہ جنت بی بی برگد کے نیچے نماز میں مشغول تھی۔ نبیل بڑی محویت سے دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے من میں شدت سے خواہش ابھری کہ وہ بھی نماز پڑھے۔ مگر اسے نماز آتی نہیں تھی۔ اس نے تو آج تک نائٹ کلب دیکھے تھے۔ تھرکتی مچلتی نازنینیں دیکھی تھیں۔ جاموں سے جام ٹکراتے دیکھے تھے۔ بے حیائی کا لبادہ اوڑھے آزادی اور فیشن کے نام پہ سسکتی ہوئی انسانیت دیکھی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا۔ بندگی کس چیز کا نام ہے.......... حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر لینا اصل میں کتنا بڑا وقار ہے۔ جنت بی بی جب نماز پڑھ کر لوٹی تو وہ کچھ پریشان سا تھا۔

''پتر کیا! بات ہے.......... کچھ پریشان لگ رہا.......... ہے۔''

''پھوپھی!.......... اصل.......... میں..........''

''ہاں.......... ہاں بول پتر..........''

''پھوپھی.......... میں نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے نماز آتی نہیں۔'' وہ نظریں جھکا کر شرمندگی سے بولا۔ جنت بی بی خوشی سے کھل اٹھی۔ ''میں صدقے.......... میرا پتر.......... اتنے دن سے میں سوچ رہی تھی تجھے نماز کے متعلق کہوں.......... مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو رہی تھی۔

''آ میرا بیٹا! میں تجھے نماز سکھاؤں..........''

جنت بی بی نے پروین کو کام میں لگا دیا اور نبیل کو وضو اور نماز سکھانے لگی۔

پروین کام بھی کر رہی تھی اور باہر بھی دیکھ رہی تھی۔ جہاں نبیل جنت بی بی کے کہنے کے مطابق نماز پڑھ رہا تھا۔ وہ چکی چلا رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ قطرہ قطرہ آنسو چکنے گالوں پر پھسل رہے تھے۔ ''سوہنا اللہ تجھے میری عمر بھی لگا دے..........'' وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی۔

جب نبیل نماز پڑھ کر جنت بی بی کے ساتھ باورچی خانے کی طرف آیا تو اس کے چہرے پہ کوئی نور چمک رہا تھا۔اس کی آنکھوں سے سرشاری پھوٹ پھوٹ پڑ رہی تھی۔

''پتر! نماز کو اپنا معمول بنا لے.......... یہ ایک یا دو دن پڑھنے والی چیز نہیں ہے۔یہ تو آخری سانس تک کا ساتھ ہے۔''

''پھوپھو! آپ شاید سن کر حیران ہوں۔اب اگر میں نماز چھوڑنا بھی چاہوں تو نہ چھوڑ سکوں گا.......... مجھے وہ سکون ملا ہے جسکا بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں..........اب میں آپکے کہنے کے مطابق شہر سے نماز والی کتاب خرید لوں گا۔''

جنت بی بی نے اس کے سر پہ پیار دیا اور پیشانی پہ بوسا دیا۔''سوہنا رب تجھے ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔؟

پروین کی آنکھوں میں رتجگے کی سرخی تھی۔یوں دکھتا تھا کہ خوبصورت جھیل میں شام کی سرخی اتری ہو۔وہ کوئی حسین ساحرہ دکھ رہی تھی۔ اس کی سیاہ دراز پلکوں پہ جیسے ابر بسیرا کیے رہتے تھے۔اس کے باریک گلابی ہونٹ یوں رہتے جیسے ابھی ہنسی کہ ہنسی۔

''پروین! کسی کپڑے میں چاولوں کی پنیاں اور بادام والا گڑ ڈال دے.......... نبیل پتر ساتھ لے جائے گا۔''

پروین نے ایک مرتبہ پیار بھری نظروں سے نبیل کی طرف دیکھا اور وہاں سے اٹھ گئی۔جب وہ نبیل کے سامنے ہوتی تھی تو سارے غم بھول کر کھلکھلا اٹھتی تھی۔مگر جونہی وہ نظروں سے اوجھل ہوتا ایک دم اداس ہو جاتی۔اس کا جسم بے جان سا ہو جاتا۔جب نبیل سارے گاؤں سے مل جل کر رخصت ہوا تو بڑا عجیب منظر تھا۔شرفو نائی کرائے کی کار پکڑ لایا تھا۔سب باری باری اس سے گلے ملے۔دین محمد کار میں بیٹھ کر بڑی سڑک تک نبیل کو چھوڑنے گیا۔کھیتوں کے پاس سے گزرتے ہوئے نبیل بولا۔

''پھوپھا! جب میں پھر آؤں گا تو چاول کی فصل تیار ہو گی نا..........؟''

''ہاں پتر!..........دین محمد نے مختصر جواب دیا اس کا دل بھر آیا۔

اسے خدشہ تھا اب نبیل شاید کبھی نہ آسکے۔اس کے باپ نے بھی تو ایسے ہی کہا تھا۔بڑی سڑک پر گاڑی رکی دین محمد نے نبیل کو ڈھیروں پیار کیا اور بولا۔''پتر! تجھے تیرے مرے باپ کا واسطہ ہمیں بھول نہ جانا..........''

نبیل فرطِ جذبات سے دین محمد سے بغل گیر ہو گیا۔نبیل بار بار کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر نہیں کہہ پا رہا تھا۔اسنے بڑی کوشش کی خود میں بڑا حوصلہ جمع کیا مگر الفاظ زبان پر آتے آتے دم توڑ جاتے۔ہمت جواب دے جاتی۔آخر نبیل کار میں بیٹھا اور کار آگے بڑھ گئی۔دونوں طرف کھلی زمینیں تھیں سرسبز کھیت تھے۔دور ٹاہلی کے درخت ایک قطار میں دھندلکوں کی مانند دکھ رہے تھے۔گاؤں پیچھے رہتا جا رہا تھا۔گاڑی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

جنت بی بی اپنے کمرے میں بیٹھی زار و زار رو رہی تھی۔پروین اپنے کمرے میں آنسوؤں کی برسات کر رہی تھی اور نبیل کار میں بیٹھا غم زدہ تھا۔اس کے سینے پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔وہ عجیب و غریب حالات کا شکار ہو گیا تھا۔پاکستان آنے سے پہلے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی زندگی یوں بدل جائے گی۔گاؤں میں گزرے تین دن تین برسوں پہ بھاری تھے۔ان تین دنوں کی یادیں اسے تیز بھالوں کی صورت چھیڑ رہی تھیں۔گاؤں کی یاد تو ایک طرف تھی۔اسے جس کی صورت سب سے زیادہ رنجیدہ اور بے چین کیے جا رہی تھی وہ پروین تھی پھول کی پنکھڑی..........

صبح کا ذب کی پہلی کرن.........سرسبز سا کت کھیتوں کے اوپر صبح صادق افق در افق پھیلی نشیلی خوشبو..........وہ خوشبو اس کے انگ انگ میں رچ گئی تھی۔ وہ بہار کی کلی اس کے دل کے گلستان میں پھوٹ پڑی تھی۔ اس کا سارا من اس کی پاکیزہ مسحور کن خوشبو سے معطر ہوا جاتا تھا۔ وہ ایسی پاکیزہ صبا تھی جسے کسی آہٹ نے نہیں چھوا تھا۔

ایک دم نبیل کی آنکھیں بھر آئیں اس پر انکشاف ہوا وہ پروین کو چاہنے لگا ہے۔ پھر وہ خاموش کیوں رہا تھا؟ شاید اس لئے کہ وہ اس بے چاری کو غمگین نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے تو اس کے سامنے پیار کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس سے پہلوتہی اختیار کی تھی۔ اس نے اسے چھوٹے چھوٹے غم دے کر بڑے غم کا پہاڑ اس کے رستے سے ہٹا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا اس سے ایسا کوئی وعدہ کر جائے جسے وہ وفا نہ کر سکے اور وہ پیاری کانچ سی گڑیا ٹوٹ کر چکنا چور ہو جائے۔

وہ کیسا پیار کر رہا تھا۔ وہ اسے دیوانگی کی حد تک چاہنے کے باوجود اس سے دور ہو رہا تھا۔ پروین سے پیار کرنا اور پھر اس سے جدا ہونے کا فیصلہ کرنا یہ سب کچھ تین چار روز کے اندر ہی تو ہو گیا تھا۔ اب اپنے اور اس کے درمیان ایک خود ساختہ دیوار کھڑی کر کے وفا کا بھرم رکھ رہا تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ شاید وہ بہت مجبور تھا۔ وہ اسے چاہنے کے باوجود اس کے سامنے محبت کا اظہار نہیں کر سکا تھا۔ یہ انوکھی محبت تھی.........شاید وہ اس معصوم نازک دل لڑکی کو محبت کے تپتے صحراؤں میں نہیں گھسیٹنا چاہتا تھا۔ فراق کے مہیب جہنم میں نہیں دھکیلنا چاہتا تھا۔ اظہار محبت کی اک خوشی دے کر جدائی کے سینکڑوں غم اس کے نام نہیں کرنا چاہتا تھا۔

.........جہاز کا سفر بھی اس نے بڑے کرب میں طے کیا۔ مگر جب جہاز نے انگلینڈ کی سرزمین کو چھوا تو اسے جیسے قرار سا آ گیا۔ اسے اپنے اظہار محبت نہ کرنے کے فیصلے پر اطمینان سا ہونے لگا اسے محسوس ہونے لگا جیسے اسنے کسی کی نازک پھولوں سی زندگی برباد ہونے سے بچا لی ہے۔

نبیل سیدھا ماموں کے دفتر گیا۔ ماموں پہلے تو تھوڑا سا خفا ہوئے مگر پھر انہوں نے خوش ہو کر نبیل کی پیٹھ تھپکی۔ ''شاباش بیٹے! مجھے خوشی ہوئی تم نے تمام کام خوش اسلوبی سے نمٹائے مجھے محسوس ہو رہا ہے نور منیجر کو چھٹی دے کر مجھے تم کو اس پوسٹ پہ سیٹ کرنا پڑے گا۔

''نہیں ماموں! میں کسی کی روزی پہ لات نہیں مار سکتا.........'' نبیل مسکراتے ہوئے بولا۔

سیٹھ افضل آنکھیں سکیڑ کر کچھ سوچتے رہے پھر دھیرے سے مسکرانے لگے.........'' شاباش بیٹا! انہی باتوں کی وجہ سے تم مجھے زیادہ محبوب ہو.........''

''تھینک یو! ماموں.........''

نبیل جب گھر پہنچا انوری بیگم منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ نبیل نے سلام کیا انوری بیگم نے منہ پرے پھیر لیا.........نبیل دوسری طرف جا کر ہاتھ جوڑ کر ماں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''سوری.........مام.........''

وہ خشمگیں نظروں سے نبیل کی طرف دیکھنے لگی۔ ''تو.........پاکستان میں کسی گاؤں کی سیر کرنے بھی گیا تھا؟''

''جی ہاں مام! میں پھوپھو سے ملنے انکے گاؤں گیا تھا۔''

''کیا ضرورت تھی تجھے گاؤں جانے کی.........'' انوری بیگم غصے سے پھنکاری۔

''مام! وہ ہمارے رشتے دار ہیں.......... پھوپھی لگتی ہیں وہ میری۔''

''ہمارا کوئی رشتے دار گاؤں میں نہیں رہتا۔'' انوری بیگم تلخی سے بولی۔

''مام! وہ بہت اچھے لوگ ہیں.......... پیار کرنے والے.......... سیدھے سادے..........''

''جانتی ہوں میں کیسے سیدھے سادے ہیں وہ لوگ.......... تیرا باپ بھی ان لوگوں کے قصیدے پڑھا کرتا تھا۔ اگر میں مداخلت نہیں کرتی تو آج نقشہ کچھ اور ہوتا..........''

''آپ نے کیا مداخلت کی تھی..........؟'' نبیل پر سوچ لہجے میں بولا۔

''میں نے تمہارے باپ کو گاؤں جانے سے روک دیا تھا۔''

''اور وہ رک گئے تھے..........؟'' نبیل جیسے خیالوں میں بولا۔

''ہاں میں نے شرط ہی اتنی کڑی رکھی تھی کہ انہیں میرا کہنا ماننا پڑا۔''

''مام! بہت برا کیا آپ نے بہت برا..........''

''کیا اچھا ہے کیا برا! میں سب جانتی ہوں۔ تجھے نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں اگر یہ سب میں نہ کرتی تو اس وقت تم انگلینڈ میں نہ ہوتے اتنی شاہانہ زندگی نہ گزار رہے ہوتے۔ اور.......... اور یہ جو تمہارے جسم پہ قیمتی کپڑے ہیں یہ نہ ہوتے۔''

''مگر مام! یہ ضروری تو نہیں خوشحال زندگی کے لیے اپنوں کو بھلا دیا جائے..........''

''کن اپنوں کی بات کر رہے ہو تم.......... ہمارا تو کوئی اپنا گاؤں میں نہیں.......... اور کان کھول کر سن لو.......... آج کے بعد ان لوگوں کا ذکر میرے سامنے نہ کرنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔''

نبیل نے کوئی جواب نہیں دیا پیر پٹختا ہوا اپنے کمرے کی طرف ہولیا۔ انوری بیگم اسے دیکھتی رہ گئی۔ انوری بیگم اپنے کمرے میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ سوچنے لگی خاوند کو تو گاؤں جانے سے روک دیا تھا بیٹے کو کیسے روکے گی.......... کہیں وہ خود سر ہی نہ ہو جائے۔ کہیں وہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

انوری بیگم نبیل کو ڈانٹتی رہتی تھی مگر پیار بھی بہت کرتی تھی۔ اس کے دل میں اب یہ ڈر بیٹھ گیا تھا کہ خاوند والی کسر کہیں بیٹا پوری نہ کر دے۔ اس نے ابھی تو کہا تھا۔ ''وہ بہت اچھے لوگ ہیں پیار کرنے والے..........'' انوری بیگم نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ بہت جلد نبیل کی شادی رومی کے ساتھ کر دے گی۔

جب نبیل بہت پریشان ہوتا تو اپنے کمرے میں بند ہو جایا کرتا تھا۔ اب بھی اس نے اپنا رخ کمرے کی طرف کر لیا تھا.......... وہ

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنے کمرے میں جا رہا تھا۔ طرح طرح کی سوچیں ذہن میں سر اٹھا رہی تھیں۔ اس کی ماں نے ہی باپ کو گاؤں سے جدا کیا تھا.......... ماں نے ایسا کیوں کیا تھا.......... کیا ضرورت تھی انہیں ایسا کرنے کی.......... انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ وہ یہی سوچتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہو گیا..........

کمرے میں ہر چیز قرینے اور سلیقے سے سجی ہوئی تھی۔ اس کی غیر موجودگی میں کمرے کا ''دھیان'' رکھا گیا تھا۔ وہ بیڈ پہ دراز ہو گیا۔ لائٹ بند کی تو چھت پر ستارے جگمگانے لگے۔ اندھیرے میں چمکنے والے ستارے اس نے تھوڑا عرصہ پہلے ہی چھت پر لگوائے تھے۔ جب وہ ستارے خرید رہا تھا تو رومی بھی اس کے ساتھ تھی۔

اس نے کہا تھا۔ ''میرے لیے ستارے توڑ کر لا سکتے ہو؟'' تو نبیل نے چڑ کر کہا تھا۔ ''میں تمہارے لیے تارے توڑ کر نہیں لا سکتا اس لیے خرید رہا ہوں۔''

''تارے توڑنے اور خریدنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔''

''ہاں بالکل فرق ہوتا ہے۔ تارے توڑنا افسانہ اور خریدنا حقیقت ہے۔ جیسے کہ یہ..........'' وہ پلاسٹک کے بنے ہوئے تاروں کا پیکٹ اس کی آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

''پیار کرنے والے تارے توڑ کر بھی لا سکتے ہیں۔''

نبیل رومی کی بات پر قہقہہ مار کر ہنسا تھا۔ ''پیار.......... پیار.......... کیسے کہتی ہو تم.......... پیار کا مفہوم جانتی ہو تم..........؟''

''ہاں.......... فرینڈشپ..........'' رومی نے مختصر جواب دیا۔

''یہ پیار نہیں.......... دھوکا ہے یہ.......... جو ہم ایک دوسرے کو دے رہے ہیں.......... دھوکا..........''

''تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ سب لوگ ٹھیک کہتے ہیں تم دن بدن ذہنی مریض بنتے جا رہے ہو۔'' رومی چیختے ہوئے بولی۔

''شٹ اپ.......... ذہنی مریض ہو گی تم..........''

''کیا کہا تم نے.......... ذہنی مریض.......... اور میں..........''

''ہاں ہاں تم!''

''اس کا جواب میں تمہیں آنے والے وقت میں دوں گی..........''

''کیا کرو گی تم..........؟''

''تمہیں ایک دم ٹھیک کر دوں گی..........'' یہ کہتی ہوئی وہ بازار سے اکیلی ہی واپس لوٹ آئی تھی۔ خدا نے نبیل کی طبیعت میں بڑی حلیمی رکھی تھی۔ وہ دو چار دنوں میں سب کچھ بھول بھال کر پھر سے رومی کے ساتھ پہلے کی طرح بولنے چالنے لگا۔

نبیل نے چھت پہ لگے تاروں سے نظر ہٹائی اور ایک لمبی سانس کھینچ کر رہ گیا۔ آسمان پہ چمکتے ہوئے بے تحاشہ تاروں نے اسے گاؤں کی

یاد دلا دی تھی۔

گاؤں جہاں وہ اپنی سانس چھوڑ آیا تھا۔سینکڑوں میل دور بیٹھے بھی وہاں گذرے پل پل کی یادیں تیز بھالوں کی صورت چبھ رہی تھیں۔ وہ انہی یادوں کے بھنور میں ڈوبتا ہوا نیند کی آغوش میں چلا گیا۔رات کا نہ جانے کونسا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھلی۔ جنت بی بی کہہ رہی تھی اٹھ بیٹا! نماز کا ویلہ ہو گیا ہے..........'' اس نے آنکھیں جھپکا کر ادھر ادھر دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔جبکہ اس نے ابھی واضح طور پر جنت بی بی کی آواز سنی تھی۔ اس نے لائٹ جلا دی۔کمرے میں اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔گھڑی کی طرف نظر اٹھائی تو پانچ بج رہے تھے۔وہ دھیرے سے مسکرانے لگا۔فجر کا وقت ہو رہا تھا۔وہ اٹھ کر مسجد جانا چاہتا تھا۔مگر پھر اسے اپنی سوچ بدلنی پڑی۔مسجد وہاں سے تیس کلومیٹر کی دوری پر تھی۔زندگی میں پہلی دفعہ اسے مسجد سے دوری کا احساس ہوا۔اس نے کمرے میں ہی نماز پڑھ لی۔اور پھر پاکستان سے لائی ہوئی نماز کی کتاب لے کر بیٹھ گیا۔اور ورق الٹ کر دیکھنے لگا۔عربی اسے پڑھنی نہیں آتی تھی۔اس نے کتاب سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور باہر نکل آیا۔رات کو جگمگاتی عمارتیں اور روشنیاں اگلتے بازار صبح کو ویران دِکھ رہے تھے۔زندگی میں پہلی بار وہ انگلینڈ میں اتنی صبح اٹھا تھا۔سارا شہر جیسے سویا پڑا تھا اور وہ اکیلا جاگ رہا تھا۔وہ چہل قدمی کرتا ہوا باہر آ گیا۔پرل اسٹریٹ کی سڑک شیشے کی مانند چمک رہی تھی۔دونوں طرف بلند عمارتیں بھی جیسے اپنے ''مالکوں'' کی طرح سوئی پڑی تھیں وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا انتھونی اسٹریٹ کی طرف ہو لیا۔جہاں مسٹر ولیم کے بار میں بیٹھ کر وہ اکثر ڈرنک لیا کرتا تھا۔انتھونی اسٹریٹ وہاں سے تین چار میل کی دوری پر تھی۔وہ چلتا رہا یہاں تک کہ سورج کی کرنیں بلند عمارتوں کے بالائی حصوں کو چھونے لگیں۔آج ایک عرصے کے بعد اس شہر نے سورج کی شکل دیکھی تھی۔نبیل کو معلوم تھا۔آج سنڈے ہونے کی وجہ سے پارکوں اور پکنک پوائنٹس پر بے تحاشہ رش امڈ آئے گا۔مسٹر ولیم کے بار تک پہنچتے پہنچتے کافی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔کوڑا اٹھانے والے ٹرک بڑی نفاست سے کوڑا اٹھا رہے تھے۔میٹھی میٹھی دھوپ کی خوشبو نم فضا میں گھلنے لگی تھی۔نبیل مسٹر ولیم کے بار سے چند قدموں کی دوسری پر ہی تھا کہ بیس گز کے فاصلے پر ایک کار آ کر رکی اور اس میں سے ایک نقاب پوش نے نکل کر نبیل پر پستول تان لیا۔

☆..........☆..........☆

پروین دین محمد کو کھانا دے کر ابھی واپس نہیں مڑی تھی کہ ہر طرف گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں۔ دن میں رات کا سا سماں ہو گیا۔ پیپل اور پاپولر کے درخت تیز ہوا کی وجہ سے جھومنے لگے۔ پرندوں میں افراتفری مچ گئی۔ دین محمد روٹی چھوڑ کر بھینسوں اور بھیڑوں کو چھپر کی طرف ہانکنے لگا۔ پروین بھی باپ کی مدد کرنے لگی۔ ''پروین پُتر! تو جلد گھر چلی جا بدل کے تیور مجھے کچھ اچھے نہیں دکھتے۔ یہ نہ ہو کہ مینہ تجھے یہیں آ لے..........'' دین محمد دبے دبے جوش سے بولا۔

پروین بار بار چنزی کو سر پہ درست کرتی تھی مگر چنزی اس کے جسم پر پھسلی جا رہی تھی۔ تیز ہوا کی سرکشی نے اس کے مرمریں جسم کے خدوخال اور واضح کر دیئے تھے۔ اس کی سیاہ دراز زلفیں سفید دودھیا شانوں پر لہرا رہی تھیں۔ ''ابا تو جلد گھر لوٹ آنا یہ نہ ہو کہ مینہ ختم ہونے کے انتظار میں تو یہیں بیٹھا رہے..........'' پروین فکرمندی سے بولی۔

''پُتر! اتنا پریشان مت ہوا کر.......... میں یہاں کوئی جنگل میں تو نہیں بیٹھا ہوں..........''

''ابا! مجھے ایسے موسم میں گھر میں اکیلے ڈر لگتا ہے..........''

''تو اکیلی کب ہے۔ تیری ماں بھی تو تیرے ساتھ ہے..........''

''ماں کی بات اور ہے ابا.......... بس تو جلد گھر آ جانا نہیں تو مینہ میں بھیگتی ہوئی تجھے لینے آ جاؤں گی..........'' پروین زور دیتے ہوئے بولی۔

''اچھا بھولی دھیئے! آ جاؤں گا میں.......... اب جا جلدی گھر پہنچ جا تیری ماں تجھے اڈیک رہی ہوگی۔ خدا نے چاہا تو آج بڑا مینہ برسے گا۔ جل تھل ہو جائے گی۔ دھرتی کا سینہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ مُنجی کی فصل سیراب ہو جائے گی۔'' دین محمد جیسے فضاؤں میں جھومتے ہوئے بولا۔

پروین ابھی ڈیرے سے تھوڑی دور ہی آئی تھی کہ تابڑ توڑ بارش برسنے لگی۔ اس کے قدم بڑی تیزی سے گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔ گاؤں کے لڑکے بالڑے ٹڈی دل کی طرح جوق در جوق گاؤں کی گلیوں میں نکل آئے۔ وہ ایک جلوس کی مانند گاؤں کی گلیوں اور فصلوں کی پگڈنڈیوں پر دوڑے پھر رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں سائیکل کا پرانا ٹائر تھا جسے وہ ایک چھوٹی سی لکڑی کی مدد سے پیٹتا ہوا اپنے آگے آگے دوڑا رہا تھا۔ کسی کے پاس پرانی سائیکل کا رم تھا۔ جس کے ساتھ وہ لوہے کی پتلی سی تار لگا کر اسے بھگاتا پھر رہا تھا۔ سب بچوں نے لنگی کی طرح کے کچھے پہن رکھے تھے۔ جبکہ چند چھوٹے ''شہزادے'' کپڑوں کی مصیبت سے آزاد پھر کر جشن آزادی منا رہے تھے۔ چھتوں سے پرنالے یوں گر رہے تھے جیسے کوئی پہاڑی نالہ اپنے جوبن پر آیا ہو۔ بہت سے بچے ان پرنالوں کے نیچے نہا کر خود کو خوش قسمت تصور کر رہے تھے۔ کچھ چھوٹے بچے گلی میں اکٹھے ہونے والے پانی میں لوٹنیاں لے کر تیرنے کی مشق کر رہے تھے۔

پروین دینو کے گھر کے پاس پہنچنے تک بالکل بھیگ چکی تھی۔ پانی سر سے لے کر ایڑیوں تک اپنا وار کر چکا تھا۔ اس کا جسم دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ اس کا ایک پیر گارے میں دھنسا اور ساتھ ہی اس کی چپل ٹوٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ وہ بہت تھوڑ دلی تھی۔ ایک تیز بارش کا خوف دوسرے بھیگا اور ٹھٹھرتا ہوا جسم تیسرے چپل کا ٹوٹنا اور چوتھا اور سب سے بڑا دکھ نبیل کی یاد جس نے اسے رُلا دیا تھا۔ جب سے نبیل

یہاں سے گیا تھا۔ وہ بہانے بہانے سے رو پڑتی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوتا تھا۔ جب بھی کوئی پریشانی یا دکھ پروین کو گھیرتا تھا اس کا دھیان نبیل کی طرف چلا جاتا تھا۔ اس کی شبیہہ آنکھ کے سامنے لہراتی تھی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی تھی جیسے پوری دنیا اس کی دشمن ہو اور بس صرف نبیل ہی اس کا ہمدرد اور غم خوار ہو۔ اگر کہیں کانٹا بھی چبھ جاتا تو نبیل کی شکل اس کے پردہ بصارت پر رقص کرنے لگتی۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتی۔ زیرِلب نبیل نبیل پکارنے لگتی۔ نبیل سے دوری کا غم اس پر پہاڑ بن کر گرا تھا۔ یہ صدمہ اس کی اکیلی کمزور جان نے سہا تھا۔ کسی کو اپنا رازداں نہیں بنایا تھا۔ کسی کے آگے شکوہ شکایت نہیں کی تھی۔ یہ تشنگی یہ سلگن یہ انتظار کتنا لمبا تھا؟ وہ نہیں جانتی تھی۔ اس انتظار کی کوئی حد کوئی حاصل تھا بھی یا نہیں وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی۔ وہ تو ایک خاردار رستے پر چل نکلی تھی۔ جس کی کوئی منزل تھی یا.........شاید نہیں تھی۔

چپل پروین کے ہاتھ میں تھی۔ آنسو اسکے چکنے گالوں پر پھسلے جا رہے تھے اور وہ زیرِلب بڑبڑا رہی تھی۔ ''.........نبیل.........نبیل ....تم کدھر ہو.........پلیز.........واپس آ جاؤ.........پلیز.........'' اسے یوں لگ رہا تھا آسمان نہیں رو رہا وہ رو رہی ہے۔ بارش کے قطروں کو وہ اپنے دل پہ گرتے محسوس کر رہی تھی۔

''باجی بلا رہی ہے۔'' وہ ننگ دھڑنگ چھوٹا ''شہزادہ'' ججی تھا جو پروین کا ہاتھ پکڑے اپنے گھر کی طرف کھینچ رہا تھا۔ پروین نے جب ججی کی طرف دیکھا تو کھلکھلا کر ہنس دی آنسو بھری آنکھیں مسکراہٹ سے چمکنے لگیں۔ ''اوئے ججی کے بچے! تمہارے گھر کپڑے نہیں ہیں.........؟''

''ہیں.........بہت سے ہیں.........'' وہ ہاتھ نچا کر بولا۔ ''مگر تو کیوں پوچھ رہی ہے.........؟''

''تو ننگا کیوں پھر رہا ہے؟'' پروین منہ پہ ہاتھ رکھ کر شرارت سے بولی۔

چند لمحے تو ججی کھڑا سوچتا رہا کہ کیا جواب دے۔ جب کچھ بن نہ پڑی تو ہمم.........ہمم.........کی آواز نکالتا ہوا وہاں سے دوڑ گیا۔ برستی ہوئی آنکھیں کچھ اور مسکرانے لگیں۔

ججی کی بڑی بہن آسیہ دروازے میں کھڑی پروین کو اپنی طرف بلا رہی تھی۔ پروین ٹوٹی چپل تھامے اس کی طرف بڑھی۔ ''آ.........اندر لنگ آ.........'' آسیہ دروازہ کھولتے ہوئے بولی۔

''نہیں ماں گھر میں میرا رستہ دیکھتی ہوگی۔'' پروین تاسف سے بولی۔

''اتنا تیز مینہ پڑ رہا ہے۔ تو گھر تک کیسے پہنچے گی.........میں ججی کو کہہ دیتی ہوں وہ چاچی کو بتا آئے گا کہ پروین ہمارے گھر میں ہے۔ مینہ بند ہو جانے پر آ جائے گی.........''

پروین کچھ سوچتے ہوئے اندر داخل ہو گئی۔ آسیہ پروین کو لئے ہوئے پچھلے کمرے میں چلی گئی۔ ''تیرا بیڑا تر جائے.........تیرے سارے جسم سے سیک نکل رہا ہے۔ گلیوں میں بالڑوں کی طرح نہاتی کیوں پھر رہی تھی؟'' آسیہ پروین کی کمر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''نہاتی کہاں پھر رہی ہوں آسو!.........ابا کو کھیتوں میں روٹی دینے گئی تھی۔ واپسی پر ہی مینہ شروع ہو گیا.........یہ مینہ تو ہم لوگوں پر رب کی خاص رحمت ہے سنجی اس دفعہ خوب اچھی ہوگی۔''

''ہاں تُو ٹھیک کہتی ہے پینو رب ہم لوگوں پر مہربان ہے۔ جتنا مینہ پڑے گا اتنا ہی یہ ''ڈیسل'' بچے گا۔..........''

''پگلی ڈیسل نہیں..........ڈیزل..........'' پروین ٹوکتے ہوئے بولی۔

''ہاں..........ہاں..........وہی..........''

''میں اسی لیے تجھے کہتی ہوں کہ کچھ پڑھ لے..........علم بڑی اچھی چیز ہے۔ جانور کو بھی انسان بنا دیتا ہے۔''

''تو ہمیں جانور ہی رہنے دے۔ ہم ایسے ہی اچھے ہیں۔''

''تو گنوار کی گنوار ہی رہے گی..........'' پروین اس کی کمر پہ ہلکی سی چپت مارتے ہوئے بولی۔

''پینو تو ادھر ہی بیٹھ میں دوسرے کمرے سے تیرے لیے کپڑے لاتی ہوں۔ تبدیل کر لے..........''

''تو جھلی تو نہیں ہوگئی۔ میں کپڑے وپڑے نہیں بدلوں گی..........'' پروین آسیہ کا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولی۔

''تیرے تو فرشتے بھی بدلیں گے..........پَر کی بات تجھے یاد ہے نا جب اسی طرح بارش میں تجھے ٹھنڈ لگ گئی تھی پورا ایک ہفتہ تو منجی پہ پڑی رہی تھی۔''

''آسو..........آسو..........میری بات تو سن۔'' پروین آسیہ کو آوازیں دیتی ہی رہ گئی مگر وہ کمرے سے نکل گئی۔ واپس مڑی تو اس کے ہاتھوں میں ہلکے آتشی رنگ کے پھولدار کپڑے تھے۔

''چل جلدی سے اٹھ یہ کپڑے بدل لے۔ میں نے میسی روٹیاں بھی بنائی ہیں۔ ابھی مل کر کھاتے ہیں۔''

''میں کپڑے نہیں بدلوں گی..........''

''تیری تو ایسی کی تیسی۔'' آسیہ زبردستی پروین کی قمیض اتارنے لگی

''ہائے اللہ! میں مرگئی..........تو کتنی خبیث ہوگئی ہے۔ شرم نہیں آتی تجھے ایسا کرتے ہوئے۔''

''شرم کسی بات کی؟..........میں لڑکی ہوں..........لڑکا تو نہیں ہوں جو تجھے اتنی شرم آ رہی ہے۔''

''چل ہٹ پیچھے قمیض چھوڑ میری..........بدتمیز کہیں کی..........'' پروین دامن چھڑاتے ہوئے بولی۔

''ہائے کتنا گورا چٹا بدن ہے تیرا..........یوں لگتا ہے اصلی خالص مکھن سے بنا ہے یہ..........''

''مجھے لگتا ہے چاچے سے کہہ کے تیری شادی جلدی کروانی پڑے گی بڑی خراب ہوگئی ہے تو..........''

''کھراب تو میں بڑی دیر سے ہوں..........پر گھر والوں کو کھیال ہی نہیں آتا..........تقریباً ہر روج گوگا کھیتوں میں ابا سے ملتا ہے۔ اشارے کنائیوں سے ابا سے رشتے کی بات کرتا ہے۔ پر ابا آگے سے کچھ ہوں ہاں ہی نہیں کرتا۔''

''تجھے یہ سب باتیں کون بتاتا ہے؟'' پروین حیرت سے بولی۔

''بس مجھے کسی سے پتا چل ہی جاتی ہیں..........تو نہیں سمجھے گی..........تو جلدی سے اچھے بچوں کی طرح کپڑے بدل نہیں تو میں خود

بدلواؤں گی۔''

''نہ بابا نہ.........میں خود ہی بدل لیتی ہوں.........تو باہر چل۔''

''میں کیوں باہر جاؤں.........؟''آسیہ سینہ تان کر بولی۔

''تیری.........تو.........''پروین نے آسیہ کو دھکا دیا اور دروازے کا کواڑ چڑھا دیا.........جب اس نے آسیہ کے کپڑے پہنے تو وہ ڈھیلے ڈھالے تھے۔اس نے اچھی طرح سے بالوں کو خشک کیا۔کس کے ان کا جوڑا کیا سفید دودھیا اوڑھنی سر پہ لی اور دروازہ کھول دیا۔

''ہائے میں مرجاواں.........رب دی قسمیں اگر میرا کوئی بھرا ہوتا تو میں تجھے جرور اپنی بھرجائی بناتی.........اور.........اور اگر میں لڑکا ہوتی تو دو دن میں تجھے پھسا کر تجھ سے شادی کر لیتی۔''

''میں ایسے بے غیرت لڑکے کے کبھی منہ نہ لگتی۔''پروین ناک سکیڑ کے بولی۔

''آخر کسی نہ کسی کو تو اپنا دل دیتی ناں.........کوئی تو تیرے کھیالوں میں آتا ناں.........''

پروین کے دل پہ بڑی زور سے چوٹ پڑی۔دل تو وہ دے چکی تھی۔یہ تو ایسا حادثہ ہے جو آپوں آپ ہو جاتا ہے۔اس کا کوئی دوش نہیں تھا۔اس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔پھر اسے کس جرم کی سزا مل رہی تھی دل پہ آج تک کس کا اختیار ہوا ہے جو اس کو ہوتا۔وہ تو دل کے ہاتھوں گھائل ہوئی تھی۔بے اختیار اس کے گالوں پہ آنسو لڑھکنے لگے۔

''اے ہے.........تو شادی بیاہ.........پیار محبت کے نام پہ رونے کیوں لگتی ہے۔چاچی رشیداں کی حویلی میں بھی ساری لڑکیاں تیرا مذاق اڑاتی ہیں۔ہم ماں باپ کے گھروں میں رہتی ہیں یہ گھر ہمارے تھوڑی ہوتے ہیں۔یہ تو پرائے ہوتے ہیں ایک نہ ایک دن ان کو چھوڑنا ہوتا ہے۔''آسیہ غمگین ہوتے ہوئے بولی۔وہ پروین کے رونے کو ماں باپ کی جدائی پر موقوف کر بیٹھی تھی۔آسیہ کیا ہر کوئی پروین کا مسئلہ یہی سمجھتا تھا۔مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ پیار نے اس کے دل میں آگ لگائی تھی۔وہ دن رات کسی کی جدائی کے کرب میں جل رہی تھی۔خوف بھی تھا اور اسے بہت امید بھی تھی کہ وہ ضرور آئے گا۔امید شاید اس لیے بھی تھی کہ اس کے سینے میں سچی محبت کا چراغ جل رہا تھا۔مگر صرف محبت کا چراغ جلنے سے ناامیدی امید میں نہیں بدل سکتی۔ناممکن کے پتھر سے ممکنات کے چشمے نہیں پھوٹ سکتے۔

☆.........☆.........☆

نبیل نے پستول بردار کے سامنے ہاتھ کھڑے کر دیئے تھے۔ ''کیا چاہتے ہو تم.........؟'' نبیل نارمل لہجے میں بولا۔

''جلدی سے نقدی نکال کر اس رومال پر رکھ دو.........'' پستول بردار دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

نبیل نے بیک پاکٹ سے پرس نکال کر ساری نقدی رومال پر ڈھیر کر دی۔

''.........اور.........کچھ؟ پستول بردار دھاڑا۔

''اور کچھ بھی نہیں ہے.........''

پستول بردار نے نبیل کو زور دار دھکا دیا اور گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی نامعلوم مقام کی طرف روپوش ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک پولیس وین نبیل کے پاس آ کر رکی۔ ''اینی پرابلم.........سر۔'' ایک پولیس مین نبیل کے پاس پہنچتے ہوئے بولا۔

''نو.........اٹس آل رائیٹ.........'' نبیل عام سے لہجے میں بولا۔

''او کے.........سر.........'' پولیس مین نے کہا اور گاڑی وہاں سے رخصت ہو گئی۔

نبیل کا دل بھر آیا تھا۔ اس کی نگاہوں میں چاچا حیات، شرفو نائی، دینو موچی، بشیر کمہار، مولوی خیر دین جیسے پیارے لوگوں کی شکلیں گھومنے لگیں۔ کتنی مٹھاس، کتنا پیار، کتنی نرمی تھی ان لوگوں کی شخصیت میں۔ انسانیت کی کتنی قیمت تھی ان لوگوں کی نظر میں۔ وہ سب کچھ فطرت کے کتنا قریب تھا۔ جبکہ یہاں مادیت کے بھگوان کو پوجا جاتا تھا۔ امارت اور اسٹیٹس کے بت کی پرستش کی جاتی تھی۔ نبیل کی اس ماحول سے بیزاری کچھ اور بڑھ گئی۔

☆.........☆.........☆

''نبیل! صبح ہی صبح کدھر نکل گیا ہے۔ اس لڑکے کی تو مجھے بالکل سمجھ نہیں آئی۔'' انوری بیگم ماتھے پہ تیوری ڈالتے ہوئے بولی۔

''مام! نبیل بھائی کی جلد سے جلد شادی کر دیں۔ پھر آپ کی ساری پریشانی ختم ہو جائے گی۔ رومی خود ہی اسے سیدھے رستے پہ لے آئے گی۔'' عینی چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولی۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔ شکیل کا سمیسٹر ختم ہو جائے تو سوچتی ہوں اس فرض سے سبکدوش ہو ہی جاؤں۔''

''شکیل بھائی کا سمیسٹر تو اگلے ماہ کے لاسٹ میں ہی ختم ہو رہا ہے۔'' عینی تقریباً چیختے ہوئے بولی۔

''ہاں تمہیں تو اپنے کالج سے ہی فرصت نہیں ہے۔ میں نے اندر ہی اندر بہت سی تیاری مکمل کر لی ہے۔ اب ایک دو دن کالج سے چھٹی لو تو جو بقیہ ضروری چیزیں رہ گئیں ہیں وہ بھی خرید لیں۔''

''زبردست ماما! مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب کچھ اتنی جلد ہونے والا ہے۔ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی۔'' عینی ماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

''میری بچی جب سے نبیل سنگا پور سے ایم۔ سی۔ ایس کر کے لوٹا ہے میں شادی کی تیاریوں میں بیٹھی ہوں۔ اب تو میرے خیال سے اس

کی جاب بھی پکی ہو جائے گی۔ ایک ہفتے سے ایک سافٹ ویئر کمپنی کا کالنگ لیٹر آیا پڑا ہے مگر شہزادے کے پیر گھر میں ٹکیں تو پھر ہے نا.........اب اتنے دنوں بعد پاکستان سے واپس آیا ہے۔ رات کو بھی جلد سو گیا ہے اور اب صبح ہی صبح پتہ نہیں کدھر غائب ہو گیا ہے۔''

''ہیلو مام! میں یہاں ہوں.........'' نبیل اندر داخل ہوتے ہوئے بولا۔

انوری بیگم نے منہ پھلا کر دوسری طرف پھیر لیا۔ ''او.........مام.........مام.........'' نبیل یہ کہتے ہوئے انوری بیگم سے لپٹ گیا۔

''چھوڑ مجھے۔''

''نہیں چھوڑوں گا.........جب تک آپ مسکرا کر نہ دیکھیں گی۔''

انوری بیگم کچھ دیر خاموش رہی۔ ہنسی کو روکنے کی کوشش کرتی رہی مگر پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

''تھینکس! مام.........'' نبیل نعرہ بلند کرتے ہوئے بولا۔

اسے ہمیشہ سے پتہ تھا جب ماں ہنس پڑتی تھی تو اس کا مطلب ہوتا تھا کہ اس کی خفگی ختم ہو گئی ہے۔

''مائی سویٹ مام.........!'' نبیل ماں کی گال پہ بوسہ دیتے ہوئے بولا۔

''اچھا زیادہ مسکا نہ لگاؤ.........میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں چینج کر کے میرے کمرے میں آؤ۔''

''او کے.........! مام۔'' نبیل سیلوٹ کرتے ہوئے بولا۔

نبیل جب ماں کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں لیے بیٹھیں تھیں۔ نبیل ماں کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ''یس مام! اب بتائیں۔''

''بیٹا! یہ کسی کمپنی کا کالنگ لیٹر تمہیں آیا ہوا ہے۔ اسے پڑھ لو.........مجھے امید ہے کہ یہ لوگ کسی طور پر تمہیں مس کرنا نہیں چاہیں گے۔ آخر نیشنل یونیورسٹی آف سنگاپور سے تم ایم۔ بی۔ ایس کر چکے ہو۔''

''اور اب آپ یہ کہیں گی کہ دنیا کی بڑی دس یونیورسٹیوں میں سے یہ ایک ہے۔''

''یو آر.........آل رائیٹ.........مائی سن۔''

''میں آج ہی وہاں جاؤں گا۔'' نبیل ماں کے کندھوں کو تھامتے ہوئے بولا۔

انوری بیگم کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ آواز بھرا گئی۔ ''میرے بیٹے! مجھے اسی دن کا انتظار تھا۔''

''مام! میں نے ہمیشہ آپکی آنکھوں میں اس خواب کو پنپتے دیکھا ہے۔ آپ کو اسکا کریز تھا کہ کسی طرح ہم لوگ خود اپنے پیروں پہ کھڑے ہوں۔ لو آج یہ وقت آ گیا ہے! مام.........اب آپ کو اس بات کا قلق' اس بات کی ندامت نہیں ہو گی کہ یہ لوگ ماموں کے زیر کفالت ہیں۔''

''بس.........بس میرے بیٹے.........'' ماں نبیل کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولی۔

''مام! ماموں کے ہم ہمیشہ قرض دار رہیں گے۔ انہوں نے جتنا کچھ ہمارے لیے کیا کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ ہم کل کو چاہے کتنی ہی بلندی پر

چلیں جائیں مگر ماموں کی عزت ان کا احترام اسی طرح کرتے رہیں گے۔ جس طرح کہ آج کر رہے ہیں۔''

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور اگلے ہی لمحے سومی، رومی اور ان کی والدہ اندر داخل ہوئیں۔ نبیل کی نظر سیدھا رومی پر پڑی۔ اس نے بلیو جینز اور اوپر بلیک ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس پر دو پہلوان آمنے سامنے کھڑے پنجہ آزمائی کر رہے تھے۔ رومی بڑے عجیب انداز میں نبیل کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''ہیلو! رومی۔''

''ہیلو..........!'' رومی نے نبیل سے ہاتھ ملایا۔ پھر سومی نے بھی اس کی تقلید کی۔

''کیسے ہو نبیل بیٹا.......... ہم لوگ تو تمہاری صورت کو ہی ترس گئے تھے..........'' رومی کی ماں نبیل کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''بس مامی! کافی دن ہی لگ گئے۔'' نبیل اپنے فقرے پر غور کرنے لگا.......... ''کافی دن۔''

''سنا ہے بیٹا! تم گاؤں کی سیر کرنے بھی گئے تھے۔''

''جی ہاں! مامی..........''

''ہائے.......... کاش میں بھی تمہارے ساتھ چلی جاتی۔ مجھے گاؤں دیکھنے کا بے حد شوق ہے۔ وہاں کا ماحول وہاں کے لوگ.......... وٹ امیزنگ..........؟''

''پھر کبھی گیا تو آپ کو ضرور لے کر جاؤں گا۔''

''بیٹا! وہاں کی کوئی سوغات بھی لے کر آئے ہو یا نہیں؟''

''ہاں مامی! وہاں کی مٹھائی لے کر آیا ہوں۔'' وہ چاولوں کی پنیوں کو مٹھائی کہہ رہا تھا۔

''نبیل بھائی! ہم سب لوگوں نے پکنک کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ آپ جائیں گے نا ہمارے ساتھ..........'' سومی شوخی سے بولی۔

''نہیں مجھے کچھ کام ہے۔''

''کیا کام ہے آپ کو..........؟''

''مجھے ایک کمپنی کے آفس جانا ہے۔''

''آج سنڈے ہے۔'' سومی منہ سکیڑتے ہوئے بولی۔

''اوہ! میں تو بھول ہی گیا تھا۔'' نبیل ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

''لوگوں کو بھولنے والی باتیں بھول جائیں تو کون سی بڑی بات ہے۔'' رومی تیز نظروں سے نبیل کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''بھولنے والے ہی اکثر زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔ مس..........''

''مس! رومی'' سومی گردن اکڑاتے ہوئے شوخی سے بولی۔

''تھینک یو.........! سومی۔'' نبیل نے کہا۔

اتنے میں چھوٹا نومی دوڑتا ہوا آیا اور نبیل سے لپٹ گیا۔ ''اوئے چھوٹے شہزادے تو کدھر تھا.........؟''

''انکل شیفرڈ کے گھر تھا۔''

''وہاں کیا کر رہے تھے؟''

''میری سے کھیل رہا تھا۔''

''اس سے تمہاری دوستی کچھ زیادہ ہی نہیں ہوگئی ہر وقت وہاں ہی گھسے رہتے ہو۔''

''میری گرل فرینڈ ہے نومی۔'' سومی نومی کو چھیڑتے ہوئے بولی۔

یکدم نبیل کا دھیان اپنی گرل فرینڈ میری کی طرف چلا گیا۔ میری جوزف' لنڈا سمتھ' الزبتھ کاٹر' سارجنٹ کرول' اس کی کتنی ہی گرل فرینڈز تھیں جن کے ساتھ وہ داد عیش کر چکا تھا۔ کتنے دن کتنی راتیں ان کے ساتھ گزار چکا تھا۔ انسان اپنے زعم میں یہ سمجھتا ہے کہ وہ زندگی کو بھرپور انجوائے کر رہا ہے مگر اصل میں وہ زندگی سی خوبصورت چیز کو برباد کر رہا ہوتا ہے۔ وہ زندگی نہیں گزار رہا ہوتا زندگی اسے گزار رہی ہوتی ہے۔ آخر کار ایک دن اسے اپنے کیے پر پشیمانی ہوتی ہے۔ نبیل کو اپنے ماضی سے گھن آ رہی تھی۔ وہ زندگی سو رنگینیوں کے باوجود کس قدر بے رنگ اور پھیکی تھی۔ اس زندگی میں کتنی گھٹن تھی۔ اسکی پھوپھی جنت بی بی نے اسے ایک رستہ بتایا تھا۔ حق کا رستہ' نیچر کا رستہ' زندگی کا رستہ.........وہ اب اس رستے پر چلنا چاہتا تھا۔

''بیٹا! نماز ایک دو دن پڑھنے والی چیز نہیں یہ تو آخری سانس تک کا ساتھ ہے۔''

''ہاں پھوپھی! آپ نے ٹھیک کہا ہے۔'' نبیل زیر لب بڑبڑایا۔ اسے یاد آنے لگا نماز پڑھ لینے کے بعد اسے کس قدر سکون نصیب ہوتا تھا۔ اس کے سینے میں ایک ٹھنڈک سی اتر جاتی تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا آج سب لوگوں کے ساتھ پکنک پر جانے کی بجائے وہ اسلامک سنٹر جائے گا۔ اسلامک سنٹر وہاں سے انیس کلومیٹر کی دوری پر تھا۔

''نبیل بھائی! آپ پھر ہمارے ساتھ پکنک پر جا رہے ہیں ناں۔'' سومی نبیل کا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولی۔

''سوری سومی! مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔''

''وہ کام بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔'' سومی ضد کرتے ہوئے بولی۔

''چھوڑ و سومی! جسے چلنا ہوگا خود ہی چل پڑے گا۔'' رومی سنجیدگی سے بولی۔

''اچھا بھئی سومی! اگر ضروری کام سے میں جلد فارغ ہو گیا تو ضرور تم لوگوں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔''

''ہم لوگ جارج پارک جا رہے ہیں۔ آیئے گا ضرور۔'' سومی نبیل سے وعدہ لیتے ہوئے بولی۔

''اچھا بابا! پہنچ جاؤں گا۔'' نبیل وہاں سے رخصت ہوتے ہوئے بولا۔

گاڑی میں بیس منٹ میں نبیل اسلامک سنٹر پہنچ گیا۔ وہ بارہا سینکڑوں دفعہ یہاں سے گزرا تھا مگر کبھی اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔

جب نبیل اندر داخل ہو رہا تھا تو دل میں انجانا سا خوف تھا۔ اندر جاتے ہی مسحور کن خوشبو نے نبیل کا استقبال کیا۔ بلند دیواروں کو مہنگے پینٹ سے مزین کیا گیا تھا۔ ایک قطار میں بڑی خوبصورتی سے بینچ اور ڈیسک رکھے ہوئے تھے۔ بلند دیواروں کے اوپری حصے میں قرآنی آیات کے خوبصورت چارٹس لگے ہوئے تھے۔ فرش پر نیالے رنگ کا قیمتی پتھر لگا ہوا تھا۔ وہ بے آواز چلتا ہوا بڑے ڈیسک کی طرف بڑھنے لگا۔ وہاں ایک باریش بزرگ کھڑے تھے جن کی داڑھی سفید براق تھی۔ چہرے پر کوئی نور تھا جو چمکتا تھا۔ وہ انگریز تھے۔ ان کے سامنے ہی بینچوں پر دو انگریز عورتیں جن کی عمریں پینتیس چالیس رہی ہوں گی بیٹھی تھیں۔ ان سے اگلی رو میں دو لڑکیاں اور ایک لڑکا بیٹھے تھے۔ ان کی عمریں بمشکل دس سے بارہ سال ہوں گی۔ باریش بزرگ انہیں کچھ پڑھا رہے تھے اور وہ پڑھ رہے تھے۔ نبیل نے جھجکتے ہوئے سلام کیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دینے کے بعد نبیل کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور نبیل ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔

باریش بزرگ تھوڑی دیر بعد پڑھانے سے فارغ ہو گئے۔ کلاس ختم ہو گئی۔ پڑھنے والے اٹھ کر چل دیے۔ نبیل وہیں بیٹھا رہ گیا۔ ''آؤ بیٹا! کیسے آنا ہوا..........؟'' بزرگ نے خوشدلی سے مسکراتے ہوئے بولے۔

''میں..........میں نماز سیکھنے آیا ہوں۔'' نبیل نے شرمندگی سے نظریں فرش پر گاڑتے ہوئے کہا۔

''مسلمان..........ہو..........؟''

''ج..........جی ہاں!''

''سبحان اللہ..........!'' بزرگ کے چہرے کی چمک کچھ اور بڑھ گئی۔

نبیل نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ اس کا خیال تھا بزرگ غصیلے انداز سے اس سے پیش آئیں گے۔ اس پر نصیحتوں کی بارش کر دیں گے اور کہیں گے کہ مسلمان ہوتے ہوئے تمہیں ابھی تک نماز نہیں آتی مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔

''بیٹا! خدا کی یہ بڑی رحمت ہے کہ انسانیت اپنے رب کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اپنے اصل کی طرف لوٹ رہی ہے۔ مجھے تم ایشین دِکھتے ہو۔ شاید تمہارا تعلق ہندوستان سے ہے۔''

''جی میں پاکستانی ہوں..........یعنی میرے والدین دونوں پاکستانی ہیں۔ میں پانچ سال کا تھا جب یہاں آیا تھا۔''

''او..........اچھا..........میں سمجھا..........دیکھو بیٹا! اس ظلمت کے دور میں اس اندھیر نگری میں جسے سچائی کی دولت مل گئی اسے سب کچھ مل گیا۔ تم..........اور تمہارے جیسے بے شمار نوجوان جب در بدر کی ٹھوکریں کھا کر حق کی طرف لوٹتے ہیں تو گاڈ بہت خوش ہوتا ہے۔ توبہ کرنے والے کو بالکل معاف کر دیتا ہے۔ اب مجھے دیکھو میں آسٹریلین ہوں۔ بیس سال پہلے ''فلیمنگ'' تھا آج ''محمد علی'' ہوں۔ میں نے ساری دنیا دیکھی ہے۔ ہر طرح کی برائی کا مزا چکھا ہے۔ ہر شوق کو پورا کر کے تسکین حاصل کی ہے مگر آخر کار ایک دن سمجھ آئی تسکین تو کسی اور چیز میں ہے۔ اصلی اور حقیقی تسکین..........وہ تو خالق کی یاد میں ہے۔ اسے دل میں بسانے میں۔ اس کا ہو جانے میں ہے۔ اس پیدا کرنے والے کی قسم میں نے دنیا کا ہر نشہ ہر عیب کیا ہے۔ ہر چیز کو کشید کر کے اس میں سے خوشیاں ڈھونڈ نکالی ہیں مگر وہ خوشی مجھے کبھی بھی نصیب نہ ہوئی جو پائیدار ہو جو ہمیشہ رہنے والی

ہو۔ وہ خوشی تو صرف پیدا کرنے والے کے پاس ہی ہے نا.........اب میں لوگوں کو دنیا کی خوشیوں کے لیے روتا دیکھتا ہوں تو مجھے ہنسی آتی ہے کہ وہ کیسی چیز کے لیے تڑپ رہیں ہیں جوان کے پاس رہنے والی نہیں ہے۔''

بزرگ کی سچی اور کھری باتیں قطرہ قطرہ نبیل کے وجود میں جذب ہوتی جارہی تھیں۔ اس کے ذہن کی گرہیں کھلتی جارہی تھیں۔ اس کے اندر دھیرے دھیرے سچائی کی روشنی اترتی جارہی تھی۔ جس پُرگھٹن کیفیت نے نبیل کو چند سالوں سے بیزار کر رکھا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اعتدال پر آنے لگی تھی۔ بزرگ کی باتیں سن کر نبیل کو گاؤں کے ان تمام پیارے لوگوں کی یاد بے طرح ستانے لگی جن سے وہ ملا تھا جن کے پاس بیٹھا تھا۔ جن کی پیاری باتیں پیاری صورتیں وہ بھولا نہیں تھا۔ وہ ان سب پیارے لوگوں سے وعدہ کر کے آیا تھا۔ دوبارہ گاؤں آئے گا۔ اسے دوبارہ گاؤں جانا تھا مگر کس کے لیے جانا تھا۔ شاید پھوپھا کے لیے پھوپھی کے لیے شاید چاچا حیات کے لیے اوران سب لوگوں کے لیے جواس کا چہرہ چومتے تھکتے نہیں تھے یا شاید.........پروین کے لیے۔

تو کیا؟ اسے پروین کے لیے گاؤں جانا تھا شاید نہیں! اس کی شادی تو رومی کے ساتھ ہونے والی تھی۔ پھر پروین کیا تھی؟ پروین کا تصور کیا تھا؟ اسے پروین کے لیے ہی تو صرف گاؤں نہیں جانا تھا۔ گاؤں کی سوندھی مٹی کی خوشبو اس کو اپنی طرف بلاتی تھی۔ اپلوں کی باس اسے اپنی طرف بلاتی تھی اور فصلوں کی ہریالی اسے اپنی طرف بلاتی تھی جس میں چاول کے دانے جھولتے تھے۔ کھالوں کے وہ کنارے اسے اپنی طرف بلاتے تھے جن کے پہلو سے رُکھوں کے پرلی طرف سے آتی ہوئی ہوا سیٹیاں بجاتی گزر جاتی تھی۔

''میں.........میں ضرور آؤں گا.........میرا انتظار کرنے والے میں.........آؤں گا۔'' آواز جیسے نبیل کے اندر گونجی۔

''بیٹے! کچھ پریشان نظر آتے ہو۔'' بزرگ شفقت سے نبیل کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''نن.........نہیں.........بزرگوار۔ میں کچھ سوچ رہا تھا۔''

''ہاں بیٹا! سوچ اچھی ہو تو اس پر عمل کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔''

''میں پھر نماز سیکھنے کے لیے کب حاضر ہو جاؤں؟''

''کل سے شام چھ بجے آجایا کرنا۔''

''اچھا میں چلتا ہوں۔'' نبیل دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے۔''

نبیل اسلامک سنٹر سے نکل کر ابھی چند قدم ہی چلا ہوگا کہ اس کی آنکھیں کہیں دیکھتے ہوئے جم گئیں۔ آنکھوں کے پپوٹے جلنے لگے۔ ان میں نمی تیرنے لگی۔ مٹھیاں زور سے بھنچ گئیں۔ وہ رومی تھی جو ایک منی جیپ میں سوار تھی اس کے علاوہ جیپ میں دو لڑکے اور ایک لڑکی اور تھی۔ ایک لڑکے کو نبیل اچھی طرح سے جانتا تھا۔ وہ سمتھ تھا جسے وہ اپنے ساتھ ایک دفعہ گھر بھی لے کر آئی تھی اور جس کے بارے میں اس نے کہا کہ وہ میرا بہترین دوست ہے۔ اس وقت رومی پیچھے سے اس کے گلے میں باز وحمائل کر کے اسے بوسہ دے رہی تھی۔ کتنی شرمناک حرکت تھی یہ کتنا اذیت ناک

منظر تھا یہ نبیل کے لیے.......... دو دفعہ پہلے بھی نبیل روی کو اس کے دوستوں کے ساتھ دیکھ چکا تھا مگر اس وقت اور بات تھی اور روی ایسی قابل اعتراض حالت میں نہیں تھی مگر پتہ نہیں کیوں نبیل یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد خاکستر ہو گیا تھا۔ وہ جس لڑکی کو کسی لڑکے کے ساتھ اس حالت میں دیکھ رہا تھا وہ لڑکی کوئی اور نہیں تھی اس کی ہونے والی بیوی تھی۔ چند ہفتوں یا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں میں ہونے والی بیوی۔

☆..........☆..........☆

ساری لڑکیاں ملکانی کے ڈیرے پہ بیٹھی گپیں ہانک رہی تھیں مگر پر دین وہاں سے اٹھ آئی تھی۔ وہ کئی چھوٹی چھوٹی گلیاں ناپتی رستے میں دانا چگنے والی مرغیوں کو بکائن کی لمبی سی لچکدار چھڑی سے ڈراتی دائرے کی طرف چلی جا رہی تھی۔ یہ گاؤں کا جنوب کی طرف جانے والا رستہ تھا۔ گاؤں کی طرف آنے جانے کے دو ہی رستے تھے۔ ایک جنوب کی طرف ایک مغرب کی طرف۔ مشرق اور شمال کی طرف گندے نالے کی روہی تھی۔ ادھر کوئی کم ہی جاتا تھا۔ روہی کے پرلی طرف کیکروں کے رُکھ تھے اور کہنے والے کہتے تھے ان سے آگے ڈبو مٹی تھی جو وہاں گیا واپس نہیں آیا۔

پر دین جنوب کی طرف چلی جا رہی تھی۔ دائرے کی طرف جہاں بڑوں کی محفل رات کے وقت بجتی تھی۔ بچے بچیاں مل کر کھیلتے تھے اور اودھم مچاتے تھے۔ اس وقت دائرے میں چاچا حیات اور بشیر کمہار کے علاوہ کوئی نہیں بیٹھا تھا۔ چاچا حیات حقہ گڑگڑا رہا تھا اور بشیر کمہار چاچا حیات کے سامنے بیٹھا زمین پر لکیریں کھینچ کر کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس سے تھوڑا سا ہٹ کر بشیر کمہار کا چھپر تھا جسے کے اندر آوی لگی ہوئی تھی اور جس کا دھواں چمنی سے باہر نکلتا تھا۔ اور اس سے آگے بیریوں کے جھنڈ تھے اور اس کے پار منجی کی فصل لہلہاتی تھی۔ پکھیرو آسمان پہ عجیب بولیاں بولتے تھے اور اس سے آگے ٹاہلی کے بوٹے فصلوں کے پہرے داروں کی طرح کھڑے تھے اور بوٹوں سے پار بھٹے کا دھواں فضا کو کالک ملتا تھا اس کالک میں بھی عجب حسن تھا اور وہ کالک نیلے امبر کو داغ دار کرتے ہوئے بھی خوبصورت لگتی تھی۔ پر دین منجی کے کھیت کی پگڈنڈی پہ چلی جاتی تھی۔ وہ اس وقت منجی ہی دکھتی تھی جو ہوا کے دھیمے سے جھولے سے لچکتی ہے لہلاتی ہے اور اس کی چال میں دھیما پن تھا اور اس کی سانسیں بڑی بوجھل تھیں اور وہ بڑی تھکی ہوئی تھی۔

نبیل کی یاد نے اسے تھکا دیا تھا۔ اس کے روئیں روئیں میں اداسی اور انتظار بھر دیا تھا۔ اس نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ پھر وہ کس کا انتظار کرتی تھی کیسا انتظار کرتی تھی؟ شاید کسی انہونی کا.......... شاید کسی چمتکار کا..........؟ مگر کچھ تھا جو اس کی سانسوں میں گھلتا تھا۔ اس کے جثے کو تروڑ مروڑ دیتا تھا۔ اس کا پنڈا لوہ دینے لگتا تھا۔ اس کے بیچ سینے میں میٹھا زہر گھلنے لگا تھا۔ اس کی رگ جاں کو کاٹنے لگتا تھا۔

''اے پر دین! تو کدھر کو جا رہی ہے۔'' وہ گوگا تھا جو منجی سے یکدم برآمد ہوا تھا۔

''میں جدھر مرضی جاؤں تو تو اس طرف جا رہا ہو گا۔ آسو.......... کی طرف۔''

''تجھے کیسے پتہ چلا؟'' گوگا حیرت سے بولا۔

''میں سب جانتی ہوں۔'' پر دین کولہے پہ ہاتھ دھرتے ہوئے بولی۔

''پینو بھین.........! تیرے دیرے کی سن گئی۔ آسو کا ابا مان گیا ہے۔ رشتے کے لیے......... یہ لے پکڑ تو بھی لڈو کھا۔'' وہ ایک لڈو پروین کی ہتھیلی پہ رکھتے ہوئے گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔

پروین ہکا بکا کھڑی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر پروین کے پیر تیز تیز آم کے رُکھوں کی طرف اٹھنے لگے۔ پروین بچپن سے انہیں دیکھتی آئی تھی۔ تب جب گھگھو گھوڑے سے کھیلتے ہوئے اس سے کوئی گھگھو گھوڑا چھین کے لے جاتا تھا۔ وہ کسی کو نہیں بتاتی تھی۔ روتے ہوئے آموں کے رُکھ کی طرف چل پڑتی تھی۔ پہروں وہاں خاموش بیٹھی رہتی تھی۔ کوئی آنسو نہیں بہاتی تھی۔ کسی کو الزام نہیں دیتی تھی۔ یہ عادت اس کی بچپن سے چلی آ رہی تھی۔ اب بھی کسی نے اس کا کچھ چرا لیا تھا۔ شاید......... دل اُس نے کسی کو دوشی نہیں ٹھہرایا تھا۔ خود ہی خود میں گھلتی تھی' پیتی تھی صبر کے گھونٹ' انتظار کے گھونٹ۔ چار پانچ فرلانگ چلنے کے بعد منجی کی جگہ جوار اور باجرے کے کھیت شروع ہو گئے تھے۔ ایک پگڈنڈی پہ بنے ٹیوب ویل کے حوض میں چند بچے نہاتے تھے۔ ایک دوسرے سے اٹھکیلیاں کرتے تھے۔ دھوپ کی تمازت میں پانی جھاگ اڑاتا تھا۔ پانی کے قطرے سچے موتیوں کی مانند دکھتے تھے۔ اس کے پیچھے جوار اور باجرے کی فصلیں لہراتی تھیں۔ ان فصلوں کے بیچ میں سے ایک پگڈنڈی آم کے جڑواں رکھ کی طرف جاتی تھی۔ وہی جڑواں رکھ جن کے نیچے جا کر وہ بیٹھا کرتی تھی۔

''باجی پروین......... باجی پروین! یہ میری ''گدڑ گڈی'' نہیں دے رہا تھا۔'' ایک چھوٹا بچہ پروین کی قمیض کھینچ کر اسے اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ پروین نے مڑ کر دیکھا تو وہاں اس بچے سے تھوڑا سا بڑا بچہ اس کی گدڑ گڈی لے کر کھڑا تھا۔ وہ لکڑی کے ٹائروں اور پکی مٹی سے بنی ہوئی ایک چھوٹی سے ریڑھی تھی۔ جس کے آگے مان کا دھاگا لگا ہوا تھا اور جسے بچہ گدڑ گڈی کہہ رہا تھا۔

''اوئے مانے! تو اس کی گڈی کیوں نہیں دے رہا؟'' پروین مسکراتے ہوئے بولی۔

''باجی! یہ میری ہے۔ ججی جھوٹ بول رہا تھا۔'' مانا سینہ تان کے بولا۔

''کیوں اوئے ججی! مانا ٹھیک کہہ رہا ہے؟'' پروین چھوٹے ججی کو گھورتے ہوئے بولی۔

''یہ جھوٹ بولتا ہے۔ یہ گڈی میری ہے۔'' ججی بدستور اپنے موقف پر قائم تھا۔

''تم دونوں میں سے سچا کون ہے اور جھوٹا کون؟ اس کا فیصلہ ابھی ہو جائے گا۔'' پروین دونوں کے کان پکڑتے ہوئے بولی۔

''رب دی قسمیں باجی! یہ گڈی میری ہے۔ چاہے باجی آسو سے جا کر پوچھ لیں وہ خود ہی بتا دے گی کہ یہ گڈی ججی کی نہیں۔''

''ججی! تو نے جھوٹ بولنا کب سے شروع کر دیا ہے؟'' پروین ججی کا کان مروڑتے ہوئے بولی۔

ججی خاموش رہا۔ ''باجی! ججی کی ایک اور بات آپ کو بتاؤں؟'' مانا اپنا کان سہلاتے ہوئے بولا۔

''بول۔''

''باجی! ججی کہتا ہے کہ میں بڑا ہو کر پینو باجی سے شادی کروں گا۔'' مانے کی بات سن کر پروین کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

''اوئے ججی تیری تو.........'' پروین اپنا جملہ پورا بھی نہ کرنے پائی تھی کہ چھوٹا ججی چوکڑیاں بھرتا ہوا گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔ ہنستے

ہنستے پروین کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ وہ ہنستے ہنستے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ پھر آنکھوں کے اس پانی میں دکھ کا پانی شامل ہونے لگا۔ انتظار اور آس کا پانی شامل ہونے لگا۔ ''نبیل..........! نبیل..........! تم کدھر ہو.......... پلیز.......... واپس آ جاؤ۔'' پروین کے پیر تیز تیز اس پگڈنڈی کی طرف اٹھنے لگے جو جڑواں آموں کے رکھ کی طرف جاتی تھی۔

اس کے دونوں طرف جوار اور باجرے کی فصلیں ہلکورے لے رہی تھی اور وہ اپنی جائے پناہ کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ پگڈنڈی ختم ہوتے ہی آگے ایک خالی کھیت تھا جس کے اطراف میں آموں کے رکھ لگے ہوئے تھے۔ انہی میں سے وہ جڑواں رکھ بھی تھی۔ وہ ٹیک لگا کر اس رکھ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ہلکی ہلکی پروائی پتوں میں سیٹیاں بجاتی تھی۔ دور ایک ٹیوب ویل کی ''کو..........کو..........'' سنائی دیتی تھی۔ چمکیلی دھوپ رکھوں سے پرے ہر طرف پھیلی نظر آتی تھی۔ ملکانی کے گھر لڑکیوں نے شادی بیاہ کی بات چھیڑ دی تھی اور وہ وہاں سے اٹھ آئی تھی۔ ہر لڑکی کا آئیڈیل شاید گاؤں میں ہی موجود تھا مگر اس کا آئیڈیل پتہ نہیں کہاں تھا؟ سات سمندر پار کیا کر رہا تھا؟ وہ اسے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ بات نہیں کر سکتی تھی۔ آنسو بہاتی آنکھیں اسے نہیں دکھا سکتی تھی۔ اسے یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ اس سے بے انتہا پیار کرتی ہے۔ تو کیا وہ ایک سراب کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ اس کی قسمت تو شاید انہی کچے مٹی کے مکانوں اور دھول اڑاتی گلیوں میں لکھی جا چکی تھی۔ اسے دودھ بلونا تھا۔ کھیتوں میں کھانا پہنچانا تھا۔ گھر کو لیپ دینا تھا۔ وہ ان کاموں سے نہیں گھبراتی تھی بلکہ وہ تو یہ سب کرنا چاہتی تھی۔ وہ یہ سب چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ انہی فضاؤں انہی خوشبودار ہواؤں میں اپنی زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ پھر کیوں اس کا من نبیل کے لیے ترس رہا تھا۔ وہ اس جذبے اس تعلق کو آج تک کوئی نام نہیں دے سکی تھی۔

وہ آموں کے رکھ کے نیچے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہیں تھا۔ بس ایک تڑپ ایک چبھن تھی.......... کسی کی رہ دیکھتی نگاہیں تھیں۔

''سلام پروین!'' شوکا تھا جو رکھوں کے پچھلی طرف سے چلا آ رہا تھا۔

''وعلیکم اسلام بھا۔'' پروین نے چونکتے ہوئے جواب دیا۔

''ادھر کیوں بیٹھی ہوئی ہو..........؟ خیر تو ہے نا..........؟''

''ہاں..........بس خیر ہے۔'' پروین پریشانی سے چنری سر پہ درست کرتے ہوئے بولی۔

''چاچے کا کیا حال ہے؟ بہت دن ہوئے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔''

''ابا ٹھیک ہے۔ اس وقت زمین پہ ہی ہوگا۔''

''اچھا میں پھر چلتا ہوں..........'' اس نے گلا کھنکار کر صاف کیا اور ایک طرف کو چل پڑا۔

پروین شرمندہ سی رکھوں کے ساتھ ٹیک لگا کر ڈھے گئی۔ اسے یہ کیا ہو گیا تھا؟ اس نے اپنا آپ رول لیا تھا۔ وہ گاؤں میں تو گھومتی رہتی تھی۔ گاؤں سے باہر کم ہی جاتی تھی مگر جب سے نبیل گیا تھا اس کی زندگی اس کے شب و روز یکسر بدل گئے تھے۔

''کبھی انسانوں سے بھی کیا؟''

''ہاں کیا۔''

''کس سے؟''

''اپنی ہونے والی بیوی سے۔''

''تم نے کسی سے پیار کیا؟''

''ہاں نبیل! میں نے صرف تم سے پیار کیا ہے۔صرف تم سے ساری زندگی بھی کوشش کروں تو تم سے نہ کہہ سکوں گی۔''

☆............☆............☆

''دھی پروین کدھر ہے یہ اس کے ویر کا خط آیا ہے۔'' دین محمد گھر کے اندر داخل ہوتے ہی بلند آواز میں بولا۔

''ذرا ملکانی کی طرف گئی ہوئی ہے۔میرا خیال ہے آتی ہی ہوگی۔'' جنت بی بی ہانڈی میں ڈوئی پھیرتے ہوئے بولی۔

''یہ کڑی بھی بس ہنیری (آندھی) ہے۔ہر وقت چکراتی پھرتی ہے۔کبھی ملکانی کے گھر کبھی آسو کی طرف............تو............''

''کبھی ابے کو کھانا دینے کھیتوں میں............'' جنت بی بی نے لقمہ دیا۔

''آ............ہا............ہا............تو نے بھی میرا مذاق اڑانا شروع کر دیا ہے۔''

''پروین کے ابا! میں مذاق کب اڑا رہی ہوں؟ آپ کی بات مکمل کر رہی ہوں۔ہر روز یہی بات آپ کی زبان پر ہوتی ہے۔'' جنت بی بی پیڑھی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''بھلئے لوکے! یہ دھیاں بھی پتہ نہیں کیا شے ہوتی ہیں؟ گھر میں ہوں تو ہر وقت فکر مند کرتی رہتی ہیں ان کو رخصت کر دو تو مرجانی یاد بہت آتی ہیں۔'' دین محمد آنکھوں میں آئے پانی کو صافے سے پونچھتے ہوئے بولا۔

''پروین کی فکر نے تو مجھے بھی بوڑھا کر دیا ہے۔پتہ نہیں میری دھی کے لیکھ کدھر لکھے ہیں۔''

''میری نظر میں ایک رشتہ آیا ہے۔''

''کون سا............؟'' جنت بی بی جلدی سے دین محمد کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

''شوکا............اللہ بخشے سراج کا بیٹا۔'' دین محمد آہستگی سے بولا۔

''وہ بھٹے والا شوکا۔''

''ہاں............وہی............ان لوگوں نے ہی رشتہ پوچھا ہے۔چاچے حیات نے میرے سے بات کی تھی۔وہ کہہ رہا تھا میں دھی............جنتے سے بھی بات کروں گا۔'' ان لوگوں نے چاچے حیات کو آگے لگایا ہے۔''

''مگر شوکا تو صرف پانچ جماعتیں پڑھا ہے۔''

''تو کیا ہوا.........؟ زمینداروں کا پُتر ہے۔ بھٹے کا اکلوتا وارث ہے۔ درجنوں بندے اس کے نیچے کام کرتے ہیں۔''

''پر پھر.........بھی.........''جنت بی بی کی آنکھیں برسنے لگی تھیں۔

''اوئے بھلیئے لوکے! ہم نے کون سی ہاں کر دی ہے۔ ابھی تو بات چلی ہے۔ ابھی تو سو مشورے سو گل باتیں ہوں گی۔ اس کے دونوں بھائی شہر سے آلیں ان کی رائے لینی ہے۔ ابھی تو بڑا ویلا پڑا ہے.........ایک بات سچے دل سے بتا تیرا دل چاہتا ہے کہ پروین کا رشتہ کسی طرف ہو جائے۔'' دین محمد جنت بی بی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ وہی آنکھیں جن میں ازلوں کا جاری و ساری خوف چھپا ہوتا ہے۔ بیٹی کی اچھی یا بری تقدیر کا خوف.........

''شوکے کے ساتھ ہو جائے جدھر مرضی ہو جائے مگر میری دھی کی زندگی سکھی گزرے.........اے میرے رب! اس کے لیکھ اچھے کرنا.........بڑے لاڈوں سے میں نے اسے پالا ہے۔ کبھی کنڈا بھی نہیں چبھنے دیا اسے.........اس کی تقدیر اچھی کرنا۔''

''رب سوہنے نے چاہا تو میری دھی بڑی سکھی رہے گی.........اتنی پیاری تو ہے میری دھی.........جس گھر میں بھی جائے گی اس کو روشنی سے بھر دے گی۔''

''پروین کے ابا! پتہ نہیں میرا دل کیوں ڈرتا ہے؟ مجھے لگتا ہے پروین کو کچھ ہے۔''

''لے دیکھ.........! اسے کیا ہوگا؟''

''نہیں وہ بہت دنوں سے وہ نہیں ہے جو وہ تھی۔''

''کیا.........نہیں ہے؟''

''وہ پہلے والی پروین نہیں ہے۔ میں ماں ہوں اس کی میں جانتی ہوں۔ اس کے من میں کچھ ہے۔''

''کیا ہوگا اس کے من میں.........؟ تو بھی نہ بس اویں ہی بولتی رہتی ہے۔ جب لڑکیاں اس عمر کو پہنچ جاتی ہیں تو اگلے گھروں کی فکر انہیں لگ جاتی ہے۔ اس لیے وہ خاموش خاموش رہنے لگتی ہیں۔''

''مگر آنے والے وقت کی خوشی تو ان کے چہرے پہ پھوٹتی ہے۔'' دل میں جنم لینے والے سوال کو جنت بی بی زبان پر نہ لا سکی۔

''چل چھوڑ ان باتوں کو میرا حقہ تازہ کر دے۔'' پردین محمد منجی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

جنت بی بی حقے کی چلم میں تمباکو اور گڑ رکھ کر چولہے کے نیچے سے گرم کوئلے چلم میں بھرنے لگی۔ حقہ تازہ کر کے اور دین محمد کو پکڑا کر جنت بی بی اندر چلی گئی۔ دین محمد منجی پہ لیٹ کر حقے کے ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ دھوپ کی کرنیں سمٹتے سمٹتے راہداری سے باہر نکل گئی تھیں۔ برگد کے درخت میں پرندوں کی بولیاں شروع ہو گئیں تھیں۔ دین محمد کی منجی برگد کے نیچے ہی دھری تھی۔ وہ کافی دیر لیٹا رہا۔ کش لیتا رہا اور بے مقصد آسمان کو گھورتا رہا۔ دور مغرب کی طرف ڈوبتے سورج کی کرنیں آسمان پہ چھائی بدلی پر یوں پڑ رہی تھیں کہ وہ آتشی رنگ کا دکھنے لگا تھا۔

☆.........☆.........☆

دائرے سے ذرا ہٹ کے ایک خالی وٹ کے کنارے چاچا حیات لڑکوں کی ایک ٹولی کو لے کر بیٹھا تھا۔ وہ انہیں کبڈی کے داؤ پیچ سکھا رہا تھا۔

''دیکھو بھئی بالکو! یہ کبڈی جو ہے نا صرف اور صرف پھرتی اور تیزی کا کھیل ہے۔ اپنے دماغ کو بہت حاضر رکھنا پڑتا ہے۔ اس کو تیز گھوڑے کی طرح دوڑانا پڑتا ہے۔ خود بھی تیز دوڑنا پڑتا ہے۔

''چاچا! بندہ ہاتھ لگا کر کیسے بھاگے؟'' ایک لڑکا ان میں سے بولا۔

''یہ کیا سوال ہوا؟'' چاچا حیات اپنی گھنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بولا۔

''چاچا! اس کا مطلب ہے کہ دوسرے بندے کو ہاتھ لگا کر کس طریقے سے بھاگے کہ پکڑا نہ جائے۔'' دوسرا لڑکا بولا۔

''جب دوڑ تیز ہوگی.......... دماغ تیز چلے گا.......... پھرتی ہوگی تو پکڑنے والے کی ایسی کی تیسی کہ پکڑ لے۔ بس تم لوگوں نے ہاتھ لگا کر یوں بھاگنا ہے جیسے کوئی ناسمجھ ہلکائے کتے کو دیکھ کر دوڑ پڑتا ہے۔ تیز بھاگنا ہے اور سیدھے ہو کر بھاگنا ہے۔ بھاگتے ہوئے پیچھے مڑ کر بھی تھوڑا تھوڑا دیکھتے جانا ہے۔ اپنے مغر والے پر دھیان بھی رکھنا ہے کہ کہیں لانگڑی ہی نہ دے دے۔''

''اور چاچا! جب کوئی ہم میں سے کسی کو ہاتھ لگا کر بھاگے تو اسے ہم نے کیسے پکڑنا ہے؟'' ایک اور لڑکا بولا۔

''بس تم یہ سمجھو کہ وہ تمہاری لنگوٹی لے کر بھاگا ہے اگر تمہارے ہاتھ سے نکل گیا تو ننگا گھر جانا پڑے گا۔'' چاچے حیات کی اس بات پر سارے ہنسنے لگے۔

''اچھا تیار ہو جاؤ اب تم لوگوں کی میں دوڑ لگوانے لگا ہوں۔ تم سب کو آم کے جوڑے رُکھ کو ہاتھ لگا کر واپس آنا ہے۔''

وہ تقریباً اٹھاراں لڑکے تھے۔ انہوں نے چاچا حیات کے اشارے پہ بھاگنا شروع کر دیا تھا۔ دور مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ دم توڑتے سورج کی کرنیں مکئی کی منجروں کو لشکاتی تھیں۔ جوار اور باجرے کے سٹوں کو چمکاتی تھیں۔ آموں کے رُکھوں کے پار مکئی کی فصل کے آدھے سٹے دھوپ میں تھے آدھے سٹے چھاؤں میں مسکراتے تھے۔ دائرے میں دھول اڑتی تھی۔ لڑکے بھاگتے تھے دھول اڑتی تھی۔ پس منظر میں سورج اپنی الوداعی کرنیں سمیٹتا تھا اور گاؤں کی گلیوں میں ایک کھانڈ کی گڑیا چلی جاتی تھی۔ اس کی راتوں کی نیندوں کا قرار کسی نے چھین لیا تھا۔ پہلے وہ دودھ بلوتی تھی، چارہ کاٹتی تھی، بھینسوں کا ڈھیر سا کام کرتی تھی۔ گھر کی صفائی ستھرائی کرتی تھی تو تھکتی نہ تھی مگر اب وہ کام کیے بنا ہی تھک گئی تھی۔ اس کی ہڈیوں میں اس کے گوشت پوست میں کسی انتظار ٹھہر گیا تھا۔ کسی نہ آنے والے کا انتظار..........

آموں کے جڑواں رُکھ کو ہاتھ لگا کر واپس آتے ہوئے پانچ لڑکے سب سے آگے تھے۔ چاچے حیات کے پاس اب دین محمد اور کمہار بھی کھڑے تھے۔ پانچ میں سے تین لڑکے آگے نکل گئے اور تینوں تھوڑے سے فرق کے ساتھ چاچا حیات تک پہنچے اور انہوں نے بیری کو ہاتھ لگایا۔

''شاوا پترو..........شاوا'' کمہار نعرہ مارتے ہوئے بولا۔ ''اس دفعہ..........کبڈی کا میچ ہمارا گاؤں ہی جیتے گا۔''

''رب نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔'' دین محمد اس کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

''تم لوگ حوصلہ نہ چھوڑو..........تم لوگوں نے ان سے بھی آگے نکلنا ہے۔'' چاچا حیات پیچھے رہ جانے والے لڑکوں سے مخاطب ہو کر بولا۔

''بس اب ہمارے پاس ایک مہینہ ہے۔'' چاچا حیات لڑکوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''اس ایک مہینے میں تم لوگوں نے اپنے جسموں کو لوہے کی طرح مضبوط کرنا ہے۔ صبح سویرے اٹھنا ہے' نماز پڑھنی ہے جنہوں نے قرآن شریف نہیں پڑھا۔ انہوں نے مولوی صاحب سے سبق لینا ہے اور ادھر سے گھر جانے کی بجائے سیدھے میرے پاس چلے آنا ہے۔ چھاویلہ بعد میں ہوگا۔''

''دین محمد! اور سنا کیا حال ہے تیرا؟'' چاچا حیات دین محمد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''بس چاچا! رب کا بڑا ہی ترس ہے۔''

''ہاں اس کی رحمت ہی چاہیے۔'' چاچا ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا ''اور سنا.........پتر کب گاؤں آرہے ہیں۔ ان کو دیکھے تو بڑا ہی ویلہ ہو گیا ہے۔''

''بس میلے سے ایک دو دن پہلے ہی پہنچ جائیں گے۔''

''پھر کتنے دن رہیں گے؟''

''میرا خیال ہے اس دفعہ ایک مہینہ تو رہیں گے ہی..........'' دین محمد بولا۔

''دین محمد! میں تو کہتا ہوں انہیں یہاں پاس ہی بلا لے..........شہر میں کیا رکھا ہے..........حیاتی وہی ہے..........جو اپنوں کے بیچ میں ہو..........اپنوں کے دکھ سکھ میں شامل ہو کر ہو۔'' بشیر کمہار گھمبیر آواز میں بولا۔

''تو ٹھیک کہتا ہے بشیرے! میری کوئی سنے تو پھر ہے نا..........دونوں ہی بس اپنی ضد کے پکے ہیں۔ کہتے ہیں شہر میں بہت پیسہ ہے..........بھلا گاؤں سے بڑھ کر مہنگی شے بھی کوئی ہو سکتی ہے۔''

''اوہو..........! ایک حسنا بھی تو تھا..........جو شہر گیا تھا پھر پرت کے واپس نہیں آیا۔'' چاچا حیات دور خیالوں میں کھوتے ہوئے بولا۔

''ان ہاتھوں نے اسے پالا پوسا بڑا کیا پڑھایا لکھایا..........پر ایک غلطی میں نے کی اور ایک غلطی پھر اس نے کر لی..........میں نے اسے شہر بھیجنے کی غلطی کی اور اس نے وہاں شادی کرنے کی غلطی کی..........اوئے بھلا..........زندگی کے اتنے بڑے فیصلے پر بڑوں کو کوئی حق نہیں ہوتا۔ ان سے نہیں پوچھا جاتا کہ کیسے کرنا ہے؟ کیا کرنا ہے؟''

''چاچا! ویسے حسنے کو گاؤں سے محبت تو بڑی تھی۔'' بشیر کمہار حقہ کا کش فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا۔

''ہاں..........وہ محبت بھی اس کے ساتھ ہی ولیت چلی گئی۔'' چاچا حیات آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولا۔ ''اس کی گھر والی ہی ایسی تھی جو اسے ہم لوگوں سے دور لے گئی۔ بھلا بتائے اسے کوئی ہم نے کیا اس سے حسنے کو چھین لینا تھا۔''

''مگر چاچا! اب تو موت ہی ہم سے حسنا چھین کر لے گئی۔'' دین محمد آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں بولا۔

یکدم چاچے حیات کے چہرے پہ بے پناہ کرب امڈ آیا۔ پھر اس کی آواز بھاری ہوئی اور پھر اس پر رقت طاری ہوگئی۔ چاچا حیات ہچکیوں سے رونے لگا۔ شاید بوڑھی عمر میں دل بھی نہایت نرم ہو جاتا ہے جو بات بے بات بھر آتا ہے۔ چاچا حیات بھی بات بات پر آنکھوں میں آنسو بھر لیتا تھا مگر حسنے کی موت کے ذکر پر تو وہ باقاعدہ رونا شروع کر دیتا تھا۔ دین محمد اور بشیر کمہار کی آنکھوں میں بھی آنسو چمکنے لگے تھے۔ لڑکے پرے کھڑے ڈنڈ نکال رہے تھے۔ وہ بڑوں کی باتوں سے بے نیاز اپنی تیاریوں میں مصروف تھے۔

''پتر نبیل کا کوئی خط وط نہیں آیا.........کوئی خیر خبر.........!'' بشیر کمہار یکدم چھا جانے والی گھٹن کو ختم کرنے کے لیے بولا۔

''نہیں ابھی تک تو کوئی خط نہیں آیا۔'' دین محمد بولا۔

''بھول گیا ہوگا وہ بھی ہم لوگوں کو اپنے باپ کی طرح۔'' چاچا حیات بولا۔

''نہیں چاچا! وہ ہم لوگوں کو نہیں بھول سکتا۔ میں نے اس لڑکے کی آنکھوں میں کوئی چمک دیکھی ہے۔ وہ پھر گاؤں آئے گا۔ اس نے ہم لوگوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پھر گاؤں آئے گا اور پھر بہت دن رہے گا۔ اس وقت تو وہ جلدی میں تھا'' دین محمد نے کہا۔

''خدا کرے تمہاری بات درست ہو وہ گاؤں ضرور آئے۔ پتہ نہیں کیوں اس کو دیکھ کر دل میں ٹھنڈ سی اتر گئی تھی۔ اتنا شیر جوان پتر دیکھ کر حسنے کا غم کچھ ہلکا ہوتا ہے۔'' چاچا حیات بولا۔

تینوں کی باتیں جاری تھیں کہ ایک طرف سے دینو موچی تہمد گھٹنوں تک اٹھائے چلا آیا۔

بشیر کمہار بلند آواز میں بولا ''اوئے ککڑ! تجھے کھڈے میں سے کس نے نکالا ہے؟''

''اوئے بھوتنی دے! تو پھر شروع ہو گیا ہے لگتا ہے مجھ سے بے زتی کروائے گا۔'' دینو موچی آستین چڑھاتے ہوئے بولا۔

''بے زتی اور تیرے جیسے لنگور سے!''

''لنگور ہوگا تو.........تیرے سارے کھوتے۔''

''کھوتے.........کھوتے ہی ہوتے ہیں لنگور نہیں۔''

''ہاں.........ہاں.........تیرے جیسے کھوتے۔''

''اوئے تو نے.........مجھے کھوتا کہا۔''

''جو تو ہے وہ تو ہے ہی، میرے کہنے یا نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے۔''

چاچا حیات اور دین محمد منہ پر صافے رکھ کر ہنسی روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ غصے کی شدت سے بشیر کمہار کا سارا وجود کانپنے لگا تھا۔

''چاچا! اس کو موڑ لے نہیں تو میرے ہتھ سے آج یہ نیولا رگڑا جائے گا۔''

''اوئے تو نے مجھے نیولا کہا؟''

''ہاں.........ہاں تو نیولا.......... لے بس اب خوش۔''

''اوئے شرم کرو..........اویں ہر وقت لڑتے رہتے ہو۔ کبھی صلح صفائی سے بھی رہ لیا کرو۔''

''چاچا تو نہیں جانتا۔ یہ دینو اویں ہی مجھے تاؤ دلاتا رہتا ہے۔'' بشیر کمہار تیز آواز میں بولا۔

''اویں تاؤ نہیں دلاتا......... سچی بات کرتا ہوں جو تجھے کڑوی لگتی ہے کنین کی طرح۔''

''یار! تم دونوں کی ہمیشہ سے کبھی نہیں بنی اس کی کیا وجہ ہے؟ ہمیشہ آپس میں سوکنوں کی طرح رہتے ہو۔''

''اصل میں دونوں میں اتنا پیار ہے کہ یہ حالت ہوگئی ہے۔ پیار بھی زیادہ ہو جائے تو گڑ بڑ کرتا ہے۔ ایک دوسرے کو انسان نظر آنے کی بجائے جانور نظر آنے لگتے ہیں۔ جیسے کھوتے' نیولے' لنگور وغیرہ۔'' چاچا حیات آنکھ میچتے ہوئے بولا۔ دونوں شرمندگی سے ہنسنے لگے۔

''چاچا کبڈی کے لیے لڑکوں کو تیاری کیسی ہے؟ میرا مطلب ہے اس بار ہمارا گاؤں ہی جیتے گا نا۔ ''رنگ والی'' گاؤں والوں سے؟'' دینو موچی بات کا رخ دوسری طرف موڑتے ہوئے بولا۔

''اور کیا بیوقوف تیرا مطلب ہے ''رنگ والی'' گاؤں والے جیتیں گے۔'' بشیر کمہار ٹوکتے ہوئے بولا۔

''اوئے مجنوں! یہ تو قسمت کے کھیڈ ہیں۔ محنت ہر کوئی کرتا ہے۔ ایک کو جیتنا ہوتا ہے تو ایک کو ہارنا ہوتا ہے.......... ہارنے والے کی وجہ سے ہی جیتنے والے کی جیت ہے۔ چلو بتاؤ اگر دونوں ایک جیسے رہیں دونوں میں سے کوئی بھی نہ ہارے تو کون جیتا..........کوئی بھی نہیں.......... میرے خیال سے دونوں ہار گئے۔'' چاچا حیات حقے کی نے بشیر کمہار کی طرف موڑتے ہوئے بولا۔

بشیر کمہار دور خیالوں میں کہیں کھویا ہوا حقے کی نے پکڑ کر کش کھینچنے لگا۔ ''چاچا سچ بتا واقعی ہارنے والے کی ہار کی وجہ سے جیتنے والی کی جیت ہوتی ہے۔'' بشیر کمہار اپنی جون میں بولتا چلا گیا۔ ''اگر ایسا ہے تو پھر میں نے اپنے سالے کو معاف کیا.......... اس نے مجھ سے معافی مانگی تھی مگر میں نے اسے معاف نہیں کیا تھا۔ وہ میرے آگے ہار گیا تھا اور میں جیت گیا تھا۔ مگر میری جیت اس کی وجہ سے تھی۔ وہ میرے سامنے نیواں ہو گیا تھا مگر میں نے پھر بھی اسے معاف نہیں کیا۔''

''معاف کر دینے سے بڑی کوئی قدر نہیں ہے۔'' چاچا حیات گھمبیر آواز میں بولا۔

''معاف کرنے والے کو تو رب بھی معاف کر دیتا ہے۔'' دین محمد لقمہ دیتے ہوئے بولا۔

''اگر تو اسے معاف کرے گا تو زندگی میں شاید پہلا اچھا کام کرے گا۔'' دینو موچی بشیر کمہار سے آنکھ بچاتے ہوئے بولا۔

''بس میں نے اسے معاف کر دیا۔ میں اسی جمعے اس کے گاؤں جاؤں گا اس سے مل کر آؤں گا۔''

''شاوا اوئے گھگھو گھوڑیا! تو آگے سے سیانا نہیں ہو گیا؟'' دینو موچی شرارت سے بولا۔

''سیانا ہونا پڑتا ہے دینو دریا! سیانا ہونا پڑتا ہے۔'' بشیر کمہار دھیمے سے بولا۔

تینوں حیرت سے بشیر کمہار کی طرف دیکھنے لگے جو آموں کے رکھوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ رہا تھا اور بول رہا تھا۔ ''جب دھیاں جوان

ہو جائیں تو سیانا ہونا پڑتا ہے ان کے لیے اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔ اپنی آ کر ختم کرنی پڑتی ہے..........'' بشیر اپنی دھن میں بول رہا تھا دین محمد اور ہی کہیں پہنچا ہوا تھا۔ اس کی دھی بھی تو جوان تھی۔ پروین کے لیے اس نے ابھی تک کسی پر بھی نظر نہیں رکھی تھی۔ اسے پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ کب وہ بلوغت کی دہلیز پار کر کے جوان ہو گئی تھی۔ اس کے لیے وہ ابھی بچی تھی چھوٹی سی بچی گھگھو گھوڑے اور گڑیوں سے کھیلنے والی' ضدیں کرنے اور روٹھ جانے والی بچی..........

چاچا حیات دین محمد کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بشیر کمہار اٹھ کر ورزش کرتے لڑکوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اسے دیکھ کر دینو موچی بھی اٹھ بیٹھا۔ ''اوئے یہ شتر مرغ! کدھر کو چلا ہے..........لڑکے تو زور کر رہے ہیں۔ یہ ادھر جا کر کیا کرے گا۔ لڑکوں کو خراب ہی کرے گا۔''

''جا جا تُو بھی اس کے پیچھے جا، دیکھ یہ وہاں جا کر کیا کرتا ہے۔'' چاچا حیات ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

دینو بھی جا چکا تو چاچا حیات دین محمد سے مخاطب ہوا۔ ''تو پروین بیٹی کے لیے پریشان ہے نا..........؟''

''ہاں چاچا! یہ کڑیاں تو سرو کے بوٹے ہوتے ہیں بڑا ہونے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔''

''شوکے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ مجھے تو پروین کے لیے مناسب لگتا ہے۔''

''آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔'' دین محمد دھیمی آواز میں بولا۔

''تُو نے جنتے سے بات کی تھی؟'' چاچا حیات جنت بی بی کو جنتے کہتا تھا۔

''ہاں کی تھی۔'' دین محمد چہرہ صافے سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

''کیا کہتی ہے وہ..........؟''

''کیا کہنا ہے اس نے..........بس خاموش ہو گئی۔'' پھر کہنے لگی۔ ''شوکا تو صرف پانچ جماعتیں پڑھا ہوا ہے۔''

''ہے.......... پاگل.......... پانچ جماعتیں پڑھا ہوا ہے پر بھٹے کا اکلوتا مالک ہے۔ دس کلے زمین ہے لورپور کے گاؤں میں..........اور تم لوگوں کو کیا چاہیے..........وہ پروین کو بڑا خوش رکھے گا۔''

''یہ ساری باتیں بتائی تھیں میں نے اس کو۔''

''تو پھر کیا کہا اس نے؟ کہیں انکار تو نہیں کر رہی تھی۔''

''ابھی تو انکار اقرار کا سوال ہی نہیں..........اصل میں ہم لوگ ابھی تک ذہنی طور پر پروین کے رشتے کے لیے تیار ہی نہیں ہوئے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہوگی..........کہ ہم ابھی تک اسے بچی ہی سمجھتے ہیں۔ کھلونوں' پتولوں سے کھیلنے والی بچی..........!''

''پر..........اس کا رشتہ کہیں تو کرنا ہے نا..........آج نہ سہی کل..........''

''ہاں چاچا! آج نہ سہی تو..........کل..........''

''دین محمد!..........ادھر دیکھ میری طرف..........کہیں تیرے من میں نبیل کا خیال تو نہیں ہے۔'' چاچا حیات دین محمد کی آنکھوں میں

دور تک جھانکتے ہوئے بولا۔

''نن.........نہیں.........''

''تو جھوٹ بولتا ہے۔''

''میں کیوں جھوٹ بولوں گا؟''

''پھر ایسے میرے سے نظریں کیوں چرا رہا ہے؟''

''کب نظریں چرا رہا ہوں؟'' دین محمد کی آنکھوں میں نمی گھلنے لگی۔''اس کی منگنی تو مامے کی کڑی کے ساتھ ہوگئی ہے اور اب شادی بھی ہونے والی ہے۔''

''کون سے مامے کی کڑی؟''

''نبیل کے مامے کی کڑی اور کس کی.........''

''یار کیسا ہوتا اگر ہماری سوہنی دھی کی شادی نبیل کے ساتھ ہو جاتی۔ جسنے والا زخم بھر جاتا اس کی روح کو سکون مل جاتا۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے چاچا! وہ لڑکا ولایت کا جم پل ہے۔ وہاں پڑھا لکھا ہے وہاں کاروبار کرتا ہے۔ شادی بھی وہیں پر کرے گا۔''

''کیسے نہیں ہو سکتا۔ اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔ یہاں کا پینڈو لڑکا شہری لڑکی سے شادی کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ولیت جا سکتا ہے تو پھر پروین کی شادی نبیل کے ساتھ کیوں نہیں ہو سکتی؟ کیا کمی ہے؟ ہماری دھی سوہنی سولڑی ہے پڑھی لکھی سمجھدار سیانی ہے اور سب سے بڑھ کر جنتے اس کی تربیت بڑے اچھے انداز میں کی ہے۔''

''یہ سب باتیں تو ٹھیک ہیں چاچا! پر اس کی شادی ہونے والی ہے۔'' دین محمد چاچا حیات کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا۔''اس نے کہا تھا کہ وہ گاؤں اپنی بیوی کو لے کر آئے گا۔''

''اچھا تو پھر جیسے رب کی مرضی۔'' چاچا حیات حقے کو پرے رکھتے ہوئے بولا۔''چل آ لڑکوں کی خبر لیں وہ کیا کر رہے ہیں؟'' چاچا حیات وہاں سے اٹھتے ہوئے بولا۔

دین محمد بھی اس کے پیچھے ہولیا۔''ویسے شوکا بڑا ایبا منڈا ہے ادھر رشتہ کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔'' چاچا حیات صافے کو سر کے گرد لپیٹتے ہوئے بولا۔

''آپ جنتے سے بھی بات کر کے دیکھنا۔'' دین محمد بولا۔

''ہاں میں رات کا کھانا کھا کر تمہارے گھر آؤں گا۔ پھر بیٹھ کر بات کریں گے۔''

''سنا ہے چودھری بہشت علی شہر سے واپس آ رہا ہے۔''

''وہ تو اپنے منڈے کی شادی پر شہر گیا ہوا تھا؟'' دین محمد پُر سوچ لہجے میں بولا۔

''ہاں پتہ نہیں آج کل کی نوجوان نسل کو کیا ہو گیا ہے۔ ہر کوئی گاؤں کو چھوڑ کر شہر میں بستا جا رہا ہے۔ بھلا اب کوئی بتائے اس منڈے کی مت، باپ اس کا گاؤں کا چودھری، ساری زمین گاؤں میں مال ڈنگر گاؤں میں اور وہ شہر کی.......... میں جا وڑا ہے۔''

''اب دور بدل رہا ہے، زمانہ بدل رہا ہے چاچا! اب روپے پیسے سے پیار کیا جاتا ہے۔ انسانوں اور رشتوں کو بھلایا جا رہا ہے۔ اب مٹی سے محبت ختم ہوتی جا رہی ہے چاچا!''

''تو ٹھیک کہتا ہے دین محمد!.......... سب کچھ بدل رہا ہے۔ سب کچھ بدل رہا ہے۔''

☆..........☆..........☆

شکیل نے یکدم دروازہ بند کر کے لاک کر دیا تھا۔ ایک دبی دبی سے نسوانی آواز ابھر رہی تھی۔ وہ سوی کی آواز تھی۔ ''شکیل کوئی آ جائے گا۔''

''یہاں کوئی نہیں آ سکتا.......... تم مجھے ایک بات بتاؤ تم اس قدر کیوں ڈرتی ہو۔''

''ڈرتی نہیں ہوں۔''

''تو پھر..........''

''یہ سب ٹھیک نہیں۔''

''کیا ٹھیک نہیں؟'' وہ اس کو بانہوں میں جکڑتے ہوئے بولا۔

''یہی جو تم کر رہے ہو۔''

''اوکم آن یار! پھر وہی گھسا پٹا سوال۔''

''مجھے ڈر لگتا ہے کہیں کچھ ہو نہ جائے۔''

''کیا ہو گا؟''

''جس سے ہم دونوں بدنام ہو جائیں۔''

''ہماری شادی ہونے والی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے مل سکتے ہیں۔''

''چلو.......... مگر ذرا دور رہ کر..........''

شکیل نے ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ جھٹکا اور دروازے کی طرف لپکا۔

''کدھر جا رہے ہو؟'' سوی سسکی۔

''جہنم میں جا رہا ہوں۔''

''رکو.........میری بات سنو.........میرا مطلب یہ نہیں تھا۔''

''پھر کیا مطلب تھا تمہارا؟''

''دیکھو شکیل! اگر ہمارے بارے میں امی ابو پھپھو کو پتہ چل گیا تو پھر کیا ہوگا؟''

''ان کو کیسے پتہ چلے گا.........ماموں دفتر گئے ہیں۔ مامی امی اور عینی کے ساتھ شادی کی شاپنگ کرنے گئیں ہیں اور روی چھوٹے کو سکول لے گئی ہے۔ نبیل بھائی بھی اپنے آفس میں ہیں۔'' شکیل کا ہاتھ کندھے سے سرکتا ہوا کمر پر آ گیا۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اس نے سوی کو خود سے لگا لیا۔ دم توڑتی مزاحمت کے ساتھ گھٹی گھٹی آواز سوی کے منہ سے نکلی۔ پھر اس نے خود کو شکیل کے سپرد کر دیا۔ ایک طوفان ابھرا' چھایا اور پھر تھم گیا۔ ایسا طوفان پہلی دفعہ نہیں آیا تھا۔ اس سے پہلے بھی اس کمرے میں کئی دفعہ آ چکا تھا اور کوئی نشانی دیئے بنا واپس چلا گیا تھا۔

''شکیل! کچھ ہوگا تو نہیں نا۔'' سوی دھیمی آواز میں بولی۔

''تم ہر دفعہ یہ فضول سوال کیوں کرتی ہو؟ میں پیار کرتا ہوں تم سے اور ہم دونوں شادی کریں گے.........اگر کچھ ہو بھی گیا تو سنبھال لوں گا۔''

''آئی لو یو.........! شکیل۔'' سوی شکیل سے بغل گیر ہوگئی۔

''آئی لو یو.........ٹو.........سوی۔''

''نبیل بھائی کی شادی میرے خیال سے میرا آخری سمیسٹر ختم ہونے تک ہو جائے گی۔ پھر.........ہماری شادی ہوگی.........دھوم دھام سے.........''

''ہاں پھر ہماری شادی ہوگی۔'' سوی شکیل کے کندھے پہ ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے بولی۔

☆.........☆.........☆

جس الجھن میں نبیل گھرا ہوا تھا۔ وہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ ہر کوئی تیاریوں میں مصروف تھا۔ ہر کسی کو شادی کی جلدی پڑی ہوئی تھی مگر نبیل دن رات ایک کرب میں مبتلا تھا۔ اس کا دن کا سکون رات کی نیند غارت ہو گئی تھی۔ وہ ایک دوراہے پر کھڑا تھا۔ ایک طرف ماموں کی سالہا سال کی نوازشیں تھیں ان کی ہمدردیاں اور محبتیں تھیں تو دوسری طرف رومی کی بیباکانہ طبیعت اور بے راہ روی تھی۔ اس کو اس کی زندگی کا ساتھی بنایا جا رہا تھا۔ زندگی بھر کا ساتھی .... جو نبیل کو اب ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس سنڈے کو اسلامک سنٹر سے نکلتے ہوئے دیکھنے والا منظر وہ بھولا نہیں تھا۔ کسی غیر کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر اسے بوسہ دینے کا منظر ....

نبیل اس وقت اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا اس کی انگلیاں کمپیوٹر پر چل رہی تھیں مگر ذہن کہیں اور پہنچا ہوا تھا۔ دور کسی دور دراز علاقے میں .... سُر اٹھ رہا تھا' بکھر رہا تھا مگر نبیل تک نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس کی حالت پھر سے ایسی ہو گئی تھی جیسے گاؤں جانے سے پہلے تھی۔ وہ اکھڑا اکھڑا سا رہنے لگا تھا۔ چپ چپ اور خاموش سا .... اس کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے؟ کس سے اپنے دل کا حال کہے؟ اس کی یہاں کون سننے والا تھا؟ پھر کی بورڈ پہ چلتی چلتی انگلیاں رک گئیں۔ یکدم اس کے سر سے جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ کوئی ایک سوچ' آگہی کا کوئی ایک لمحہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ ساری الجھن ختم کر ڈالتا ہے۔ اس کے من میں بیٹھے بٹھائے گاؤں میں خط لکھنے کا خیال آیا تھا۔ یہ خیال کتنا فرحت بخش تھا یہ نبیل ہی جانتا تھا۔ خط والی سوچ نے کتنے دنوں کے کرب سے اسے باہر نکال دیا تھا۔ اسے خود پہ حیرانگی ہونے لگی کہ اتنے دن ہوئے اسے خط لکھنا کیونکر یاد نہیں آیا۔ حالانکہ گاؤں سے چلتے وقت سب لوگوں نے اسے یقین دہانی کرائی تھی کہ وہ انگلینڈ جا کر خط ضرور لکھتا رہے۔ اتنے دنوں بعد خود بخود ہی پروین کی شکل نظروں میں گھومنے لگی۔ اس کا سیمیں بدن آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگا۔ اسکی جھیل سی آنکھیں' ستواں ناک' رسیلے ہونٹ۔ اس کی معصوم نازک' بناوٹ سے پاک ادائیں دل میں کھد بُد کرنے لگیں۔ اس کے دل میں تمنا اٹھی کہ کاش وہ شاعر ہوتا اور پروین کی خوبصورت نزاکت' اس کے خوبصورت خدوخال پر ایک بھرپور غزل لکھتا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی خاموشی سے سنتی رہتی اور وہ اس کی نزاکت کی بھینی خوشبو سے لپٹا اسے سناتا رہتا۔ وہ فوری پاکستان تو نہیں جا سکتا تھا مگر خط تو لکھ سکتا تھا' رابطہ تو کر سکتا تھا۔ کاغذ کا ٹکڑا اس کی محبت سمیٹ کر پاکستان تو پہنچا سکتا تھا۔ وہ فوراً خط لکھنا چاہتا تھا مگر ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس وقت اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا دفتری کام کے اوقات میں صرف کام ہوتا ہے۔ اس سے ہٹ کر اگر کسی کی اور کوئی مصروفیت ہو تو اس کے خلاف ایکشن لیا جاتا ہے۔ یہ دستور تقریباً پورے یورپ میں رائج ہے اس لیے وہ اقوام ترقی کی راہ پر گامزن ہیں۔ نبیل کو خط لکھنے کے لیے رات پڑنے کا انتظار کرنا تھا۔ جس سافٹ ویئر کمپنی کا لیٹر اسے ملا تھا اس میں ہی نبیل کو جاب مل گئی تھی۔ اس کی سیلری شروع میں ہی چار ہزار پاؤنڈ لگا دی گئی تھی۔ آج اس کا دفتر میں تیسرا دن تھا۔ انوری بیگم نبیل کی نوکری سے بے حد خوش تھی۔ انوری بیگم کو پیار بھی تو سب سے زیادہ نبیل کے ساتھ تھا۔

دفتر سے فارغ ہوتے ہی نبیل سیدھا گھر پہنچا۔ گھر پر کوئی نہیں تھا۔ نبیل سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور دروازہ لاک کر لیا۔ اس نے لیٹر پیڈ نکال کر جلدی سے آگے رکھا بوٹ اتار کر بیڈ پر چھلانگ لگائی اور قلم سنبھال کر لکھنا شروع کیا۔ ایک ایک لائن لکھ کر چار پانچ صفحے اس نے پھاڑ ڈالے۔ پھر کاغذ قلم ایک طرف رکھ کر سوچنے بیٹھ گیا۔ چند لمحے گزرے پھر ایک دم انجانے جذبے کے تحت اس نے لکھنا شروع کر دیا۔ اس کا قلم پھسلتا گیا اور

قرطاس پہ روشنائی بکھیرتا گیا۔

''پھوپھی جان اور پھوپھا جان! اسلام علیکم۔ سمجھ نہیں آ رہی کہ کدھر سے بات شروع کروں۔ کہنے کو اتنا کچھ ہے کہ شاید ساری رات بھی بیٹھا رہوں تو نہ لکھ پاؤں گا۔ جب سے گاؤں سے واپس لوٹا ہوں ہر پل آپ لوگوں کی یاد ستاتی ہے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میری زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جائے گا۔ آپ لوگوں سے ملنے کے بعد......... اگر میں گاؤں آپ لوگوں کے پاس نہ آیا ہوتا تو کبھی نہ جان سکتا کہ دنیا میں اتنا پیار کرنے والے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ پھوپھو! آپ مجھے بہت یاد آتی ہیں۔ آپ کے ہاتھ کے بنے پراٹھے' مکھن' چاٹی کی لسی' آپ کا دودھ بلونا' آٹا پیسنا بہت یاد آتا ہے۔ اور ہاں یاد آیا پھوپھو! آپ کی دعاؤں سے میں نے نماز شروع کر دی ہے۔ تھوڑا پریشان ہوں دعا کریں اللہ میری پریشانی دور کر دے اور میں پھر آپ لوگوں سے ملنے گاؤں آؤں۔ چاول بنتا ہوا دیکھوں۔ پھوپھا! مجھے یاد آیا چاول تیار ہوا یا نہیں۔ میرا دل چاہتا ہے اڑتا ہوا آپ لوگوں کے پاس پہنچ جاؤں۔ پھر ان گلیوں میں گھوموں' پگڈنڈیوں پہ چلوں۔ کھالوں سے منہ ہاتھ دھوؤں۔ کیکر اور برگد کی چھاؤں میں بیٹھوں۔ گھر کے صحن والا برگد بھی مجھے بہت یاد آتا ہے۔ برگد میں بیٹھی چڑیوں کا چہچہانا ابھی بھی میرے کانوں میں گونجتا ہے۔ میں خود کو برگد کے ساتھ والے کمرے میں لیٹا محسوس کرتا ہوں مگر پھر جب میں گھبرا کر آنکھیں کھولتا ہوں تو میرے سامنے بلند عمارتیں کھڑی ہوتی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں یہ عمارتیں میرا وجود پیس دینا چاہتی ہیں۔

پھوپھا! چاچا حیات کو میری طرف سے بہت بہت سلام دیں اور چاچا بشیر' چاچا دینو' چاچا دیتو کیسے ہیں؟ چاچا بشیر اور چاچا دینو کی نوک جھونک اب بھی جاری رہتی ہے یا نہیں۔ ان لوگوں سے کہیے گا کہ میں اب جب آؤں گا تو بہت دیر ان کے پاس بیٹھوں گا ڈھیری باتیں کروں گا۔ پھر......... پھر مجھے میلہ بھی تو دیکھنے جانا ہے نا......... مولوی خیر دین کو میری طرف سے بہت بہت سلام پہنچا دیں اور ان سے کہیں کہ میرے لیے دعا کریں۔ مجھے دعاؤں کی بہت ضرورت ہے اور مجھے یاد آیا پروین کیسی ہے؟ خوش باش ہے نا......... اس کے پیٹ کی درد کا کیا حال ہے؟ امید ہے کہ ٹھیک ہوگی۔ پھوپھا! میں آپ لوگوں کو مشورہ دوں گا کہ پروین کو اور پڑھنے دیں۔ پروین اگر تم امتحان نہیں بھی دینا چاہتی تو گھر میں ہی کتابیں منگوا کر پڑھنا شروع کر دو۔ تعلیم انسان کو بہت کچھ بنا دیتی ہے۔ آخر میں سب لوگوں کو سلام۔ انشاء اللہ پہلی فرصت میں گاؤں کا چکر لگاؤں گا۔''

نیچے نبیل نے اپنے آفس کا پتہ تحریر کیا ہوا تھا اور لکھا تھا مجھے جوابی خط ضرور لکھیں۔

ابھی نبیل خط کو تہہ کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ نبیل نے جلدی سے خط کو جیب میں ڈال لیا۔ پین اور لیٹر پیڈ کو الماری میں رکھا اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے انوری بیگم کھڑی تھیں۔

''بیٹا! تم کب آئے تھے؟''

''ماں! تھوڑی دیر ہی ہوئی مگر آپ اتنی دیر سے کہاں تھیں؟''

''بیٹے! تیری مصیبتوں میں پڑی ہوئی تھی۔''

''میری مصیبتوں میں......... میں سمجھا نہیں.........؟''

''جب شادی ہو جائے گی نا........تو سب سمجھ آ جائے گی۔'' انوری بیگم پیار سے نبیل کے کندھے پر چپت مارتے ہوئے بولی۔ ''تیری شادی کی تیاریاں جو ہو رہی ہیں۔ بازاروں کے چکر لگا لگا کر میرا برا حال ہو گیا ہے۔''

''کیوں اپنے آپ کو ہلکان کرتی ہیں؟ رہنے دیں یہ سب۔''

''اے ہے........رہنے دیں یہ سب........تاکہ سارے لوگ مذاق اڑائیں۔ پہلے بیٹے کی شادی ہے اور کچھ بنایا نہ دیا........تو اپنے مشورے اپنے پاس ہی رکھ۔''

''ماں! ان سب باتوں سے ان سب کاموں سے میرا دم گھٹنے لگا ہے۔'' نبیل تلخی سے بولا۔

''کون سے کاموں سے........؟'' انوری بیگم حیران اور فکر مند ہوتے ہوئے بولی۔

''یہی شادی' بیاہ' تیاریاں........شور غل۔ ہر روز نیا شوشا' ہر روز نئی مصیبت۔'' نبیل اونچی آواز میں بولا۔

''نبیل بیٹے! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا........؟'' انوری بیگم فکر مند ہوتے ہوئے بولی۔

''ہاں........ہاں ٹھیک ہوں میں........سب لوگ مجھے دیوانہ سمجھتے ہیں۔ میرے پیچھے سے میری برائیاں کرتے ہیں بلکہ کچھ تو مجھے نفسیاتی مریض ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔''

''زبان کھینچ لوں گی میں اس کی جو تجھے مریض کہے گا۔''

''کس کس کی زبان کھینچیں گی آپ........؟''

انوری بیگم نبیل کو کمرے میں لے گئی اور دروازہ بند کر دیا۔ ''ادھر آ میرے پاس بیٹھ میرا بچہ۔''

انوری بیگم نبیل کو پاس بیٹھاتے ہوئے بولی۔ ''تو بتا مجھے کسی نے تجھے کچھ کہا ہے؟''

''نہیں ماں کسی نے نہیں کہا۔'' نبیل کا غصہ جیسے آیا تھا اتر بھی گیا۔ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

''میرے بیٹے! ایسے ہی پریشان نہیں ہوتے۔ دیکھنا تیری شادی ہو جائے گی نا........تو تیری طبیعت بالکل ٹھیک رہنے لگے گی۔ بات بے بات غصہ بھی نہیں چڑھا کرے گا۔'' انوری بیگم اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔

''ماں! میں شادی نہیں کر رہا۔''

''کیا کہا تو نے؟''

''میں شادی نہیں کر رہا۔''

''دماغ تو نہیں چل گیا تیرا؟''

''ہاں دماغ چل گیا ہے میرا۔''

''تجھے پتہ ہے تو کیا کہہ رہا ہے؟''

''مجھے پتہ ہے میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں۔ اپنے ہوش وحواس میں کہہ رہا ہوں۔''

''دیکھتی ہوں میں تو شادی کیسے نہیں کرتا..........؟ تو نے ابھی ماں کا پیار دیکھا ہے غصہ نہیں دیکھا۔''

انوری بیگم پاؤں پٹختی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ انوری بیگم کا موڈ ایک دم ہی نہایت سنگین ہو گیا تھا۔

نبیل نے سائیڈ ٹیبل سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ ہونٹوں میں دبا کر سگریٹ سلگانے ہی لگا تھا کہ اس نے سگریٹ پھر سے ڈبیا میں رکھ کر دراز میں رکھ دیئے۔ بیڈ پر لیٹ کر چھت پر نظریں گاڑ دیں۔ چھت پر جا بجا تارے لگے ہوئے تھے۔ پلاسٹک کے مصنوعی تارے..........جس طرح یہ تارے مصنوعی تھے اس طرح یہاں کی زندگی بھی مصنوعی تھی۔ مصنوعی اور کھوکھلی..........نبیل نے اٹھ کر کھڑکی کے پردے ہٹا دیئے۔ باہر رنگ و نور کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ بلند عمارتیں یوں چمک رہیں تھیں جیسے سینکڑوں جگنو اپنی روشنی بکھیر رہے ہوں۔ عمارتوں سے آگے سڑکوں کا جال بچھا ہوا تھا جہاں روشنیاں آگے پیچھے رینگتی تھیں۔ ان سے پرے بازار تھے انہی بازاروں میں وہ بے ہودہ کلب بھی تھے جہاں ابلیس برہنہ رقص کرتا تھا۔ جہاں جنسیت کے الاؤ پہ انسانیت کو زندہ جلایا جاتا تھا۔

''رومی جس ڈگر پر چل نکلی تھی۔ کیا بعید تھا کہ وہ بھی ان کلبوں میں جاتی ہو'' وہ سوچنے لگا۔''اس نے خود بھی تو کوئی برائی نہیں چھوڑی تھی۔ ہر طرح کا عیب کیا تھا۔ پھر کیوں وہ کسی کے بارے میں ایسا سوچ رہا تھا؟ اس نے بہت کوشش کی کہ رومی کی طرف سے اپنے دل کو صاف کرے۔ وہ یہ جانتا تھا کہ ماموں ممانی کے ان لوگوں پر کتنے احسان ہیں۔ وہ احسانوں کے بوجھ تلے دبا پڑا تھا مگر پھر بھی اس کا دل کسی طرف سے مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ لاشعور میں شاید اس کی وجہ پروین تھی مگر اس کا دھیان اس طرف نہیں جا رہا تھا۔

☆..........☆..........☆

رومی کی ماں نغمانہ بیگم دوغلی عورت تھی۔ اس کے دل میں کچھ اور ہوتا تھا زبان پر کچھ اور..........وہ بہت جلد اپنا لہجہ موقع کی مناسبت سے بدل لیتی تھی۔ ایسے انسان اپنی زعم میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے سامنے والے کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ منافقانہ رویئے کی وجہ سے ''سامنے والا'' انہیں دل ہی دل میں گالیاں دے رہا ہوتا ہے۔

جب نبیل پاکستان سے واپس لوٹا تھا تو نغمانہ بیگم اسی فلسفے پہ عمل کرتے ہوئے نبیل کی بلائیں لینے لگی تھی۔ ''بیٹا! اتنے دن کہاں رہے؟ ہم تو تمہاری شکل کو ہی ترس گئے تھے۔ سنا ہے تم گاؤں بھی گئے تھے۔ مجھے گاؤں دیکھنے کا بہت شوق ہے وغیرہ وغیرہ۔''

یہ سب باتیں منافقانہ تھیں۔ نغمانہ بیگم کے اندر جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ بھی جانتی تھی کہ گاؤں میں نبیل کی پھوپھی رہتی ہے۔ نبیل وہیں گیا ہوگا۔ پھوپھی سے ملنے اور پھوپھی کی کوئی بیٹی ہے۔ شاید اسی لیے وہ گاؤں کی اتنی تعریفیں کر رہا ہے۔

نغمانہ بیگم اس وقت کمرے میں بیٹھی ڈیک سن رہی تھی۔ اس نے نائٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کا ایک پاؤں میوزک کی لے پر ہل رہا تھا۔ سیٹھ افضل واش روم سے برآمد ہوا تو وہ تولیے سے بالوں کو خشک کر رہا تھا۔

''آپ کی لاپرواہی کسی دن اس گھر کو لے ڈوبے گی..........؟''

''آج مزاج اتنے اچھے کیوں ہیں.........؟'' سیٹھ افضل بیگم کو چھیڑتے ہوئے بولا۔

''آپ کو تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے۔''

''بھئی ہوا کیا ہے.........؟'' سیٹھ افضل تولیے کو ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔

''آپ گھر سے اتنے لاتعلق کیوں رہتے ہیں؟''

''کیا ہوا ہے.........؟ کوئی خاص خبر ہے؟'' سیٹھ افضل مصنوعی پریشانی سے بولا۔

''نبیل پاکستان میں گاؤں کی سیر کے دوران پھوپھی کے گھر گیا ہوا تھا۔''

''تو اس میں ایسی کون سی بات ہے.........؟''

''پھر وہی مذاق.........نبیل وہاں تین چار دن رہ کر آیا ہے۔ شاید اس سے بھی زیادہ اور جب سے آیا ہے بدلا بدلا سا ہے۔''

''چلو اگلی دفعہ زیادہ دن رہ آئے گا۔ سات آٹھ دن، اس میں ایسی کوئی پریشانی کی بات ہے؟''

نغمانہ منہ پھلا کر سیٹھ افضل کی طرف دیکھنے لگی۔ ''پریشانی کی بات ہے۔''

''کیسی پریشانی؟''

''اگر نبیل نے رومی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تو.........؟''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے.........؟''

''ایسا ہو سکتا ہے.........ایسا ہو سکتا ہے اگر آپ نے توجہ نہ کی.........ان سب کو پال پوس کر اتنا بڑا کیا۔ ساری زندگی ان کے لاڈ دیکھے اگر اب صلہ ملنے کا وقت آیا ہے تو.........میں کہتی ہوں۔ شادی کل کرنی ہے تو آج ہی کر دیں۔''

''بھئی وہ شکیل کے پیپرز ہونے والے ہیں شاید میرا خیال.........''

''چھوڑیں خیال دیال کو.........گھر کی بات ہے آپ شادی کی تاریخ پکی کریں۔''

''مگر.........ایک دم.........ابھی تو تم لوگ تیاریوں میں مصروف ہو۔''

''تیاریاں ہوتی رہیں گی.........آپ آج ہی انوری سے بات کریں۔''

''اچھا پھر ایسی بات ہے تو کھانا کھا لیں پھر دونوں اُدھر چلتے ہیں۔''

کھانا کھا کر جب نغمانہ اور سیٹھ افضل دوسری طرف گئے تو انوری بیگم عینی کے ساتھ مل کر کپڑے بیگ میں رکھ رہی تھی۔

''آئیں بھائی جان! آج ادھر کی راہ کیسے دیکھ لی۔'' انوری بیگم بستر سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''میں نے کہا آج اپنی بہن کا حال ہی پوچھ لیں۔''

انوری بیگم خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ ''نغمانہ بہن! تم بھی تو بیٹھو نا۔''

''یہ لو بیٹھ گئی..........اب کچھ لے کر ہی اٹھوں گی۔''

''یہ سب کچھ تمہارا ہی تو ہے..........جو جی چاہے اٹھالو۔''

''نہیں بہن میں آج کچھ لینے نہیں دینے آئی ہوں۔ اپنی بیٹی تمہارے سپرد کرنے آئی ہوں۔''

''ہاں انوری! ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ گھر کی بات ہے ہم نے کسی سے کیا مشورہ کرنا ہے جو کام کل ہونا ہے وہ آج ہی کر لیں۔'' سیٹھ افضل بولا۔

''ہاں..........وہ سب تو ٹھیک ہے بھائی جان..........! مگر..........''

''مگر کیا..........؟'' سیٹھ افضل حیرانگی سے بولا۔

''نبیل سے ایک دفعہ مشورہ کرلوں۔''

''بھئی اسے کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟''

''اعتراض تو کوئی نہیں۔'' انوری بیگم ٹوٹے لہجے میں بولی ''بس نبیل کہہ رہا تھا کچھ دفتر کا مسئلہ ہے۔ نئی نئی جاب ہے ناں..........شاید اس لیے..........''

''اس بدھو کو میں نے کہا بھی تھا میرے پاس آجاؤ..........خدا کا شکر ہے کسی چیز کی کمی نہیں ہے..........مگر پتہ نہیں اسے کیا مسئلہ ہے؟'' سیٹھ افضل تیوری ڈالتے ہوئے بولا۔

''مسئلہ کیا ہونا ہے بھائی جان! بس شوق ہے اس کا..........اتنے سال پڑھائی کرتا رہا ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنے شعبے میں کچھ نام کمانا چاہتا ہے۔''

''بھئی نام کمائے خوب کمائے..........اسے کون منع کرتا ہے۔'' سیٹھ افضل بولا۔

''شادی بس کروالے..........نام کمانے میں شادی تو رکاوٹ نہیں نہ بنتی۔'' نغمانہ نے لقمہ دیا۔

''شادی کرواکر بھائی اور زیادہ نام کمائیں گے۔ میرا تو یہی خیال ہے۔'' عینی دانت نکال کر بولی۔

''بالکل ٹھیک کہا میری بیٹی نے..........'' نغمانہ ہنستے ہوئے بولی۔

''پھر کون سی تاریخ ٹھیک رہے گی اس مہینے کی۔'' سیٹھ افضل فیصلہ کن انداز میں بولا۔

''آپ بڑے ہیں جو بھی رکھیں گے منظور ہے۔'' انوری بیگم دھیمے سے بولی۔ ''لیکن میری درخواست ہے کہ مجھے ایک دفعہ نبیل سے بات کر لینے دیں۔''

''جیسے تمہاری مرضی میری بہن، اگر تھوڑا لیٹ کرنا پڑے گا تو کوئی ایسی بات نہیں۔'' سیٹھ افضل خوشدلی سے بولا تو نغمانہ نے اسے کہنی ماری۔

''اچھا بھئی! اب ہم چلتے ہیں۔'' سیٹھ افضل اٹھتے ہوئے بولا۔

سیٹھ افضل اٹھ کر گیا تو ساتھ ہی نبیل اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔ انوری بیگم نے اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے ہی اسے دیکھ لیا۔

''نبیل کدھر جا رہے ہو؟'' انوری بیگم اندر سے ہی پکاری۔

''ماں میں ذرا کام جا رہا ہوں۔'' نبیل نے مختصر جواب دیا۔

''واپس کب لوٹو گے؟''

''پتہ نہیں۔''

''میں سو نہیں رہی۔ تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ جب بھی آ ؤ گے میری بات سن کر اپنے کمرے میں جانا۔''

نبیل نے کوئی جواب نہیں دیا اور باہر نکل گیا۔

''میں اس لڑکے کا کیا کروں؟'' انوری بیگم ماتھے پہ ہاتھ مارتے ہوئے افسردگی سے بولی۔

''مام! کیا بات ہے؟ نبیل بھائی پھر سے خاموش خاموش اور الجھے ہوئے رہنے لگے ہیں۔''

''پتہ نہیں کیا بات ہے؟'' انوری بیگم ہاتھ کو سوالیہ انداز میں گھماتے ہوئے بولی۔

انوری بیگم کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ نبیل نے شادی سے انکار کر دیا ہے اور وہ کسی کو بتانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ گویا انوری بیگم اور نبیل کے درمیان ایک سرد جنگ شروع ہو چکی تھی۔ جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ انوری بیگم وہ جنگ جیتنا چاہتی تھی ہر صورت' ہر قیمت پر..........اور نبیل وہ جنگ ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے سامنے ایک منظر تھا۔ کھلی فضاؤں کا منظر..........دور..........کسی دور دراز علاقے سے لہلہاتی فصلوں کے پار سے کوئی سُر اٹھتا تھا اور اس کے سینے میں ہلچل مچا جاتا تھا۔ کوئی اَن دیکھا منظر پردہ بصارت میں نمودار ہوتا تھا اور اس کی جان جلنے لگتی تھی۔ وہ خود کو قید میں محسوس کرتا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا اس کے ہاتھ اور پیر باندھ کر اسے کسی تنگ و تاریک کوٹھری میں ڈال دیا گیا ہے۔ کھلی فضاؤں کی مہک اس سے چھین لی گئی ہے۔ اس کے پر کاٹ دیئے گئے ہیں۔

☆..........☆..........☆

''شکیل! سنا کچھ تم نے..........؟'' سوہی فون پر شکیل سے بات کر رہی تھی۔

''کیا..........؟''

''نبیل بھائی اور روہی کی شادی اسی مہینے میں ہونے والی ہے۔''

''وٹ..........یہ میں کیا سن رہا ہوں؟''

''بالکل ٹھیک اطلاع ہے۔''

''مگر میرے تو ایگزیم..........اور''

''ابھی شادی تمہاری تو نہیں ہو رہی۔ ویسے تم تو ہو ہی ست۔''

''کیا..........تم نے مجھے ست کہا؟''

''ہاں..........ہاں ست۔''

''وہ کیوں..........؟ وضاحت کرو۔''

''نبیل بھائی کی شادی ہو رہی ہے تو تم پیچھے رہ گئے ہو۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''یہی تو بات ہے..........نیا دور ہے نیا زمانہ ہے..........چھوٹا بڑا نہیں دیکھا جاتا جسے جلدی ہوئی ہے وہ شادی کروا لیتا ہے۔''

''مجھے ایسی کوئی جلدی نہیں۔''

''تبھی تو تمہیں ست کہہ رہی ہوں۔''

''اچھا ایسی بات ہے تو پھر لگتا ہے مجھے مام سے بات کرنی پڑے گی۔''

''اوہ.........امیزنگ.........''

''سومی! ایک بات یاد رکھنا۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو دھوکا دیتے ہیں جو دل بھر جانے پر پیچھے ہٹ جاتے ہیں' بھاگ جاتے ہیں۔ تم میری ضرورت بن چکی ہو۔ میں نے تمہیں جسمانی اور روحانی شدت کے ساتھ چاہا ہے۔ میں زندگی کے کسی موڑ پر بھی اگر تم سے پیچھا چھڑانا بھی چاہوں گا تو نہیں چھڑا سکوں گا.........بی کاز.........آئی لو یو.........آئی لو یو۔''

شکیل کے الفاظ میٹھا زہر بن کر سومی کے کانوں میں ٹپکنے لگے۔ اس کی جان مچلنے لگی وہ خود بے اختیار ہونے لگی۔ ''شکیل! پلیز کچھ کرو.........اب مزید دُوری برداشت نہیں ہوتی۔ مجھے ساری ساری رات نیند نہیں آتی' کروٹیں بدلتی رہتی ہوں۔ تمہاری صورت' تمہاری باتیں مجھے سونے نہیں دیتیں۔ مجھے یوں لگتا ہے جسے اور تھوڑا عرصہ تم مجھے نہ ملے تو میرا دم نکل جائے گا.........آئی.........آئی مس یو سو مچ شکیل' سومی کی آنکھوں میں آنسو مچلنے لگے تھے۔

''آئی.........مس یو ٹو.........سومی.........میرا حال بھی تم سے مختلف نہیں ہے۔''

''رات بارہ بجے کے بعد چھت والے کمرے میں آؤ گی؟''

''کس لیے.........؟''

''ملاقات کے لیے۔''

''کیسی ملاقات.........؟'' سومی بے خودی میں بولی۔

''ایسی ملاقات جو ہمیں سیراب کر دے۔''

''سب لوگ گھر پر ہیں۔''

''سب کے سونے کے بعد آ جانا۔''

''اچھا دیکھوں گی؟''

''نہیں تمہیں آنا ہوگا۔''

''مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''کیسا ڈر؟'' شکیل نے سرگوشی کی۔

''کچھ ہو جانے کا ڈر.........''

''ہماری شادی ہونے والی ہے۔''

''کب ہوگی ہماری شادی؟'' سومی کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

''بہت جلد.........''

''شکیل! مجھے لگتا ہے تم بدل جاؤ گے۔''

شکیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ سومی کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ وہ بار بار آفس کے نمبر پر فون ملاتی رہی مگر فون انگیج ملتا رہا۔ شاید شکیل نے ریسیور نیچے رکھ دیا تھا۔ شکیل کے آنے تک سومی کی جان سولی پہ اٹکی رہی۔ رات دو بجے کے قریب شکیل آیا اور سیدھا اوپر والے کمرے میں چلا گیا۔ سومی اس کی راہ تک رہی تھی۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ سومی نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور اوپر والے کمرے کی طرف چل پڑی۔ جونہی وہ کمرے میں داخل ہوئی شکیل نے اسے دبوچ لیا۔ سومی کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

''ناراض ہو مجھ سے؟''

''ہاں بہت زیادہ۔''

''میرا مطلب وہ نہیں تھا۔''

''ہاں جو میں سمجھ رہا تھا.............. یہی کہنا چاہتی ہو نا تم.......... ایک بات کان کھول کر سن لو.......... آج کے بعد کبھی مجھ پر شک کیا تو ہمیشہ کے لیے تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔'' سومی نے یکدم شکیل کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''اگر تم نے کبھی مجھے چھوڑ کر جانے کی بات کی تو میں جیتے جی مر جاؤں گی۔''

''آؤ.......... میرے پاس آ جاؤ.......... میرے ساتھ لگ جاؤ..........'' شکیل نے بازو وا کر دیئے۔

سومی تڑپ کر شکیل سے لپٹ گئی۔ طوفان ابھرا' چھایا اور تھم گیا۔ کالی راتوں میں ایک اور رات کا اضافہ ہو گیا۔

☆..........☆..........☆

نبیل کو اسلامک سنٹر میں بیٹھے ہوئے آدھی رات سے زیادہ ہو چکی تھی۔ وہ باریش بزرگ (جن کا نام محمد علی تھا) کے پاس ان کے حجرے میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے اندر ایمان کی شمعیں جلوہ افروز ہو رہی تھیں۔ اسے ان باتوں کا پتہ چل رہا تھا جو بات کسی نے بھی آج تک اسے نہیں بتائی تھی۔ اس نے دل میں پکا عہد کر لیا تھا کہ آج کے بعد شراب نہیں پئے گا۔ کسی نشے کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ انگلش میں لکھی ہوئی احادیث کی کتاب محمد علی نے اسے تحفے میں دی تھی۔ وہ جب وہاں سے اٹھ رہا تھا تو بہت خوش تھا۔ اسے یہ دنیا نئی نظر آ رہی تھی۔ دنیا تو پہلے بھی یہی تھی مگر اب اس کے اندر کا انسان بدل گیا تھا۔

''بابا جان! میں خود کو بہت پُرسکون فیل کر رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے جیسے میرے اندر کوئی تبدیلی آ رہی ہے۔'' نبیل محمد علی کو بابا جان کہنے لگا تھا۔

محمد علی مسکرانے لگے پھر اپنی سفید پگڑی درست کرتے ہوئے بولے۔ ''دیکھو بیٹا نبیل! چیزوں کا بننا کوئی بڑی بات نہیں ہے.......... انسان کا بننا سب سے بڑی بات ہے۔ مثال کے طور پر ایک آدمی بہت اپ ٹو ڈیٹ ہے۔ بہت صاف ستھرا ہے قیمتی کپڑے پہنے ہوئے ہے بہت قیمتی گاڑی کے اندر بیٹھا ہوا ہے۔ مگر اس آدمی کا باطن گندا ہے وہ آدمی شہر کا سب سے بڑا چور ہے۔ تم اس آدمی کے بارے میں کیا رائے قائم کرو گے۔

اس کی قیمتی اشیاء کی کیا وقعت رہے گی تمہاری نظر میں.........بس بیٹا یہ دنیا' یہ دنیاوی مال و دولت سب دھوکے کی چیزیں ہیں۔ یہ سب ضرورت کی چیزیں ہیں مقصد نہیں ہیں۔ مقصد چیزوں کا بننا نہیں بلکہ انسان کا اچھا بن جانا ہے۔ انسان کا انسان بن جانا ہی انسانیت کی معراج ہے۔''

نبیل کے سینے میں جیسے روشنی بھرتی چلی جارہی تھی۔ ساری غلاظتیں' ساری گندگی ڈھلتی چلی جارہی تھی۔ ساون برسنے کے بعد پیڑ صاف ستھرے ہو گئے تھے۔ جب نبیل وہاں سے رخصت ہوا تو اس کا دل تشکر کے جذبات سے بھرا ہوا تھا۔ جب نبیل گھر پہنچا تو باہر والا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے کی طرف ہولیا۔ احادیث کی کتاب اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے بالکونی کی طرف دیکھا تو شکیل اور سومی اوپر والے کمرے سے نکل رہے تھے اسے ان کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اس نے زیادہ نوٹس نہ لیا اور اپنے کمرے کی طرف ہولیا۔ پھر وہ یکدم ٹھٹھک کر رکا اسے یاد آیا اس کی ماں نے کہا تھا میں تمہارا انتظار کروں گی۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا تو انوری بیگم آرام کرسی پر بیٹھے سوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی گھلنے لگی۔ وہ آرام سے دروازہ بھیڑ کر باہر چلا آیا۔ اسے پتہ تھا ماں نے اس کے ساتھ کیا بات کرنی ہے۔ وہ ماں کی بات نہیں مان سکتا تھا اس لیے ماں کا سامنا کرنے سے کنی کترا رہا تھا۔ وہ ماں کو خوش بھی دیکھنا چاہتا تھا اور اپنی بھی منوانا چاہتا تھا۔ وہ ساری رات حدیث کی کتاب پڑھتا رہا۔ اس نے وہ گھڑی خرید کر باندھ لی تھی جس میں اذان کی آواز آتی تھی۔ ساڑھے چار کا وقت ہوا تو اذان کی آواز آنے لگی۔ نبیل اٹھا واش روم سے وضو کیا اور مصلے پر کھڑا ہو گیا۔ ساری نماز میں اس کی آنکھیں بھیگتی رہیں اور وہ اپنے گناہوں پہ توبہ کرتا رہا۔ کیسی کیسی کالی راتیں اس نے عشرت کدوں میں گزاری تھیں۔ ایک ایک رات یاد آتی رہی اور اسے خود سے نفرت محسوس ہوتی رہی۔ اسے خود سے گھن آتی رہی۔ صبح صبح وہ خود ہی مائیکرو ویو میں کھانا گرم کر کے ناشتہ کر کے گھر سے نکل گیا۔ وہ ماں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سب سے پہلے رات کو لکھا ہوا خط پوسٹ کیا۔ چند منٹ اسلامک سنٹر رکا اور پھر دفتر چلا گیا۔ اسے کئی دفعہ کان میں سرگوشی سنائی دیتی تھی۔ ''نبیل'' وہ آواز پروین کی ہوتی تھی۔ تب اسے پروین کی یاد ستانے لگتی تھی۔ گاؤں میں گزرا ہوا ایک ایک پل آنکھوں میں رقصاں ہو جاتا تھا۔ باتیں' وہ یادیں' وہ جگہیں ذہن میں تازہ ہو جاتی تھیں۔ سیٹ پر بیٹھے ہوئے اب بھی یہی ہوا تھا اس کے کان میں سرگوشی گونجی تھی اور وہ تلملا کے رہ گیا تھا۔ پروین جیسے اسے بلاتی تھی.........اور اس کے ساتھ ساتھ اور بھی کوئی اسے بلاتا تھا وہ اور پتہ نہیں کون تھا؟ وہ یہ کبھی نہ جان سکا وہ اور.........پھوپھی تھی' پھوپھا تھا' گاؤں کے دوسرے لوگ تھے۔ گاؤں کی مٹی' گاؤں کی فضائیں تھیں یا.........چابی والا وہ کھلونا تھا۔ جس کی شبیہہ اکثر اوقات اس کی آنکھوں میں لہراتی تھی' چھیڑتی تھی' اسے تنگ کرتی تھی۔ جیسے کہتی تھی میں تمہارا کھویا ہوا کھلونا ہوں۔ مجھے ڈھونڈ کر تو دکھاؤ.........دیکھو میں تمہیں کہاں ملتا ہوں۔ میں تمہارے انتظار میں ہوں۔ آؤ مجھے پالو میں کچی زمین پر پڑا ہوں' دھول سے اٹی ہوئی زمین پر.........میرے ارد گرد انسانوں کا سیلاب ہے۔ میرے اوپر دھول پڑی ہے اس دھول اس گرد میں کچے آموں اور ہری مرچی کی باس ہے۔ مکئی کے سٹوں' گنک کے ہرے دانوں کی مٹھاس ہے۔ اس فضا میں اپلوں کے جلنے اور تیل کی بو رچی ہے۔ میں تمہارے انتظار میں ہوں.........انتظار میں ہوں۔''

یکدم فون کی گھنٹی بجی تو نبیل چونکا۔ ریسیور اٹھایا تو انوری بیگم بول رہی تھی۔ ''میرے سے ملے بنا ہی دفتر چلے آئے؟''

''ماں! دفتر میں ضروری کام تھا۔'' نبیل نے بہانہ تراشا۔

''میری بات زیادہ ضروری ہے۔''

''اچھا رات کو کرلیں گے۔''

''نہیں رات کو نہیں ابھی کرنی ہے مجھے تم سے۔''

''مگر ماما! یہاں دفتر میں ہوتے ہوئے فون پر اتنی لمبی بات نہیں کرسکتا میں آپ سے۔'' نبیل روہانسا ہو کر بولا۔

''پھر گھر چلے آؤ۔''

''وہ تو رات کو آؤں گا۔''

''ابھی اسی وقت چلے آؤ۔''

''ماں یہ ممکن نہیں ہے۔''

''کیوں ممکن نہیں ہے؟''

''ابھی نئی نئی جاب ہے یہ مناسب نہیں ہے۔''

''اچھا میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ جونہی دفتر سے فارغ ہو تو سیدھا گھر چلے آنا۔'' انوری بیگم نے جواب کا انتظار کیے بغیر فون بند کر دیا۔

نبیل سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ پریشانی اور گھبراہٹ زیادہ ہو تو دماغ بھی کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ بار بار وہی پریشانی والی سوچیں اٹھتی ہیں۔ آنے والے وقت سے خوف دلاتی سوچیں.......... جو سوچ و سمجھ مفلوج کر کے رکھ دیتی ہیں۔ پریشانی زیادہ ہو تو دماغ پر چھا جاتی ہے اور پھر اس سے ناامیدی جنم لیتی ہے۔ جب ناامیدی جنم لیتی ہے تو دنیا بیکار، فضول اور دکھوں کا گھر لگنے لگتی ہے۔ پھر ''زندگی کیا ہے غم کا دریا ہے'' والا جملہ ذہن میں ابھرتا ہے مگر ناامید انسان یہ بھلا بیٹھتا ہے کہ خوشی اور غم زندگی کے دو جز ہیں۔ غم اور تکلیف آتی ہے تو یہ خوشی اور راحت ملنے کی نوید ہوتی ہے۔ خوشی اور غم ایسے دو دریا ہیں جن کو عبور کرتے، غوطے کھاتے زندگی گزر جاتی ہے زندگی کا تو کام ہی گزرنا ہے۔

☆..........☆..........☆

بھینسوں کو چارہ ڈال کر دین محمد کا حقہ تازہ کر کے باورچی خانے میں سارے برتن سمیٹ کر جب خاموش خاموش پروین اوپر اپنے کمرے میں گئی تو جنت بی بی اسی تاڑ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں پھلانگتی اس کے پیچھے ہولی۔ اس نے دروازے پہ دستک دی تو پروین بولی۔

''کون ہے؟''

''پتر! میں ہوں دروازہ کھول۔'' جنت بی بی نے تھکی اور بوجھل آواز میں کہا۔

پروین نے جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ ''ماں! کیا بات ہے خیر تو ہے نا؟''

''ہاں پتر! خیر ہی ہے۔'' جنت بی بی پرانی طرز کے پائیوں والے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

پروین پلنگ پہ بکھری کتابیں سمیٹنے لگی۔ جنت بی بی کتنی دیر بازوزانوں پر رکھے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی۔ پروین کو تشویش ہونے لگی۔ اسے محسوس ہونے لگا جیسے ماں کوئی بڑی اہم بات کرنا چاہتی ہے۔ اس کا دل دھڑ ادھڑ دھڑ کنے لگا۔ ''ماں! کیا بات ہے؟'' پروین کی گھٹی گھٹی آواز نکلی۔

''پتر! ایک بات تو مجھے سچ سچ بتا۔''

''ہاں ماں!'' پروین کا دل بہت زور سے دھڑ کنے لگا تھا۔

''تجھے کیا ہے؟''

''مجھے.........مجھے کچھ بھی نہیں ہے۔''

''تُو پہلے ایسی نہیں تھی.........میں کافی دنوں سے دیکھ رہی ہوں تُو خاموش خاموش رہتی ہے ویسے ہنستی بولتی بھی نہیں جیسے پہلے تھی۔ میں کافی دنوں سے سوچ رہی ہوں تجھ سے بات کروں مگر موقع ہی نہیں ملتا تھا۔''

''ماں! ایسی تو کوئی بات نہیں.........مجھے بھلا کیا ہوگا؟''

''میں ماں ہوں تیری.........اپنی ماں سے چھپائے گی۔''

''سچ ماں! ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہے.........بس ایسے ہی خاموش رہتی ہوں۔'' پروین کی ٹوٹی پھوٹی آواز ابھری۔ اس کے اندر بڑی سخت توڑ پھوڑ ہو رہی تھی۔ پہلی دفعہ اس کی دکھتی رگ پر کسی نے ہاتھ رکھا تھا۔ اس کی آنکھوں کے اندر بہت اندر.........آنسوؤں کا ایک سیلاب اُمڈ کر آیا تھا۔ اس سیلاب کے بند پر ہمدردی کی ہلکی سی ایک ٹھوکر لگی تھی۔ اب وہ سیلاب آنکھوں کے رستے بہہ نکلنا چاہتا تھا۔ ہر رکاوٹ ہر مصلحت کا رستہ کاٹ دینا چاہتا تھا مگر اس نے احترام کا پتھر اس کے آگے رکھ کر بند باندھ دیا تھا۔ ہلکی ہلکی نمی آنکھوں میں اتری تو اس نے اسے آنکھوں کے کٹوروں میں ہی جذب کر لیا۔ آنکھیں سرخی میں جلنے لگی تھیں۔

''آسو کی شادی ہو رہی ہے۔''

''کب ماں؟'' پروین تیزی سے بولی۔

''شاہ مدین کے میلے کے بعد کتے کی دس تاریخ پڑی ہے۔''

''آسو کی شادی پہ میں نیا سوٹ سلواؤں گی۔'' اندر کی تلخی اور غم کو چھپانے کے لیے پروین بولی۔

''میری دھی جیسا سوٹ کہے گی میں بنوا کر دوں گی.........آسو بھی اپنے گھر والی ہو جائے گی۔'' جنت بی بی کسی خیال میں کھوتے ہوئے بولی۔''وہ بھی اپنے ماں پیو کو چھوڑ کر چلی جائے گی۔''

''ماں! میں تجھے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ تیرے پاس ہی رہوں گی۔'' پروین جنت بی بی کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

''تو کیوں میرے پاس رہے گی؟'' جنت بی بی مسکراتے ہوئے تیوری ڈال کر بولی۔

''میں شادی ہی نہیں کروں گی ماں!'' پروین جیسے خیالوں میں بولی۔

''نمیں سوہنی دھیئے! ایسی بات نہیں کرتے.........یہ اپنا گھر تھوڑی ہوتا ہے۔ اپنے گھر والے کا گھر اپنا ہوتا ہے۔ میں اپنی دھی کے لیے سوہنا دولہا ڈھونڈوں گی.........بالکل چن کی طرح۔'' مکئی کے کھیتوں سے پرے آم کے رُکھوں سے اوپر چمکتے ہوئے چاند کی طرف جنت بی بی اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''ماں چن کی طرح کا مل سکتا ہے چن تو نہیں مل سکتا ناں۔'' پروین بے خودی میں بولی۔

جنت بی بی نے تڑپ کر پروین کی طرف دیکھا۔''پینو! تو کسی کو چاہنے تو نہیں لگی؟''

''ہاں ماں! میں چاہنے لگی ہوں۔''

''کس کو؟'' جنت بی بی دکھی لہجے میں بولی۔

''بھوری بھینس کو۔'' پروین قہقہہ مارتے ہوئے بولی۔''وہی بھوری بھینس جس کو بیچنے پر میں نے ابا سے لڑائی مول لی تھی۔''

جنت بی بی نے سکھ کا سانس لیا۔''پتر! کسی چیز کی چاہت کرنا بُری بات نہیں.........مگر بندہ چاہت ایسی کرے جو اس کی دسترس میں ہو.........اس کی پہنچ میں ہو۔ زمین پر بیٹھ کر چاند کی چاہت کرنے والے کو لوگ پاگل و دیوانہ کہتے ہیں۔'' جنت بی بی پروین کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

''میں جانتی ہوں! ماں'' پروین آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی۔

''شوکے کو دیکھا ہے تو نے؟'' جنت بی بی پروین کو پاؤں میں بٹھا کر اس کی چٹیا درست کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں کیا ہوا اسے؟''

''کیسا ہے وہ؟''

''ٹھیک ہے اس کو کیا ہوا.........؟ مگر تو اس طرح کیوں پوچھ رہی ہے؟''

''اس کی ماں نے رشتہ مانگا ہے۔'' جنت بی بی چٹیا کو بل دیتے ہوئے بولی۔

''کس کا رشتہ؟'' پروین بالوں کی ایک مہین لٹ کر سر پر جماتے ہوئے بولی۔

''تیرا رشتہ اپنے بیٹے شوکے کے لیے۔ بڑا بانکا سجیلا لڑکا ہے۔ پورے بھٹے کا اکیلا وارث ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے گاؤں کا ہے۔''

آنسو پروین کی آنکھوں سے قطار اندر قطار بہنے لگے۔ وہ ہچکیوں کی صورت میں رونے لگی تھی۔ ماں کے قدموں سے اٹھ کر پلنگ کے پائے سے جا لگی تھی۔ جنت بی بی اس کی ایسی حالت دیکھ کر یکدم پریشان ہوگئی۔ تیزی سے اٹھ کر اس کے پاس پہنچی اس کا چہرہ اپنی طرف کر کے بولی۔

''پروین کیا ہے تو رو کیوں رہی ہے؟''

پروین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''میری بیٹی! میری بات سن.......... میں تو ایسے ہی تیرے سے بات کر رہی تھی۔ دیکھ ان لوگوں نے رشتہ ہی پوچھا ہے نا ہم لوگوں نے کون سی ہاں کر دی ہے۔ جن گھروں میں جوان لڑکیاں ہوں وہاں رشتے تو آتے ہی ہیں۔ تو کیوں پریشان ہوتی ہے؟ تیری مرضی کے بغیر ہم کہیں رشتہ نہیں کریں گے۔ چل میری پتری آنسو صاف کر.......... ایسے بچوں کی طرح نہیں روتے۔'' جنت بی بی پروین کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولی۔

''چل اب سو جا میں نیچے جاتی ہوں۔ تھوڑے دنوں میں تیرے بھائی بھی آنے والے ہیں۔'' جنت بی بی جب سیڑھیاں اتر کر نیچے گئی تو پروین کنڈی لگانے کے لیے دروازے کے پاس آئی۔ دور جوار اور باجرے کے کھیتوں کے اوپر پورے دنوں کا چاند تھال کی مانند دکھ رہا تھا۔ کھیتوں کھلیانوں میں ہر سو چاندنی بکھری ہوئی تھی۔ مکئی کے کھیتوں کے درمیان سے نکلتی ہوئی پگڈنڈی چاند کی روشنی سے صاف دکھ رہی تھی۔ ایک وٹ کی دوسری طرف کھالے میں ٹیوب ویل کا پانی جھاگ اڑاتا ہوا مکئی کے کھیتوں کو سیراب کر رہا تھا۔ پروین نے دروازہ بند کر دیا۔ اسے چاند کے بارے میں سوچنے اور اسے دیکھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے ہوئے گزر گئی' پروین کو نیند نہیں آئی۔ وہ سونا چاہتی بھی تو نیند نہیں آتی۔ پہلے نبیل کا غم ہی کیا کم تھا کہ اب اس کے رشتے بھی آنے لگے تھے۔ کیا وہ گھر والوں کے لیے بوجھ ہوگئی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔ اس کے لیے زندگی میں ایک مرد ہی بنا تھا اور اس کا نام تھا نبیل.......... پتہ نہیں نبیل اس کے لیے تھا یا نہیں۔''

''نبیل! نبیل! خدا کے لیے واپس آجاؤ.......... خدا کے لیے۔'' اس نے سرگوشی کی۔ کئی آنسو آنکھوں سے بہتے ہوئے تکیے میں جذب ہوگئے۔ وہ بیڈ پہ تھوڑا پرے ہو کر لیٹ گئی۔ بیڈ پہ کافی جگہ خالی ہوگئی۔ وہ دھیرے دھیرے بیڈ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ یہ جگہ نبیل کے لیے تھی۔ یہاں کوئی اور کیسے لیٹ سکتا تھا؟ یہاں صرف نبیل لیٹ سکتا تھا۔

''نبیل اٹھو.......... اٹھو دیکھو صبح ہوگئی ہے۔ دیکھو میاں جی اذان دے رہے ہیں۔ نماز کا ویلہ نکلا جاتا ہے۔ ماں دودھ بلو رہی ہوگی یا آٹا پیس رہی ہوگی۔'' وہ عجیب بے خودی میں بڑبڑائی۔ وہ ساری رات ہی غم غنودگی میں رہی تھی۔

کوئی جواب نہیں آیا تو پروین اٹھ بیٹھی۔ بے ترتیب کپڑوں کو درست کیا' گریبان کے بٹن بند کیے' چنری کو سختی سے چہرے کے گرد لپیٹا، سینے پہ پھیلایا اور مٹی سے پوتی سیڑھیوں سے اتر کر ہینڈ پمپ سے وضو کرنے لگی۔ کھلے کچے صحن میں جا بجا برگد کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ پروین برگد کے نیچے بنے ہوئے پتھر کے مصلے پر ہی نماز پڑھنے لگی۔ نماز کے بعد اس نے بڑی دعا مانگی۔ دعا سے فراغت کے بعد اس نے جھاڑو اٹھایا اور پورے صحن میں دینے لگی۔ اس نے جھاڑو کی مدد سے پورے کچے صحن میں جا بجا لائنیں کھینچ دیں۔ ہینڈ پمپ کے کھرے کو اس نے اچھی طرح صابن لگا کر دھویا۔ ساتھ واڑے پر بیٹھی بھوری بھینس پروین کو دیکھ کر ڈکارنے لگی تھی۔ وہ پروین کو پہچانتی تھی۔ یہ واحد بھینس تھی جو پروین نے ضد کر کے گھر

میں رکھوائی ہوئی تھی جبکہ باقی پانچ بھینس ڈیرے پہ ہی بندھی ہوئی تھیں۔ پروین نے ساتھ ہی پڑی پٹ سن کی بوری سے ونڈ نکالا۔ اس نے ساتھ ہی چھوٹے کٹے کو چھوڑ دیا۔ وہ سیدھا بھوری کے تھنوں کی طرف لپکا اور پھدک پھدک کر دودھ پینے لگا۔ پروین باورچی خانے سے دودھ کے لیے برتن لینے چلی گئی۔

''اٹھ گئی بیٹی..........صبح ہی صبح سارے صحن میں جھاڑو بھی دے دیا جیسے کوئی مہمان آنے والا ہو آج۔''

''ہاں ماں! میرا دل کہتا ہے آج کوئی آئے گا۔'' پروین دودھ والا ڈول اٹھاتے ہوئے بولی۔

''مہمان تو رب کی رحمت ہوتے ہیں۔''

''ہاں ماں! رب کی رحمت ہوتے ہیں۔'' پروین نے ماں کا فقرہ دہرایا اور ڈول لے کر باہر نکل گئی۔ پروین وہاں پہنچی تو کٹا دیوانہ وار دودھ پی رہا تھا۔ پروین نے اسے دھکیل کر پرے کیا مگر وہ مڑ مڑ کر تھنوں کی طرف واپس آ رہا تھا۔ ''بس کر بہت پی لیا ہے تو نے اب ہمارے لیے بھی رہنے دے۔'' پروین اسے دھکیلتے ہوئے بولی مگر وہ نا سمجھ ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پھر اس طرف آنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ پروین نے بڑی مشکل کے ساتھ اسے کلے پر باندھا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ بھوری بھینس کے پاس آ بیٹھی۔ اسکے تھنوں کو ڈول میں لائے ہوئے پانی سے اچھی طرح دھویا۔ اس کے بعد ڈول والے پانی کو کھنگال کر اس میں دودھ کی دھاریں ڈالنی شروع کر دیں۔ اس نے سارے کاموں سے فارغ ہو کر آج آسو کے گھر جانا تھا۔ دودھ کا ڈول بھر کر جب پروین باورچی خانے میں آئی تو جنت بی بی کھانا تیار کر چکی تھی۔ اس نے کھانا لیا اور کھیتوں کی طرف چل پڑی۔ ہر طرف چاولوں کی ہراول تھی۔ دور ٹاہلی کے بوٹے پکی سڑک کا پتہ دیتے تھے۔ اسکے پیر بڑی تیزی سے کچی زمین پر پڑ رہے تھے۔ جیسے اسے بہت جلدی تھی۔ اس کے چکنے چہرے پہ پسینے کے قطرے پھیلنے لگے تھے۔ یوں دکھتا تھا جیسے ہلکے گلابی پھول پہ شبنم کے قطرے ٹھہرے ہوں۔

☆..........☆..........☆

ساون کی چبھنے والی دھوپ ہر سو پھیل چکی تھی۔ بھٹے کی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا اور فضا کو آلودہ کر رہا تھا۔ بھٹے سے پرے ایک کائی زدہ چھپڑ تھا جس میں بھینسیں بڑی خوشی خوشی نہا رہی تھیں اور ان کا ''رکھوالا'' آدھا گھاس آدھا کچی زمین پہ سر کے نیچے بازو رکھ کر چپ لیٹا تھا۔ وہ اپنے خیالوں میں مگن تھا۔ یہ ''مخلوق'' انسان بھی عجیب شئے ہے۔ ایک وقت ایک لمحے میں سینکڑوں انسان سوچ رہے ہوتے ہیں مگر ہر ایک کی سوچ الگ' خواہشات الگ' فکر اور پریشانی کا انداز الگ۔ ایک انسان اولاد کے ہاتھوں دکھی ہے تو دوسرا اولاد نہ ہونے کے ہاتھوں خون کے آنسو روتا ہے۔ ایک سائیکل نہ ملنے پر پریشان ہے تو دوسرا نئے ماڈل کی گاڑی نہ ہونے کی وجہ سے افسردہ۔ کسی کو ماں باپ کے نہ ہونے کا غم ہے تو کسی کو ماں باپ کے ہونے کا غم ہے۔

بھٹے کے اندر ایک چھپر کے نیچے پنکھا کھٹا کٹ چل رہا تھا۔ ایک منجی پر شوکا اور اس کا منہ چڑھا ملازم گوگا بیٹھے ہوئے تھے۔ شوکا گاؤں کا بڑا کڑیل جوان تھا۔ سرخ و سفید رنگ، سیاہ گھنی اور نوکدار مونچھیں، ابھرے جبڑے اور نکلتا ہوا قد۔ ناک کے عین اوپر پیشانی پہ دو لکیروں کے درمیان

اکثر اس کا ماس ابھرا رہتا تھا۔ غصے یا سوچ کے عالم میں یہ ماس زیادہ ابھر آتا تھا۔ لکیریں گہرائی میں کہیں چلی جاتی تھیں۔ اس کے برعکس ہر وقت اس کے ساتھ رہنے والا ملازم گوگا گندمی رنگت اور ٹھگنے قد کا مالک تھا۔ دونوں کو ایک ساتھ چلتے دیکھ کر اونٹ اور بھیڑ کا گمان ہوتا تھا۔ شوکے کا والد سراج عرصہ ہوا فوت ہو چکا تھا۔ شوکے کی ماں بچپن میں ہی اسے اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ مختلف لوگوں کے مختلف خیالات تھے۔ کوئی کہتا تھا وہ دیوانی ہو گئی تھی۔ کسی طرف نکل گئی اور آج تک نہیں آئی۔ کسی کا خیال تھا کہ وہ دیوانگی کے عالم میں کسی کنویں میں گر کر ختم ہو گئی۔ کسی کی رائے تھی کہ وہ گاؤں چھوڑ کر شہر آباد ہو گئی تھی۔ کچھ لوگ دبے دبے لفظوں میں یہ بھی کہتے تھے کہ اس کا کسی کے ساتھ چکر تھا وہ اسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ یہ سب قیاس تھے اصل حقیقت حال آج تک کوئی بھی نہ جان سکا تھا۔ شوکے کی زندگی میں ماں کا بڑا خلا تھا۔ وہ دن رات اسی غم میں گھلتا تھا کہ اس کی ماں کدھر چلی گئی۔ آج تک اس کا پتہ کیوں نہیں چلا۔ اسے اپنی ماں کا چہرہ بھی ٹھیک طرح یاد نہ تھا۔ جن بچوں کے ساتھ ایسا سانحہ ہوتا ہے وہ ادھورے ہوتے ہیں.........شخصیت کے ادھورے.........وہ دن رات ماں کی شکل کے خاکے ذہن میں بناتا تھا اور مٹاتا تھا۔

''اوئے گوگے! ویاہ کی کون سی تاریخ پڑی ہے تیری؟''

''کتے کی دس تاریخ جی۔''

''تیاری شیاری ہے نا تیری؟''

''ہاں جی بالکل.........سارا سمیان تیار ہے۔''

''اوئے عقل کے گھوڑے.........تیری بھی تیاری ہے نا؟''

کچھ دیر تو وہ شوکے کی بات پہ غور کرتا رہا۔ پھر کھسیانی ہنس کر بولا۔ ''چھوٹے صاحب جی! کوئی ایسی ویسی تیاری.........میں.........''

''بس.........بس مجھے پتہ ہے تو.........اپنے آپ میں بڑی شئے ہے۔'' شوکے نے کھنگورا مار کر گلا صاف کیا۔ پھر سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دباتے ہوئے بولا۔ ''ویسے شادی تو تیری پسند کی ہے نا؟''

''لو ہور سنو جی! آسوکے ابے کی پیلی کے چکر لگا لگا کر تو میری جتی گھس گئی ہے اور آپ پوچھتے ہو پسند کی ہے یا نہیں۔''

''اچھا اٹھ جا ذرا۔ بندوں کو دبکا لگا کر آ کام میں سستی دکھا رہے ہیں۔'' گوگا اٹھا اور اس طرف چل پڑا جہاں کئی درجن مرد و زن کام میں مصروف تھے۔ پانچ چھ بندے چکنی مٹی کو پیروں سے گور رہے تھے۔ ایک بندہ پانی لا کر مٹی میں ڈال رہا تھا۔ کچھ مزدور ''گوئی'' ہوئی مٹی سے ٹپے بھر بھر کر لکڑی کے سانچے میں ڈال رہے تھے۔ اس سے آگے سانچے کو الٹا کر خالی کرنے والے مزدور تھے۔ مزدور جونہی سانچے کو الٹاتے آٹھ کچی اینٹیں سانچے سے باہر نکل آتیں۔ پھر ان کچی اینٹوں کو بڑی احتیاط اور کاریگری سے اس انداز سے اوپر نیچے جوڑ دیا جاتا کہ ان کو ہر طرف سے دھوپ اور ہوا لگتی رہے۔ پھر سانچے کے اندر ریت ڈال کر اسے پھر سے الٹا دیا جاتا۔ ریت اس لیے ڈالی جاتی تھی کہ چکنی مٹی سانچے کے اندر ہی نہ چپک جائے۔ تمام مزدور بڑی تندہی سے کام میں مصروف تھے۔ ان میں زیادہ تر سیاہ جثوں اور سوکھی چمڑی والے تھے۔ برسوں کی مشقت نے ان کی کمریں جھکا دی تھیں۔ وہ زندگی کو دھکا لگاتے لگاتے جھک گئے تھے۔ ان کی پیٹ اندر کی طرف دھنسے ہوئے تھے۔ ان کی عورتوں کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔ ان کے

ننگ دھڑنگ بچے بھٹے کی چمنی سے پرے ایک اونچی جگہ جسے ''ٹھیا'' کہا جاتا ہے پر بیٹھے کھیل رہے تھے۔ ان کے کھلونے وہ ٹھیکریاں اور پتھر تھے جو ٹھیے پہ جابجا پھیلے ہوئے تھے۔ کوئی کسی رنگ کا تھا کوئی کسی کا۔ کسی کی ہیئت کسی طرح کی تھی کسی کی اور طرح کی۔ امیر بچوں کے کھلونے ٹوٹ جائیں تو بے کار، ان کے لیے ٹوٹے ہوئے کارآمد.......... مٹی کے برتنوں کی ٹوٹی ہوئی ٹھیکریاں اور ٹھیے کی زمین سے نکلنے والے پتھر ہی ان معصوموں کے لیے دنیا کی حسین ترین چیزیں تھے۔

گوگے کو اپنی طرف آتا دیکھ کر تمام مزدوروں کے ہاتھ پہلے سے زیادہ تیزی سے اپنے کاموں میں چلنے لگے۔

''اوئے ہڈحرامو! ایک دن حقہ پانی بند کیا نا.......... تو ساری سستی دور ہو جائے گی۔ یہ سب رج کھانے کی مستیاں ہیں' تم لوگوں پر چربی چڑھتی جا رہی ہے۔ تم لوگ بھوکے رہو تو زیادہ کام کرتے ہو۔ روٹی رج کے مل جائے تو تمہیں خرمستیاں چڑھ جاتی ہیں۔ اوئے نمک حرامو کوئی بتائے کیا تم لوگوں کو دانا پانی' اناج نہیں ملتا پھر کیوں اپنی ماں' بہین ایک کرواتے ہو۔ کان کھول کے سن لو جسے میں نے سستی کرتے ہوئے پکڑ لیا اس کا حشر کر دوں گا۔''

سب سر جھکائے تیزی سے کام میں جت گئے۔ مٹی گوندنے والے تیزی سے پیر چلانے لگے۔ اینٹیں گوندنے والے' سانچہ بھرنے والے' کچی اینٹیں جوڑنے والے سب میں ہی ایک دم سے پھرتی آ گئی تھی۔ گوگا چند منٹ وہاں چکر لگاتا رہا۔ پھر شوکے کی طرف ہو لیا۔

''چھوٹے صاحب جی! سب کے کان کھول کر آیا ہوں۔ حرامی آپس میں باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔''

''نیچے بھی دھیان مارآنا تھا اینڈ حسن ٹھیک چل رہا ہے نا؟'' شوکا ٹانگ پہ ٹانگ دھرتے ہوئے بولا۔

''وہ میں پہلے ہی دھیان مار آیا تھا۔'' گوگا شوکے کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''تجھے شادی کے لیے کتنی چھٹیاں چاہئیں۔ میرا مطلب ہے یہاں سے کتنے دن غائب رہے گا؟'' شوکا کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''او جی! آپ ہمارے وڈے ہو، کہیں گے تو شادی والے دن بھی آپ کے قدموں میں چلا آؤں گا۔''

''اوئے۔ اوئے نہیں رہنے دے.......... ایسے ڈیلگ نہ مارا کر آسو کے ابے کے کھیت کے چکر لگاتے لگاتے تیری جتی گھس گئی تھی۔ اب میں اتنا بھی ظالم نہیں کہ تجھے پنج ست چھٹیاں بھی نہ دوں۔''

''شکریہ صاحب جی! یہ بندہ تو آپ کا غلام ہے۔''

''میری غلامی چھوڑ اب اپنی عورت کی غلامی کرنے کی تیاری کر۔''

''ہاں صاحب جی! جب شادی اپنی پسند کی ہو تو پھر غلامی بھی کرنی پڑتی ہے۔''

''اوئے رہنے دے اوئے!'' شوکا سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا ''عورت.......... عورت ہی ہوتی ہے.......... تو اسے دیوتا نہ بنا۔''

''او جی! میں دیوتا کب بنا رہاں؟ میں تو پسند کی بات کر رہا تھا۔''

''اور پھر بیچ میں یہ غلامی کہاں سے آ گئی؟''

''وہ آپ نے کہا تھا نا کہ اب عورت کی غلامی کی تیاری کر۔''

''وہ تو تیرا امتحان لیا تھا.........کھوتے کے کھر۔''

''اور میں.........امتحان میں پھیل ہو گیا۔''

''ہاں بہت بری طرح فیل ہو گیا ہے تو.....اب کان کھول کے سن پہلے دن سے ہی اس پر اپنا دبکار رکھنا جیسے ان مزدوروں پر رکھتا ہے۔''

''پر وہ میری بیوی ہے جی.........اور یہ کمی مزدور۔''

''اوئے عورت بھی ایک طرح کی کمی ہوتی ہے۔ اب دیکھ وہ تیرا کپڑا لتا دھوئے گی......... ہانڈی پکائے گی' تیری ٹانگیں دبائے گی.........تیرے بچے جنے گی.........ان کی رکھوالی' ان کی دیکھ بھال کرے گی.....اور عورت کا کیا کام ہوتا ہے؟''

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے! چھوٹے صاحب جی۔ پر.........'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے معلوم تھا کہ شوکے کی بات کی نفی کروں گا تو وہ بگڑ جائے گا۔'' صاحب جی! چھڈو ان باتوں کو......... یہ بتاؤ......... آپ کب شادی کرواؤ گے۔''

''اوئے ابھی بڑا ٹیم پڑا ہوا ہے۔''

''کوئی کڑی شڑی بھی تاڑی ہوئی ہے۔ میرا مطلب ہے بیوی بنانے کے لیے۔''

شوکے نے گوگے کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو وہ پھر سے بولا۔'' چھوٹے صاحب جی! گاؤں میں ایک ہی کڑی ہے جو آپ کے ساتھ جچے گی۔''

''کس کڑی کی بات کر رہا ہے تو؟''

''صاحب جی! آپ کو نہیں پتہ ایک ہی تو ہے.........ساروں سے وکھری.........چاچے دین محمد کی کڑی.........''

''تو پینو کی بات کر رہا ہے۔''

''ہاں جی پینو......... بارہ جماعتیں پڑھی ہے۔ پورے گاؤں بلکہ آس پاس کے گاؤں میں اس جیسی کوئی نہیں ہے۔''

''کیا ہے اس میں جو اس جیسی کوئی نہیں؟''

''گیندے کا پھول ہے جی.........'' گوگا ایسے تعریفیں کر رہا تھا جیسے شوکے نے اسے دیکھا نہ ہو۔

شوکا انجان بنتے ہوئے بولا۔'' طبیعت کی کیسی ہے؟''

''کچھ نہ پوچھو جی! رب ہر کسی کو ایسی بھین ایسی بیٹی دے۔ سوں رب دی ٹاہلی کی ٹھنڈی ہوا ہے جی۔''

''تیرا خیال ہے کہ میرا رشتہ وہاں ہونا چاہیے؟''

''ایسا ہو گیا تو آپ کی زندگی سدھر جائے گی جی۔''

''تیرا مطلب ہے کہ میری زندگی سدھری ہوئی نہیں ہے؟''

''نا.........جی نا.........میرا مطلب یہ بالکل نہیں تھا۔ میرا مطلب تھا کہ اور سدھر جائے گی۔''

''اس کے دو بھائی بھی تو ہیں وہ آج کل کدھر ہوتے ہیں؟''

''لہور شہر میں ہوتے ہیں جی.........وہاں بڑے باؤ شاؤ بن گئے ہیں۔''

شوکا باتوں کا چسکا لے رہا تھا۔ ساری باتیں اسے پہلے سے ہی معلوم تھیں اور وہ کسی بندے کو بیچ میں ڈال کر رشتے کی بات چاچے حیات تک پہنچا چکا تھا اور ابھی جواب کا منتظر تھا۔

''گوگے! سنا ہے آسو پینو کی بڑی پکی سہیلی ہے؟''

''ہاں جی ایک جند جان ہیں.........اکٹھی کھیلتی' اکٹھی باتیں کرتیں' اکٹھی رسے ٹپتی ہیں جی۔''

''تو نے رسا ٹپتے دیکھا ہے.........ان کو۔'' شوکا دلچسپی سے بولا۔

''ہاں جی.........کیا بات ہے.........؟ ایسے لگتا ہے اپنا دل بھی ساتھ ساتھ اچھل رہا ہے۔''

''تیرا دل بھی اچھلتا ہے؟''

''ہاں جی.........انسان ہوں.........کبھی کبھی تو بہت ہی اچھلتا ہے۔''

''اسی لیے شادی کروا رہا ہے ناں.........؟ اچھلنا بند کر دے گا۔''

''ہو سکتا ہے صاحب جی! زیادہ ہی اچھلنے لگے۔''

''ہاں تیرا تو زیادہ ہی اچھلے گا.........بہت بڑا خبیث جو ہوا تو.........'' شوکا قہقہہ مارتے ہوئے بولا۔

گوگا بھی اپنی باریک آواز میں قہقہے مارنے لگا۔

☆.........☆.........☆

گاؤں سے جنوب کی طرف چاچے حیات کے ڈیرے سے پرے بشیر کمہار کی آوی تھی۔ وہ چھپر کے نیچے بیٹھا گھڑوں' جھجھروں اور چاٹیوں کے اوپر برکائن کی باریک لچکدار ٹہنی کے ساتھ نقش و نگار بنا رہا تھا۔ ساون کی تیز دھوپ چھپر سے باہر ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ بڑی مہارت اور چابکدستی سے چل رہے تھے۔ اس کے سامنے مٹی کی دو چھوٹی چھوٹی کولیاں پڑی ہوئیں تھیں۔ ایک میں کالا رنگ تھا' ایک میں سبز۔ وہ ایک بوٹا کالے رنگ کا بناتا تو دوسرا سبز رنگ کا۔ کالے اور سبز رنگ میں بڑا خوبصورت امتزاج تھا۔

بشیر کمہار کے چھپر سے ذرا ہٹ کر ماجھے لوہار کی ہٹی تھی وہاں سے لوہا کوٹنے کی آواز آرہی تھی۔ دور سے کنویں کی کوکو سنائی دے رہی تھی۔ لوہا کوٹنے کی دھم دھم اور کنویں کی کوکو.........آپس میں مکس ہوگئی تھیں۔ یہ مکس اپ تقریباً روزانہ ہوتا تھا۔ اس دوران بشیر تھوڑا استانے کے لیے

چھپر کے بانس کے ساتھ ٹیک لگا لیتا تھا۔ صافہ اتار کر جھولی میں رکھ لیتا تھا اور اپنی بیٹی خدیجہ کو آواز دیتا تھا۔ ''خدیجہ پتر! مجھے پانی پلا دے اور پھر گھر کے اندر خدیجہ بھاگی ہوئی پانی لے کر آئی تھی۔'' لے ابا پی لے۔'' خدیجہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولتی تھی۔

''پتر! تجھے کہا تھا پینو کے گھر چلی جایا کر اس سے سبق لے لیا کر.........قرآن مجید تو تو نے رب سوہنے کے حکم سے ختم کر ہی لیا ہے۔''

''ابا! مانے کو کہہ دے کہ وہ مجھے چھوڑ آیا کرے۔'' وہ اپنے بھانجے کا نام لیتے ہوئے بولی۔

''اچھا میں اسے کہہ دوں گا۔'' بشیر کمہار چند لمحے خاموش رہا۔ پھر صافے کو سر پہ باندھتے ہوئے بولا۔'' رب تیرے لیکھ چنگے کرے کڑیئے۔ اتنی خدمت کرتی ہے میری، رب کبھی تجھے دکھ نہ دکھاوے۔''

''سلام چاچا!'' وہ پروین تھی جو اپنی چنری درست کرتے ہوئے چھپر کے اندر داخل ہوئی تھی۔

''واہ.........واہ.........اج یہ چن میرے گھر کیسے نکل آیا ہے؟'' بشیر کمہار اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سر پہ پیار دیتے ہوئے بولا۔

''ہاں پتر! اب کا سنا۔ دو دن ہوئے اس سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ شام کو دائرے میں بھی نہیں آیا دین محمد.........طبیعت تو ٹھیک ہے نا اس کی؟''

''ہاں چاچا! ابا بالکل ٹھیک ہے۔ آج ابا کہہ بھی رہا تھا دو دن مصروفیت کچھ زیادہ تھی دائرے میں بھی نہیں جا سکا۔ یوں لگتا ہے اپنے یاروں کو دیکھے ہوئے کئی ورے بیت گئے ہیں۔'' تو ماں کہنے لگی۔'' دو دن ہوئے آپ دائرے نہیں گئے تو آپ کو کئی وروں کی طرح لگ رہا ہے اگر ایک ہفتہ نہ جائیں تو شاید منجی سے ہی نہ اٹھ سکیں۔''

''سو رب دیاں رکھاں ساڈھے یار نوں.........وہ ہمارا جگر جانی ہے.........ہمارے جسم کا ٹکڑا ہے وہ.........ہم کو بھی یوں لگتا ہے جیسے سو ورے بیت گئے ہیں دین محمد کو دیکھے ہوئے۔''

''اچھا چاچا! وہ خدیجہ کدھر ہے؟'' پروین انگلی دانتوں کے نیچے دابا تی جھجکتے ہوئے بولی۔

''تو اتنا جھجک کیوں رہی ہے؟ تیرا اپنا گھر ہے۔ جا اندر چلی جا وہ اندر ہی ہے۔''

''چاچا اصل میں میں اسے لینے کے لیے آئی تھی۔''

''تو لے جا اتنا آہستہ آہستہ آرام سے کیوں بول رہی ہے.........؟ تجھے کس بات کا ڈر ہے؟''

''نہیں وہ چاچا.........آسو کے گھر جانا تھا۔''

''سوہنی دھیئے تو اسے لینے آئی ہے نا اسے جدھر مرضی لے جا مگر اپنے نال رکھیں اسے۔ تجھے پتہ ہے میں خدیجہ کو اور کسی کے ساتھ نہیں جانے دیتا۔ پر تیری بات اور ہے.........تو نیک پیو کی نیک دھی ہے۔''

تھوڑی ہی دیر بعد خدیجہ اور پروین ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آسو کے گھر کی طرف چلی جا رہی تھیں۔ خدیجہ بولی۔'' پروین! آسو کی تو سمجھ شادی ہوگئی۔ وہ اپنے گھر والی ہوگئی۔ پر تو کلی رہ جائے گی۔ تو کب شادی کر وا رہی ہے؟''

دھک سے کسی نے پروین کے دل پہ گھونسہ مارا۔'' شادی.........؟ گھر والوں کو پتا ہوگا۔'' پروین نے ٹالنے کے لیے کہا۔

''گھر میں تو بھی تو رہتی ہے ناں.......... تیری مرضی بھی تو پوچھی جائے گی ناں۔''

''میں.......... امی ابا.......... کی مرضی سے شادی کروں گی۔''

''اگر لڑکا تیری پسند کا نہ ہوا تب بھی شادی کر لو گی؟''

''ہاں اگر امی ابا اس رشتے پر خوش ہوئے تو کر لوں گی۔''

''ویسے تمہارے لیے تو کوئی شہزادہ ہی ہونا چاہیے.......... جو تم سے بیاہ کرے.......... وہ تمہیں اپنے سامنے بیٹھا کر ہر وقت تمہیں دیکھتا ہی رہے.......... دیکھتا ہی رہے۔''

''اچھا.......... اچھا بس رہنے دے.......... آسو کا گھر آ گیا ہے.......... ایسی باتیں وہاں نہ چھیڑ دینا.......... تجھے پتہ ہے وہاں لڑکیاں زیادہ ہوں گی۔ وہ چھیڑنے سے باز نہیں آئیں گی اور پھر میں وہاں سے اٹھ کر گھر واپس چلی جاؤں گی۔''

''تو شادی بیاہ سے اتنا شرماتی کیوں ہے؟ لگتا ہے تیرے بندے کو بڑی مشکل پڑے گی۔''

''اچھا اب چپ بھی کر جا.......... میری جان ہی کھائے جا رہی ہے۔''

''جان تو وہ کھائے گا جو تجھ سے شادی کرے گا۔'' وہ پروین کی وکھی میں چٹکی لیتے ہوئے بولی۔

پروین نے اس کا ہاتھ جھٹکا اور دونوں آسو کے گھر داخل ہو گئیں۔ ''لو دیکھو پینو اور خدیجہ بھی آ گئیں۔ پر آسو ابھی تک کپڑے پہن کر اندر سے نہیں نکلی۔'' کمرے میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں میں سے ایک بولی۔

''لگتا ہے گوگے کی یاد میں کھوئی ہو گی بیچاری۔'' ایک اور لڑکی نے لقمہ دیا۔

''چلو اٹھو پھر.......... اپنے اپنے گھر چلیں وہ اب اندر سے نہ نکلی۔'' تیسری لڑکی بولی تو سب کھلکھلا کر ہنس دیں۔

''آسو! آ جا باہر دیکھ گوگا تجھے ملنے کے لیے آیا ہے۔'' خدیجہ بولی تو پھر ساری لڑکیاں کھی کھی کرنے لگیں۔

''تمہارا بیڑا اتر جائے کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں کرنے دیتی ہو۔'' آسو سینے پہ پھنسی ہوئی قمیض کو نیچے کرتی ہوئی کنک والے سٹور سے باہر آ گئی۔

''اوہو.......... اب تو قمیضیں بھی تنگ ہو گئی ہیں۔ لگتا ہے سلمٰی درزن کو گھر پر ہی بلوانا پڑے گا۔'' پہلے والی لڑکی بولی تو آسو اس پر پھٹ پڑی۔

''تو بڑی تھانیدارنی ہے۔ جب تیری شادی قریب ہو گی نا تو دیکھوں گی تو درزن کو گھر بلاتی ہے یا خود درزن کے پاس چل کر جاتی ہے۔'' آسیہ کی بات پر پھر سے سب ہنسنے لگیں۔

''اوئے پروین! تو کب آئی؟'' آسیہ پروین کو دیکھتے ہوئے اس کی طرف لپکی۔

''میں ابھی آئی ہوں۔ تو نے خود ہی تو کہا تھا خدیجہ کو ساتھ لے کر آنا۔ میں خدیجہ کو اس کے گھر سے لینے چلی گئی تھی۔''

''اچھا ڈھولکی کدھر ہے ادھر لاؤ میں بجاؤں گی۔'' خدیجہ ڈھولکی کو اپنی طرف کرتے ہوئے بولی۔

''کالا ڈور یا کنڈے نل اڑیا اوئے۔ چھوٹا دیورا بھابھی نل لڑیا اوئے۔'' لڑکیاں ڈھولکی کی تھاپ پر ایک شعر پڑھتیں اور ہنسی کرنے لگتیں۔ خدیجہ ڈھولکی پیٹ رہی تھی اور باقی سب لڑکیاں گا رہی تھیں اور تالیاں بجا رہی تھیں۔ ان میں آسیہ بھی شامل تھی۔ دوسرا تیسرا اور پھر چوتھا گیت شروع ہوا۔ ان سب میں ساجن کا ذکر تھا۔ اس سے ملنے کی آس اور تڑپ تھی۔ اس کی راہ تکتی منتظر آنکھیں تھیں۔ بے قرار راتوں کی چبھن تھی۔ اس کے اپنوں سے دور ہونے کے قصے تھے۔ اس کے بغیر کئی راتوں کی کروٹوں کا ذکر تھا۔ پروین تالیاں پیٹ رہی تھی مگر گانا اس نے بند کر دیا تھا۔ اس کا ذہن پرواز کرتا ہوا سات سمندر پار جا پہنچا تھا۔ پار.......... جہاں اس کا ساجن.......... اس کا نبیل رہتا تھا۔ تالیوں کے پیچھے ایک چہرہ غم کی تصویر بنا ہوا تھا۔ پروین کا چہرہ۔ اس کے چہرے پہ برسوں کی ناآسودگی سمٹ آئی تھی۔ ایک روشندان سے باہر آسمان نظر آ رہا تھا۔ نیلا آسمان جس پر ہلکے ہلکے سلیٹی بادل چھائے ہوئے تھے۔ جہاں نبیل رہتا تھا وہاں بھی ایسا آسمان ہوگا؟

وہ سوچنے لگی۔ ''وہاں بھی بادل چھائے ہوں گے برکھا برستی ہوگی۔ وہاں بھی یہی سورج اپنی کرنیں بکھیرتا ہوگا۔ سب کچھ ایک ہی تھا پھر درمیان میں یہ لامتناہی دوریاں کیوں تھیں؟ یہ بے نام فاصلے کیوں تھے؟'' پروین کی آنکھوں میں آنسوؤں کی لہر سی آ کر گزر گئی۔

''ساڈا چڑیاں دا چنبا وے بابلہ اساں اڈ جانا۔''

''ساڈی لمبی اڈاری اے اساں مڑ نئیں آنا۔''

''اوئے.......... پینو رو پڑی.......... پینو رو پڑی۔'' تالیاں بجاتے ہوئے ایک لڑکی نے ہاتھ روکے اور بولی۔

باقی سب بھی پینو کی طرف دیکھنے لگیں۔ ''اب تو آسو کے بعد پینو کی ہی باری ہے۔'' دوسری لڑکی بولی۔

''ادھر آسو کا ویاہ ہوا ادھر پروین کی شادی کی تیاریاں شروع ہو جائیں گی۔'' خدیجہ بولی۔

''دولہا دیکھو کدھر سے آتا ہے.......... لگتا ہے.......... تحصیل سیالکوٹ سے آئے گا۔'' ایک اور بولی۔

''مجھے پتہ ہے پینو کی شادی کدھر ہونے والی ہے۔'' ایک لڑکی ہاتھ کھڑا کرتے ہوئے بولی تو دوسری ساری اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

''بتا ناں.......... کدھر ہونے والی ہے؟'' آسیہ اس کا بازو کھینچتے ہوئے بولی۔

''شوکے کے ساتھ.......... چاچے دلاور حسین کا جو ایک ہی ایک منڈا ہے۔''

سب کی ایک ساتھ.......... ''ہائے'' بلند ہوئی۔

''ہائے وہی شوکا جو بھٹے کا مالک ہے؟''

''جو جیپ پر بیٹھ کر بڑی سڑک کی طرف جاتا ہے؟''

''وہی.......... گورا چٹا.......... جس کا رنگ مالٹے کی طرح لگتا ہے؟''

''ہائے میں مرجاواں اس کی ناک کتنی تیکھی ہے اور اس کے نیچے مونچھیں بھی بڑی پیاری لگتیں ہیں۔''

''تیری شادی تو اس کے ساتھ نہیں ہونے والی جو تو اتنی تعریفیں کر رہی ہے۔''

''میرا تو بھائیوں جیسا ہے.......... فٹے منہ تیرا.......... جو ایسی بات کہتی ہے۔''

پروین کے سینے میں جیسے بھونچال آیا ہوا تھا۔ بہت سے آنسو تھے جو آنکھوں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے اندر جلن ہی جلن بھر رہے تھے۔ پروین کی برداشت سے جب سب کچھ باہر ہوگیا تو وہ پھٹ پڑی۔ ''خاموش ہو جاؤ سب خاموش..........'' پروین نے اتنا کہا اور ایک جھٹکے سے اٹھی اور آسو کے گھر سے باہر نکل گئی۔ اس کا کلیجہ غم سے پھٹا جا رہا تھا اور اس کے پیر تیز تیز گھر کی طرف اٹھ رہے تھے اور اس کی نظروں کے سامنے کچی سڑک کا لمبا سا ایک رستہ تھا۔ جس کے دونوں اطراف منجی اپنے آخری دن پورے کر رہی تھی۔ دونوں طرف سنہرا جال بچھا ہوا تھا۔ ایک وٹ کے ساتھ کھالے میں جھاگ اڑاتا پانی چلتا تھا اور وہ فصلوں کو سیراب کرتا تھا۔ منجی کی پیاس بجھاتا تھا۔ وہ کون سا پانی تھا جو پروین کی پیاس بجھاتا۔ پروین لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ وٹ سے پرلی طرف ہو کر کھالے کے پاس بیٹھ گئی۔ پانی ہاتھوں میں لے کر اچھی طرح منہ پر چھینٹے مارنے لگی۔ پھر تھوڑا سا پانی حلق سے نیچے اتارا ایک چاول کی منجر (چاول کا سٹہ) پانی کی سطح پہ تیرتی ہوئی آ رہی تھی۔ پروین نے اسے نکال کر جھاڑا اور اسے منہ میں دباتے ہوئے گھر کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ ہرے دانوں سے کچے چاول نکل کر اس کے منہ میں گھلنے لگے۔ وہ اکثر ایسا کرتی تھی اور منہ میں گھلتے چاول اسے سواد دیتے تھے مگر اب ان چاولوں میں جیسے کڑواہٹ گھل گئی تھی۔ لڑکیوں کے فقرے اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اس کا مطلب ہے پورے گاؤں میں میرے رشتے کی بات پھیل چکی ہے۔ وہ سوچنے لگی.......... کوئی بات ہے تو بات پھیلی ہے نا.......... اس کے قدم اور تیز تیز گھر کی طرف اٹھنے لگے۔

ایک دفعہ تو اس کے دل میں آگئی کہ ماں کے آگے جا کر رونا روئے کہ اسے کیوں جیتے جی مارا جا رہا ہے۔ پورے گاؤں میں اس کے رشتے کی باتیں گردش کر رہی ہیں مگر پھر یہ خیال اس نے ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ ایسا کرنا بھی چاہتی تو نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے پہلے کسی کو دل کی بات بتائی تھی جو اب بتاتی۔ وہ بلند چوکھٹ سے اندر داخل ہوئی۔ جنت بی بی مرغیوں کو ڈربے سے باہر نکال رہی تھی۔ برگد کے درخت میں سے چڑیوں اور دوسرے پرندوں کی مدہم بولیاں سنائی دے رہی تھیں۔ جوں جوں دوپہر ہوتی تھی ان بولیوں میں بھی دھیما پن آ جاتا ہے۔ جیسے یہ پرندے بھی قیلولہ کرنے کے عادی ہوں۔ پروین ماں سے نظریں بچا کر اوپر چلی جانا چاہتی تھی مگر جنت بی بی کی نظر اس پر پڑ گئی۔

''پتر! اتنی جلدی آ گئی کیا ساری لڑکیاں گھروں کو چلی گئی تھیں۔'' جنت بی بی ڈربے کا لکڑی والا دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔

''نہیں ماں! وہ بس میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' پروین نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

''کیا.......... پھر تیرے پیٹ میں درد شروع ہوگیا ہے۔'' جنت بی بی فکرمند ہوتے ہوئے بولی۔

''ہاں ماں..........!'' پروین پیٹ پکڑتے ہوئے بولی۔

''اب کے تیرے بھائی شہر سے آئیں گے نا تو تجھے بھی ساتھ ہی بھیج دوں گی۔ شہر میں کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھائیں گے تو انشاء اللہ آرام آ

جائے گا۔ روز روز کا سیاپا ختم ہو جائے گا۔"

پروین نے کوئی جواب نہیں دیا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"ماں! میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔"

"تو نیچے ہی لیٹ جا......... میرے پاس۔"

"نہیں ماں! میں اوپر ہی ٹھیک ہوں۔" پروین نے کہا اور اوپر چلی گئی۔ جنت بی بی ہاتھ گھما کر رہ گئی۔ کمرے میں جاتے ہی پروین نے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھائی اور پلنگ کے پائے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی تھی۔ ہر ہچکی کے ساتھ اس کے جسم کا ریشہ ریشہ بھی ہلتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا نبیل اس کے سامنے ہو تو وہ اس کے منہ پر تھپڑ مارتی چلی جائے اور پھر اس کے گلے لگ کر آنسوؤں کے دریا بہا دے۔ نبیل اسے چپ کروانا چاہے تو وہ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ آنسو روکنا اس کے اختیار سے باہر ہو جائے۔ پھر نبیل اپنے ہونٹ اس کی آنکھوں پہ رکھ کر سارے آنسو پی جائے۔ کیا کبھی ایسا ہوگا......... ؟ کیا کبھی ایسا ہو سکتا ہے......... ؟ وہ سوچنے لگی۔ شوکے کے ساتھ شادی کی باتوں نے اسے بہت دکھ پہنچایا تھا۔ پہلی دفعہ ایسا ہوا تھا کہ اسے نبیل پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے پروین کو یہ کیسا روگ لگا دیا تھا۔ تین چار دن اس گاؤں میں رہ کر وہ اسے کیا سے کیا بنا گیا تھا۔ نہ وہ جی رہی تھی نہ وہ مر رہی تھی۔ انتظار بھی کر رہی تھی تو کسی کا، خوابوں کا خیالوں کا......... حقیقت تو اس سے بہت دور تھی۔ اتنی دور جتنا وہاں سے انگلینڈ تھا۔ تو کیا حقیقت کا چہرہ وہ کبھی نہ دیکھ سکے گی؟ کیا پتہ حقیقت کا چہرہ تب نظر آئے جب وقت گزر چکا ہو۔ پانی سر سے گزر چکا ہو۔ وہ کسی اور کی ہو چکی ہو۔ نہیں......... مگر اسے تو کسی اور کا ہونا ہی نہیں تھا۔ اسے تو انتظار کرنا تھا۔ آخری سانس تک کسی انہونی کا......... کسی معجزے کا......... اگر ایسا کچھ بھی نہ ہوتا تو اس کے مقدر میں انتظار لکھا جا چکا تھا۔

"نبیل! پلیز......... واپس آ جاؤ۔"

"پروین نیچے آ......... دیکھ یہ کوئی خط آیا ہے......... ابھی ستار باو دے کر گیا ہے۔"

پروین اچھی طرح سے اپنا چہرہ صاف کر کے نیچے آ گئی۔ جنت بی بی خط برگد کے نیچے بنے چبوترے کے مصلے پر رکھ کر اندر چلی گئی تھی۔ پروین نے خط اٹھایا اور اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ جونہی اس کی نظر خط کی پشت پر لکھے نام نبیل پر پڑی اس کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ اسے یوں لگا جیسے بہت بڑا پہاڑی چشمہ ہے جو اس کے سینے کے عین درمیان سے پھوٹ پڑا ہے۔ سفید دودھیا برفیلے پانی کے چھینٹے آسمان سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ وہ چمکتے سورج کو بوسہ دینا چاہتے ہیں۔ آسمان کی بلندیوں پر موجود سفید براق بادلوں سے دوستی کرنا چاہتے ہیں۔ آسمان کی نیلاہٹ سے گلے ملنا چاہتے ہیں۔ درختوں پر موجود پرندوں کی چہچہاہٹ اور تیز ہو گئی تھی یا شاید پروین کو ایسا لگ رہا تھا۔ برگد کے نیچے دانا دنکا چگتی مرغیاں بھی اپنی بولی میں بولنے لگیں تھیں۔ چوزے خوشی سے جیسے پھدکنے لگے تھے۔ ہر چیز جیسے رقص کرنے لگی تھی۔ سفید دودھیا پانی زور زور سے چٹانوں سے ٹکرا رہا تھا۔ آواز بلند ہو رہی تھی، گونج رہی تھی، اس آواز اس گونج میں دنیا کا سب سے حسین نغمہ چھپا تھا۔ دھوپ میں چمکتے موتیوں جیسے چھینٹے پروین کو اپنے منہ

میں گرتے محسوس ہو رہے تھے۔ نبیل کے جانے کے بعد یہ اس کا سب سے پہلا رابطہ تھا۔ تپتے ارمانوں میں ٹھنڈی ہوا کا پہلا جھونکا تھا۔ یہ ہلکی ہلکی خشک ہوا، یہ ٹھنڈک پروین کے جسم و جاں میں اتر گئی تھی۔ اس ٹھنڈک نے پروین کے سارے جسم کو لذت و آسودگی کی حسین وادی میں دھکیل دیا تھا۔ اس کے جسم کے بال کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ بازو کے کھڑے ہونے والے بالوں کو سہلانے لگی۔ میٹھا میٹھا درد جاگنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے جسم کے ہر ہر حصے پر نبیل کے ہونٹ ہوں۔ وہ ہونٹ جسم کی ساری گرمی چوس لینا چاہتے ہوں۔ ساری حرارت جذب کر کے سارے بدن میں ٹھنڈک اتار دینا چاہتے ہوں مگر یہ ٹھنڈک بھی پروین کو تنگ کر رہی تھی۔ اس کی بے چینی بڑھا رہی تھی۔

پروین نے خط کو سینے کے ساتھ لگایا اور اوپر کی طرف بھاگی۔ پیچھے سے شاید جنت بی بی کی آواز آئی تھی۔ ''رک تو سہی کس کا خط ہے؟'' مگر اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہو کر کنڈی چڑھا کر پلنگ پر لیٹتے لیٹتے اسے کافی سانس چڑھ گیا تھا۔ اس نے بڑی نزاکت سے خط کو چاک کیا۔ ایک مسحور سی خوشبو اس کی رگ و پے میں اتر گئی۔ یہ کاغذ کی خوشبو تھی یا لکھنے والے کے لمس کی خوشبو تھی۔

خط اس کے ہاتھوں میں تھا اور نظریں لکھی تحریر پر۔ پھر اس کی نظریں الفاظ پر پھسلتی چلی گئیں۔ اس نے پھوپھی، پھوپھا کو سلام لکھا تھا اور لکھا تھا۔ کہنے کو اتنا کچھ ہے کہ کیسے لکھوں؟ جب سے گاؤں سے لوٹا ہوں ہر پل آپ لوگوں کی یاد ستاتی ہے۔'' اس تحریر پر آ کر پروین کی نظریں ٹھہر گئیں۔ ''لوگوں'' میں وہ خود بھی تو شمار تھی۔ دل ایک دفعہ زور سے دھڑکا چہرے کی طرف خون بڑی تیزی سے لپکا۔ اس کے گال انگاروں کی طرح دہکنے لگے۔ اس نے اور لکھا تھا۔ ''اگر میں گاؤں نہ آیا ہوتا تو کبھی نہ جان سکتا کہ دنیا میں اتنے پیار کرنے والے لوگ بھی بستے ہیں۔'' وہ جملہ دھرانے لگی۔

پھر اس کی نظریں آگے پھسلنے لگیں۔ ''پھر اس نے لکھا تھا کہ اب جب میں آؤں گا تو بہت دن رہوں گا۔ مجھے شاہ مدین کا میلہ بھی تو دیکھنے جانا ہے۔'' تو نبیل گاؤں آئے گا.......... ہاں اسے آنا ہوگا.......... اسے میرے لیے گاؤں آنا ہوگا۔ جب آگے پروین کا ذکر آیا تو پروین کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ نبیل نے اس کا حال پوچھا تھا اور کہا تھا کہ پروین کے پیٹ کا درد اب کیسا ہے؟ آنسو پروین کی آنکھوں سے ڈھلک رہے تھے اور وہ ہنس رہی تھی۔ اس نے اس کے پیٹ کے درد کا حال جو پوچھا تھا۔ وہ اتنا ہنسی کہ اسے سچ مچ پیٹ میں درد ہونے لگا اور پھر نبیل نے پروین کی پڑھائی کے متعلق لکھا تھا اور لکھا تھا کہ تعلیم انسان کو بہت کچھ دیتی ہے۔ آخر میں اس نے لکھا تھا کہ میں پہلی فرصت میں گاؤں ضرور چکر لگاؤں گا اور اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ مجھے خط ضرور لکھیں۔

پروین کا وجود جیسے ہواؤں میں اوپر ہی اوپر اڑتا جا رہا تھا۔ دور ٹاہلی کے بوٹوں سے پرے پکی سڑک کی طرف جدھر سے نبیل نے آنا تھا۔ انتظار کرتی آنکھوں میں کامیابی کے جگنو ٹمٹمانے لگے تھے۔ اسے اپنا غم اپنی پریشانی چھپانے کی عادت تھی وہ کسی کو بھی پیٹ کی بات نہیں بتاتی تھی۔ آسیہ اس کی سب سے پکی سہیلی تھی اس نے اسے بھی اپنے اوپر بیتنے والی شب و روز کی قیامت کے بارے میں کبھی نہیں بتایا تھا۔ اسے صبر کے پھل کی پہلی قسط پہنچ گئی تھی اب وہ بدلی ہوئی پروین تھی۔ پہلے والی پروین ہنسنے والی ہنسانے والی ہر وقت چہرے پر مسکراہٹ سجائے رکھنے والی پروین.......... نبیل کے ایک خط نے اس کی ساری پریشانی کو ہوا کی طرح اڑا دیا تھا اور آس کے چراغ روشن کیے تھے۔

''پروین! میں ایک بات تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے میں کسی سے بھی نہیں کر سکا۔ کچھ عرصہ ہوا ہے مجھ میں بڑی عجیب و غریب

تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ جسے میں شدت سے محسوس کر رہا ہوں۔ انگلینڈ میں' میں کچھ عرصے سے بہت الجھا الجھا اور بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا۔ مجھے یوں لگنے لگا تھا جیسے میں کسی دور دراز علاقے کی بھٹکی ہوئی روح ہوں جو غلطی سے ان رنگینیوں کی طرف نکل آئی ہے۔ مگر.......... جب سے میں گاؤں آیا ہوں مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے' بھٹکی ہوئی روح کو منزل مل گئی ہے۔ مٹی سے جدا خمیر مٹی سے آملا ہے۔'' پروین کو نبیل کی باتیں یاد آئیں تو خوشی اس کے اندر ناچنے لگی۔ ''ہاں نبیل! تمہیں یہاں واپس آنا ہے۔ یہی تمہاری مٹی ہے یہی تمہاری منزل ہے۔

''میں تمہارا آخری دم تک انتظار کروں گی۔ نبیل میں تمہارا آخری دم تک انتظار کروں گی۔''

پروین بھاگتی ہوئی نیچے اتری تھی۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کی چنری سر سے اتر گئی۔ ریشمی زلفیں ٹھوڑی، گالوں اور ہونٹوں کو چومنے لگیں تھیں۔ جھیل سی گہری آنکھوں میں شام کی سرخی اتری ہوئی تھی۔

''ماں.......... ماں یہ دیکھو نبیل کا خط آیا ہے.......... انگلینڈ سے..........'' پروین خط ماں کی نظروں کے سامنے کرتے ہوئی بولی۔

جنت بی بی کے سپاٹ چہرے پہ یکدم رونق آ گئی۔ ''سچ بتا.......... نبیل کا خط ہی ہے نا.......... یہ..........'' جنت بی بی اپنی چنری سنبھالتے ہوئے بولی۔

''ہاں ماں رب دی سَوں.......... نبیل کا خط ہے..........'' پروین کا اپنی جگہ کھڑا ہونا محال ہو رہا تھا۔

''کیا لکھا ہے اس بے ایمان نے مجھے پڑھ کے تو سنا..........'' جنت بی بی خط کو گھورتے ہوئے بولی۔

''ماں اس نے لکھا ہے.......... ٹھہر یہاں بیٹھ میں تجھے آرام سے بتاتی ہوں..........''

''جلدی بتا.......... وہ خیر خیریت سے تو ہے ناں..........''

''ہاں ماں! بالکل خیریت سے ہے۔ لکھتا ہے جب سے گاؤں سے گیا ہوں آپ لوگ بہت یاد آتے ہو۔''

''اچھا اس نے یہ لکھا ہے۔''

''ہاں ماں! آگے سن..........''

''یا خدا تیرا شکر ہے..........'' جنت بی بی دعا کی صورت ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔

''نبیل کہتا ہے اگر میں گاؤں میں نہ آیا ہوتا تو کبھی نہ جان سکتا کہ دنیا میں اتنے پیار کرنے والے لوگ بھی ہوتے ہیں۔''

جنت بی بی کی آنکھیں دھیرے سے آنسو بہانے لگیں۔ وہ چنری کے پلو سے آنکھیں ملنے لگی۔

''ماں اس نے کہا ہے کہ میں کچھ پریشان ہوں دعا کریں۔''

''رب خیر کرے.......... اسے اس عمر میں کیا پریشانی لگ گئی ہے..........'' جنت بی بی فکر مند ہوتے ہوئے بولی۔

''نہیں ماں! بس ایسے ہی لکھا ہے اس نے کہ دعا کریں ہم لوگ اس کے لیے۔ اس نے میاں جی' خیر دین' چاچا دتو' چاچا بشیر' چاچا دینو.......... سب کو سلام لکھا ہے اور چاچا حیات کو خاص طور پر بہت بہت سلام لکھا ہے۔ اور لکھا ہے کہ میں بہت جلد گاؤں آؤں گا اور پھر بہت دن

رہوں گا اور شاہ مدین کا میلہ بھی دیکھنے جاؤں گا۔''

''اور کیا لکھا ہے اس نے؟'' جنت بی بی برستی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''اور لکھا ہے کہ میں پہلی فرصت میں گاؤں کا چکر لگاؤں گا۔'' پروین اپنا ذکر جان بوجھ کر گول کر گئی تھی۔ یہ چور کی داڑھی میں تنکے والا معاملہ تھا۔

پروین نے خط کو لپیٹا اور ماں کی نظر سے بچا کر سینے میں اڑس لیا۔ ''کدھر جا رہی ہے.........؟'' جنت بی بی نے باہر کو جاتی پروین سے پوچھا۔

''ماں! میں آسو کی طرف جا رہی ہوں۔ خدیجہ کو اس کے گھر چھوڑنا ہے نا میں نے.........''

''وہ کیوں.........؟ وہ خود گھر نہیں جا سکتی.........؟'' جنت بی بی نے نارمل لہجے میں کہا۔

''نہیں ماں چاچی صدیقہ نے کہا تھا تو خود اسے گھر چھوڑ کر جانا.........''

''تو تو.........اسے گھر سے بھی لینے گئی تھی.........''

''ہاں ماں! آسو نے مجھے وہاں بھیجا تھا خدیجہ کو لینے کے لیے.........''

''اچھا جا.........پر شام پڑنے سے پہلے گھر آ جانا۔''

''اچھا ماں!.........'' پروین نے ہانک لگائی اور جوان ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتے ہوئے گاؤں کے شمال کی طرف ہو لی۔ یہ سارا گاؤں شمال اور مشرق میں آباد تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی گلیوں کا ایک گورکھ دھندہ تھا۔ یہاں بیرونی دروازوں پر بیٹھی بڑی بوڑھیاں تھیں جو آمنے سامنے بیٹھ کر آپس میں باتیں کرتی تھیں۔ کسی کی گود میں پوتا تھا تو کسی کی گود میں نواسہ' کسی بچے کی ناک بہہ رہی تھی تو کوئی پیسوں کے لیے رو رہا تھا۔ کسی کو ماں نے مارا تھا تو کوئی دادی کی گود میں لیٹ کر اپنا غم غلط کر رہا تھا۔ کچی گلیوں میں مرغیوں کی ٹولیاں بھاگی پھرتی تھیں۔ گلیوں کے کناروں پہ گندی نالیاں روانی سے بہتی تھیں ان نالیوں میں ڈوبتے سورج کی کرنیں سمٹتی تھیں۔ ایک گھر کے باہر بنی ہوئی تھڑی پہ کالے رنگ کا کتا بیٹھا تھا۔ مرغیاں ادھر جانے سے کتراتی تھیں۔ گلیوں سے پرے بیلوں کی جوڑیاں چلتی تھیں ان کے گلے میں پڑی ٹلیاں ٹن ٹن بجتی تھیں۔ ایسی ہی ٹن ٹن پروین کے دل میں بھی ہو رہی تھی۔

''سیداں مائی! سلام' پروین گھر سے باہر تھڑے پہ بیٹھی ہوئی ضعیف العمر عورت کو سلام کرتے ہوئے بولی۔

''وعلیکم السلام دھیے! آج بڑی خوش ہے خیر ہے نا.........'' سیداں مائی بولی۔

''ہاں اماں جی! میں آج بڑی خوش آں.........'' پروین اسی کے لہجے میں جواب دیتے ہوئے بولی۔

''اک سو دس ورے ہو گئے اس کو اڈیکتے.........پتا نہیں مجھے لینے کیوں نہیں آتا.........؟'' سیداں مائی کی عمر سو سال سے اوپر تھی۔ وہ ہر ملنے والے سے پہلا سوال یہی کرتی تھی۔

''اماں جی! تسی ایسی گل کیوں کر دے او۔ رب نے چاہا تو آپ کی عمر بڑی لمبی ہوگی۔'' پروین نے مائی کو چھیڑنے کے لیے کہا۔

''نہ.........نہ پت مینوں بد عا نہ دے.........زندگی ہنڈا تے ہنڈا تے تھک گئی ہوں۔'' سیداں مائی کی نیلی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔

''اماں جی! بھلا کوئی زندگی سے بھی اکتاتا ہے۔ زندگی تو بڑی پیاری چیز ہے۔''

''ہاں پت بڑی پیاری چیز ہے اگر میچے کی ہو تو.........اب تو بوڑھی آنکھیں بھی تھک گئی ہیں۔ اس زندگی کو دیکھ دیکھ کے پت زندگی کا مزا تو تب ہے جب جوانی ہو.........''

''اماں! آپ نے جوانی دیکھی ہے.........؟'' پروین جیسے حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''لے دس!'' سیداں مائی کھلکھلا کے ہنسی اس کے پوپلے ہونٹ عجیب انداز میں ہلنے لگے اس کے منہ میں کوئی دانت نہیں تھا۔ ''پت! جوانی دیکھے بنا بھلا میں اتنی بڑی کیسے ہوگئی۔''

''اماں سچ بتانا جوانی کیسی ہوتی ہے؟ مجھے تو کچھ پتہ نہیں ہے۔''

''پت! جوانی جیسی کوئی شے نہیں۔ ہائے او ربا! یہ ایسا موسم ہوتا ہے ہر شے میں سے خوشبو پھوٹتی ہے۔ آنکھوں میں ایسے ایسے رنگ اترتے ہیں کہ بندہ مدہوش ہو جاتا ہے۔ ہر ایک شے پیاری نظر آنے لگتی ہے۔ دل کے اندر بہت اندر کئی طرح کے پیارے ہریالے موسم آباد ہو جاتے ہیں۔ ہولی ہولی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں ان ہواؤں میں ایسی باس ہوتی ہے جو پہلے کبھی نہ سونگھی ہو۔ ایسا گون (گانا) ہوتا ہے جو پہلے کبھی نہ سنا ہو۔ اسی موسم میں بیری اور جامن کی چھاں ہوتی ہے۔ ٹھنڈے پانیوں کی مٹھاس ہوتی ہے۔ پرانے پیپل کے اندر ہولے ہولے سیٹیاں بجاتی ہوا کی آوازیں ہوتی ہیں۔'' پروین حیرت سے سیداں مائی کو دیکھے جا رہی تھی جو اس وقت یوں دکھ رہی تھی جیسے فلسفے کی استاد ہو۔ جیسے وہ نفسیات کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی مگر پتہ نہیں اس نے زندگی سے کیا درس لیا تھا کہ وہ بہت باریک باتیں بھی بڑے آرام سے کر جاتی تھی۔

''پت! بس ساری بات دل کے موسم کی ہے۔''

''کیا مطلب؟ اماں میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔''

''پت! دل کا موسم اچھا ہو تو کوا بولتا بھی اچھا لگتا ہے۔ کتے کا بھونکنا بھی دل کو بھاتا ہے۔ کسی کی ڈانٹ ڈپٹ سے بھی دل نہیں دُکھتا۔ کسی بڑے کا سمجھانا بھی میٹھا اور شیرینی جیسا لگتا ہے مگر اگر دل کا موسم ویران اور بے آباد ہو تو کوئی کوئل کوکتی بھی زہر لگتی ہے۔ کسی کا ذرا سا اونچا بولنا بھی رلا دیتا ہے۔ کسی کی نصیحت بھی کانوں کو بہت بری لگتی ہے۔'' پروین بڑی محویت سے سیداں مائی کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ اپنی دراز پٹپٹاتی آنکھوں کے ساتھ بڑے غور سے سیداں مائی کو دیکھ رہی تھی۔ سیداں مائی کی عمر سو سے اوپر تھی۔ کسی کا خیال تھا ایک سو پانچ سال ہے کوئی اس سے زیادہ بتاتا تھا جبکہ مائی خود کو ایک سو دس سال کا گردانتی تھی۔ اس کی کمر رکوع کی صورت جھک گئی تھی۔ وہ اب بھی کسی سہارے کے بغیر چلتی تھی۔ وہ چلتی تو یوں لگتا جیسے پانی میں تیر رہی ہے۔ اس کی نظر بالکل ٹھیک تھی بس تھوڑی سے دھندلا ضرور گئی تھی۔ وہ کانوں سے بالکل ٹھیک سنتی تھی اس کے کان چار پانچ جگہوں سے

چھدرے ہوئے تھے۔ اس عمر میں بھی اس کی رنگت سرخ وسفید تھی۔ خون کی سرخی کی وجہ سے ہر وقت اس کا چہرہ لشکارا رہتا تھا۔ وہ اس عمر میں بھی اپنے سارے کام خود کرتی تھی یہاں تک کہ بھینسوں کو چارہ ڈالنا بھی اس نے خود ہی اپنی ذمہ داری بنا لیا ہوا تھا۔

مائی کی چھ لڑکیاں تھیں جو اپنے اپنے گھر کی ہو چکی تھیں اور جوان بال بچوں اور پوتوں والیاں تھیں۔ مائی کے پانچ لڑکے تھے۔ وہ بھی اپنے اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ مائی سب سے چھوٹے لڑکے کے پاس رہتی تھی۔ اس کا ایک بیٹا ایب نارمل تھا۔ وہ بھی مائی کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ مائی گاؤں کی گلیوں میں جدھر جدھر جاتی وہ اس کا دُم چھلہ بن کے اس کے پیچھے پیچھے چلتا۔ اس کا نام لطیف تھا..........عبداللطیف..........

''اماں! آپ جوانی میں تو بہت خوبصورت ہوں گی..........'' پروین سیداں مائی کی آنکھوں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی تو مائی بڑی زور سے ہنسی۔ اس کی ہنسی کا بھی ایک خوبصورت انداز تھا۔ یوں لگتا تھا مختصر سے وجود سے اب سانس باہر نہیں آئے گا مگر سانس واپس آ جاتا..........کسی کی راہ دیکھنے والی مائی کا انتظار اور طویل ہو جاتا۔

''ہاں پت! لوگ تو یہی کہتے تھے کہ میں بہت خوبصورت تھی۔''

''کون کون کہتا تھا..........؟'' پروین دلچسپی سے بولی۔

''سب ہی..........میرا مطلب ہے۔ میرے گھر والے..........باہر والے..........گاؤں کے لوگ..........''

''باہر والوں میں کوئی خاص طور پر بھی کہتا تھا کہ آپ بہت خوبصورت ہیں؟''

''تو بڑی شیطان ہو گئی ہے۔ اب بڑی ہو گئی ہے نا..........'' سیداں مائی ایک دفعہ پھر زور سے ہنسی۔

''اچھا بتا ناں اماں اور کون کہتا تھا..........؟'' پورے گاؤں میں واحد مائی تھی جس کے ساتھ پروین ایسی باتیں کر لیتی تھی۔

''لطیف کا پیو کہتا تھا..........؟''

''نام کیا تھا ان کا..........؟'' پروین موڑھے پر سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔

''نا پت نا..........نام نہیں لیتے سر کے سائیں کا..........تجھے پہلے بھی کہا تھا۔''

''وہ کیوں اماں؟'' پروین مائی کے اور قریب ہوتے ہوئے بولی۔

''نہیں..........بس نہیں لیتے..........برا سمجھا جاتا ہے۔''

''اچھا تو انہوں نے کب کہا آپ کو خوبصورت..........؟'' پروین بے چین ہوتے ہوئے بولی۔

''شادی کے اک ورے بعد..........'' سیداں مائی دور کہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

''شادی کے ایک سال بعد..........ہائیں..........یہ کیا بات ہوئی..........؟''

''شادی کے ایک ورے بعد جو میں لطیف کے پیو کے پاس گئی تھی۔''

''تو کیا لطیف کے ابا شادی کروا کر کہیں چلے گئے تھے..........؟''

''مَیں پت! وہیں پر تھے گھر پر..........''

''تو.........تو.........پھر.........'' پروین کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''میں ان کے سامنے جانے سے شرماتی تھی۔ وہ جب بھی میرے سامنے آتے تھے میں گھونگھٹ نکال کر باہر بیلیوں میں بھاگ جایا کرتی تھی۔ وہ ویڑھے میں آتے تو میں چھت پر چڑھ جاتی۔ میری جٹھانی میری سگی بھین عینا تھی۔ وہ مجھے بڑا ڈانٹتی تھی کہ بھا اکیلا سوتا ہے۔ تُو اس کے کمرے میں کیوں نہیں جاتی۔ پر میں پھر بھی نہیں جاتی تھی۔ اپنی بھین کے پاس ہی سوتی تھی۔''

پروین حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔ ''اماں! اس وقت آپ کی عمر کتنی تھی.........؟''

''میں بارہ ورے کی تھی.........'' سیداں مائی بلاوجہ آنکھوں میں آئے شفاف پانی کو صاف کرتے ہوئے بولی۔

''بارہ سال کی عمر میں آپ کی شادی ہوگئی تھی۔'' پروین کو ایک اور جھٹکا لگا۔

''ہاں بارویں ورے کے آخر میں تھی جب میری ڈولی اٹھی۔ میں ابھی گڈیوں پٹولوں کے ساتھ کھیلتی تھی۔ مجھے پتہ ہی نہیں تھا شادی کیا ہوتی ہے؟ سرکا سائیں کیا ہوتا ہے؟ وہ تو ایک دن بھین عینا نے مجھے بٹھا کر سمجھایا۔ اپنی مثال دی۔ بات میری سمجھ میں آگئی پھر شرم کے مارے میں ان کے پاس نہیں جاتی تھی۔ ایک دن میں چھت پر بیٹھی سوت کت رہی تھی کہ لطیف کا ابا سیڑھیاں چڑھتا وہاں آگیا۔ جب میں نے خود کو اکیلا اور بے بس پایا تو میں کئی گھروں کی چھتیں ٹپتی ہوئی بیلیوں کی طرف نکل گئی۔''

''پھر کیا ہوا اماں؟'' پروین جیسے خواب میں بولی۔

''پھر ایک دن میں کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔ بھین عینا نہر پہ کپڑے دھونے گئی ہوئی تھی۔''

''اچھا تو پھر بابا نے آپ کو آ کر پکڑ لیا.........'' پروین معصوم ہنسی ہنسی۔

''لطیف کا پیو کمرے میں گھسا اور اندر سے کواڑ بند کر لیا۔ میں سوئی پڑی تھی مجھے کیا خبر۔ وہ میرے سرہانے یوں بیٹھ گیا ہے کہ میرا سر اس کی گود میں پڑا تھا۔ وہ ہولے ہولے سے میری بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔''

''پھر کیا ہوا ادی؟'' پروین کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں سے برآمد ہوئی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے لطیف کا پیو لطیف کا پیو نہ ہو بلکہ نبیل ہو اور سیداں مائی سیداں مائی نہ ہو بلکہ وہ خود ہو وہ سوئی ہو اس کا سر نبیل کی گود میں ہو۔ اور نبیل اس کی زلفوں میں یوں انگلیاں پھر رہا ہو کہ پور پور میں محبت جذب ہو رہی ہو۔

''پھر یکدم میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے یوں لگا کہ ابھی وہیں میرا دم نکل جائے گا۔ میں جلدی سے اٹھ کر باہر بھاگنا چاہتی تھی مگر اس نے کھینچ کر مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ میں نے بھاگنے کے لیے بہت جور لگایا مگر اس کی بانہوں کی پکڑ بہت سخت تھی۔ میں سسکنے لگی تو اس نے مجھے جھولی میں بٹھا لیا اور میرا سر اپنے کندھے پہ رکھ لیا اور آہستہ آہستہ میرا پنڈا سہلانے لگا۔ اس کے ہاتھوں کی حرکت مجھے آرام دینے لگی۔ میرے سارے وجود میں گدگدی ہونے لگی پھر اس نے بڑی آہستہ سے میرے گال پہ پیار کیا۔''

''سچ اماں.........؟'' پروین ایک ادا سے آنکھیں میچتے ہوئے بولی۔

''بڑی تیز ہوگئی تو.........'' سیداں مائی ہلکی سے چپت جڑتے ہوئے بولی۔ ''جب اس نے پیار کیا تو میرا پنڈا برف کی طرح ہوگیا۔ مجھے سردی لگنے لگی دانت بجنے لگے۔''

''آپ کے دانت تھے اس وقت جو بجنے لگے تھے۔''

''تو بھی ناں اللہ میاں کی گائے ہے۔ اس وقت تو میرے پورے بتیس دانت تھے کلیوں کی طرح کے.........''

''پھر کلیاں کدھر گئیں؟ اب تو ایک بھی منہ میں نہیں۔''

''آہستہ آہستہ ساری کلیاں جھڑ گئیں جیسے بوٹے سے پتے جھڑتے ہیں۔''

''اچھا اماں آگے بتاناں کیا ہوا؟''

''تو بڑی چسکوری ہے.........'' اماں مصنوعی ڈانٹ سے بولی۔ حالانکہ اسے اپنی باتیں سنانے میں بہت مزا آ رہا تھا۔ وہ اتنی بوڑھی تھی اس کی کوئی سنتا تو تھا نہیں نہ بیٹا نہ بہوئیں.........وہ کھنگورا مارتے ہوئے پھر گویا ہوئی۔ ''جب سردی لگنے لگی تو میں نے کپکپانا شروع کر دیا۔ لطیف کا پیو بولا۔ ''تجھے کیا ہوتا ہے؟'' میں بولی۔ ''ٹھنڈ لگتی ہے۔'' اس نے مجھے پاس لیٹا لیا اور اوپر رضائی دے دی۔ میں اس کے سینے کے ساتھ لگی رہی۔ وہاں بڑی گرمی تھی ایسی گرمی جیسی سردیوں میں جلتے ہوئے اپلوں کے پاس بیٹھنے سے آتی ہے اور جتنا مزا سردیوں میں آگ تاپنے کا آتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ مجھے وہاں اس وقت اس رضائی میں آ رہا تھا۔

پروین کی سانسیں دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھیں۔ بیٹھے بیٹھے اس کے جسم پہ کپکپی طاری ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے ڈورے سرخ ہوگئے تھے ان آنکھوں ان ڈوروں کے آس پاس محبت کا شفاف پانی بہتا تھا۔ انتظار کا کڑوا کسیلا چشمہ بھی وہیں کہیں سے پھوٹتا تھا۔

''پھر کیا ہوا اماں؟'' پروین سرخ آنکھوں سے دور کہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

پھر باہر دروازے پہ کھٹکا ہوا۔ لطیف کا پیو جلدی سے اٹھا۔ پھر اس نے میری گرم گال پہ پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''سیداں! ایک بات کہوں.........؟'' میں آگے سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر آواز میرے منہ سے نہ نکلی۔ میرے جواب کا انتظار کیے بنا وہ بولا۔ ''تم بہت پیاری ہو.........میں آج رات اپنے کمرے میں تمہارا انتظار کروں گا آؤ گی نا.........؟''

میں نے آگے سے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں جواب دے بھی نہیں سکتی تھی۔ آنکھیں جھکا کے رہ گئی۔ اگلے تین دن میں کوشش کرتی رہی کہ اس کے کمرے میں جاؤں مگر میں وہ ہمت اکٹھی نہ کر پائی.........لطیف کے پیو نے بھی پھر مجھے چھیڑنا چھوڑ دیا۔''

''اماں! آپ تو پھر بڑی سنگدل نکلیں۔'' پروین رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''آگے تو سن بیت.........! اس دن کے بعد جس دن لطیف کے پیو نے مجھے چھوا تھا۔ میں بہت بے چین رہنے لگی۔''

''دن رات لطیف کے پیو کا خیال ستاتا رہتا۔ ایک رات میں بہت دیر تک بستر پر پڑی روتی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں۔

میں اس کے پاس جانا چاہتی تھی اس کے سینے کے ساتھ لگ کر رونا چاہتی تھی مگر بہت کوشش کے باوجود مجھ سے ایسا نہ ہوتا تھا۔اس کے سامنے جاتے ہی میری روح فنا ہو جاتی تھی۔شرم سے سارا جسم سوکھے پتے کی طرح لرزنے لگتا تھا۔''

پروین بے طرح سیداں مائی کی باتوں کے سحر میں کھوئی جاتی تھی۔وہ کہانی مائی سیداں اور اس کے شوہر کی نہیں تھی وہ کہانی نبیل اور پروین کی تھی۔پروین خوشی اور آنسوؤں کے مدوجزر میں ڈوب ابھر رہی تھی۔وہ ساری شرمیں اتار کر نبیل کے ساتھ دیوانہ وار لپٹ جانا چاہتی تھی۔وہ اس کے وجود میں سما جانا چاہتی تھی۔رومانوی خواب سوتے میں آئیں یا جاگتے میں برابر تنگ کرتے ہیں۔دل کو اک نئی طرح کی دھڑکن سے آشنا کرتے ہیں۔ایسی دھڑکن جس میں دردبھری مٹھاس بڑی وافر ہوتی ہے۔ایسی دھڑکن جس کی جان لیوا چبھن میں بھی دنیا جہاں کا مزا چھپا ہوتا ہے۔

''جب بھین عینا نے مجھے روتے ہوئے دیکھا تو خوب ڈانٹا۔'' مائی نے پھر کہنا شروع کیا۔''میں ڈانٹ سن کر اور زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تو بھین بھی لیٹی لیٹی اٹھ بیٹھی۔اس نے رونے کی وجہ پوچھی تو میں نے اسے بتایا کہ اس نے مجھے اپنے کمرے میں آنے کا کہا تھا۔کتنے دن ہو گئے اس بات کو میں نہیں گئی۔میری بات سن کر بھین نے مجھے اور گالیاں دیں اور بستر سے اٹھ کر میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچتے ہوئے اس کے کمرے میں چھوڑ آئی اور باہر سے دروازہ بند کر دیا۔میں بھی کسی ایسے ہی سہارے کی تلاش میں تھی جو میرا ہاتھ پکڑ کر دروازے کے پار اتار دیتا۔لطیف کا پیو بے خبر سویا پڑا تھا۔میں کتنی ہی دیر دیوار سے لگی کھڑی رہی۔اتنی ہمت مجھ میں نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیتی۔میں دیوار سے لگی سردی سے کانپتی رہی اور لالٹین کی دھیمی ہوتی ہوئی لو میں اس کا چہرہ تکتی رہی۔یکدم مجھ پر پھر خوف طاری ہوا۔میں تیزی سے باہر کی طرف لپکی مگر بھین عینا باہر سے دروازے کو کنڈا لگا کر گئی تھی۔میں دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔سردی جب برداشت سے باہر ہو گئی تو میں سسکنے لگی۔میری حلق سے عجیب وغریب آوازیں نکلنے لگیں۔لطیف کا پیو اٹھ بیٹھا۔اس نے آگے بڑھ کر لاٹھی اٹھائی اور گرج کر بولا۔''اوئے کون ہے..........؟'' جب اس کی نظر مجھ پڑی تو وہ حیران رہ گیا۔جلدی سے لاٹھی پرے پھینک کر دونوں بازوؤں سے پکڑ کر مجھے اٹھایا اور کہنے لگا۔''تو یہاں کیا کر رہی ہے؟'' میں بھلا کیا جواب دیتی بس رو کر دکھا دیا۔

''وہ مجھے بانہوں میں سمیٹتا ہوا بستر تک لے گیا اور مجھے منجی پہ لیٹا کر اوپر رضائی دے دی اور خود ایک طرف کھڑا ہو گیا۔میں کتنی ہی دیر رضائی میں کانپتی رہی اور وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔نہ جانے کب مجھے نیند نے آ لیا۔''

''پھر آپ کی آنکھ صبح تڑکے کھلی۔'' پروین کافی دیر کے بعد بولی۔

''نہیں پت! جس طرح ایک دم میری آنکھ لگی تھی اس طرح کھل بھی گئی۔''

''پھر کیا ہوا؟'' پروین شرارتی بچے کی طرح کلکاری مار کر ہنسی۔

''میں نے دیکھا تو لطیف کا پیو تھر تھر کانپ رہا تھا۔وہ پوہ کی بڑی ٹھنڈی رات تھی۔کمرے میں اس وقت بڑا پالا تھا۔میں رضائی میں لیٹی ہوئی تھی اور وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔مجھے پہلی دفعہ اس پر بے حد پیار آیا۔''

''پہلی دفعہ پیار آیا؟'' میں کچھ سمجھی نہیں اماں۔

''ہاں پت اپنی جندڑی ہر کسی کو پیاری ہوتی ہے۔ پر جب کوئی دوسرے کے لیئے خود کو مشکل میں ڈالتا ہے تو بندے کا دل اس سوچ سے بھر جاتا ہے جسے لوگ پیار کہتے ہیں۔''

''تو پھر آپ کو پیار ہو گیا.........؟'' پروین اپنی دراز پلکیں پٹ پٹاتے ہوئے بولی۔

''بے وقوف پیار تو پہلے سے ہی تھا اس کا کہنے کا موقع مل گیا۔''

''وہ کیسے! اماں.........؟''

''میں نے لطیف کے پیو کو سردی سے ٹھٹھرتے دیکھا تو بول پڑی۔'' آپ ادھر کیوں بیٹھے ہیں ادھر آ جائیں میرے پاس۔ لطیف کے پیو نے مجھے بولتے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ میں نے پہلی دفعہ شادی کے بعد اس سے کلام کیا تھا۔ کتنی دیر تو اسے بھی سمجھائی نہ دیا کہ کیا کرے۔ وہ میرے پاس نہ آیا مجھ سے پرے ہی رہا۔ پتہ نہیں مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی۔ میں منجی سے اٹھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بستر پر لے آئی۔ وہ لیٹا تو میں بھی اس کے ساتھ لیٹ گئی۔''

''پھر کیا ہوا! اماں؟'' پروین کی آنکھوں میں تجسس اور شرارت ایک ساتھ ناچ رہی تھیں۔

''چل خاموش ہو جا پھر کچھ نہیں ہوا۔ اپنے گھر جا شام ہونے والی ہے تیری ماں اڈیکتی ہو گی۔''

''نہیں اماں مجھے بتاناں پھر کیا ہوا؟'' وہ سیداں مائی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چھوٹے بچے کی طرح ضد کرنے لگی۔

''باقی پھر کسی دن سناؤں گی.........اب تُو گھر جا۔''

''نہیں اماں! میں نے بغیر نہیں جاؤں گی۔'' پروین اڑیل اور ضدی بچے کی طرح بولی۔

سیداں مائی اپنی گہری نیلی آنکھوں سے کچھ لمحے پروین کو گھورتی رہی۔ پھر گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''اچھا میں تیری بات مان لیتی ہوں مگر تُو مجھ سے وعدہ کر کہ جو میں تجھ سے پوچھوں گی سچ سچ بتائے گی۔''

''ہاں اماں! بالکل سچ بتاؤں گی.........'' پروین گردن ٹیڑھی کر کے مسکراتے ہوئے بولی۔

''اچھا تو میں پھر کیا کہہ رہی تھی.........؟'' مائی جانتی تھی مگر پروین کی دلچسپی کی حد کو جاننے کے لیے اس نے ایسے کہا تھا۔

پروین فٹ سے بول پڑی۔ ''آپ نے کہا تھا وہ لیٹا تو میں بھی اس کے ساتھ لیٹ گئی۔''

''ہاں مجھے یاد آیا۔ جب ہم دونوں لیٹ گئے تو.........ہم ایک دوسرے سے ذرا پرے ہو کر لیٹے۔ منجی پرانی سی جگہ تھی کہ اگر تھوڑا سا ہم دونوں میں سے کوئی ہلتا تو ہمارا جسم ایک دوسرے سے ٹکراتا۔ تھوڑی دیر تو ہم لیٹے رہے۔ رضائی ہم دونوں پر پوری نہیں آ رہی تھی۔ دونوں کو سردی لگ رہی تھی۔ جب سردی اپنی حد ٹاپنے لگی تو میں بڑی آہستہ آواز میں بولی۔'' مجھے پالا لگتا ہے.........'' پالا اتنا بھی نہیں تھا کہ مجھ جیسی کو بولنا پڑتا کہ پالا لگ رہا ہے میں نے ایسا کسی وجہ سے کہا تھا۔''

''اماں! آپ تو پھر چھپی رستم نکلیں.........میرا مطلب ہے بڑی شرارتی نکلیں.........'' پروین اپنے سینے کو اپنی رانوں کا دباؤ دیتے

ہوئے بولی۔

''تُو بھی تو بڑی شرارتی ہے.......... میں جانتی ہوں..........'' سیداں مائی پوپلے ہونٹوں سے ہنستے ہوئے بولی۔

''اچھا اماں بتانا پھر کیا ہوا..........؟'' اس کے سینے پہ دباؤ اور زیادہ بڑھ گیا۔

''پھر کیا ہوا..........؟'' پھر یہ ہوا کہ لطیف کا پیو تھوڑا تھوڑا کھسکتا ہوا مجھ سے آ لگا۔

''مجھے بھی سردی لگ رہی ہے.......... رضائی چھوٹی ہے ناں..........'' اس کے دل کا چور بھی باہر آ کر بولنے لگا۔

میں پھر تھوڑا سا آگے کھسکی وہ بھی کھسکا اور ہم نے بہت زور سے رضائی اوڑھ لی۔ میں اس کے سینے میں گھسی جا رہی تھی۔ مجھے اپنا کوئی ہوش نہ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پھسلنے لگے تھے، کھیلنے لگے تھے۔ راکھ میں دبی چنگاری کو کسی نے ایندھن دکھایا تو وہ بھڑک کر الاؤ کی شکل اختیار کر گئی۔ پھر پتہ نہیں کتنی دیر یہ الاؤ روشن رہا۔ جلاتا رہا تپش دیتا رہا۔ اس طرح کر کے صبح ہو گئی۔ جب میں کمرے سے نکلی تو پہلے والی سیداں نہیں تھی۔''

''کیا ہو گیا تھا آپ کو؟'' پروین حیرت سے بولی۔

''مجھے اڑنے والے پر لگ گئے تھے۔ میں سارے گھر میں اڑتی پھرتی تھی.......... اڑتی پھرتی تھی۔ جیسے لالڑی اپنے گھونسلے کے چکر لگاتی ہے۔ اس طرح میں سارا دن اپنے کمرے کے چکر لگاتی کہ میرے سر کا سائیں کھیتوں سے کب لوٹے گا۔''

''تو اس دن کے بعد آپ انہی کے کمرے میں سونے لگیں؟'' پروین ہاتھ کو حیرت سے گھما کر بولی۔

''تو اور کیا.......... میں پھر اس کے بغیر سو ہی نہیں سکتی تھی۔''

''کیا بات ہے۔'' پروین تالی بجا کر جھومتے ہوئے بولی۔ اس کے لیے یہ سب ایسا تھا کہ جیسے فلم کے آخر میں ہیرو ہیروئن کا ملاپ ہو جائے۔

''پت! کیا کہا تو نے..........؟''

''نہیں اماں کچھ نہیں.......... پھر بتاؤ کیا ہوا؟ وہ رات کو گھر آیا..........؟'' پروین آنکھیں مٹکا کر بولی۔

''چل پت اٹھ! شاباش اب اپنے گھر جا شام پڑنے والی ہے کل کے لیے بھی کچھ باتیں چھوڑ دے۔''

''ہائے میں مر گئی، مجھے تو خدیجہ کو گھر بھی چھوڑ کے آنا تھا۔'' پروین چیخ مار کر اٹھتے ہوئے بولی۔

پروین سیداں مائی کو سلام کر کے واپس مڑی۔ ابھی وہ تھوڑا سا ہی چلی ہو گی کہ مائی پیچھے سے بولی۔ ''پروین پت! رک میری بات سن۔''

پروین نے رک کر حیرت سے مائی کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔ ''تو کسی سے پیار کرتی ہے نا..........؟'' پروین کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس کے دیدے پھٹے ہوئے تھے آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔

''نن.......... نہیں تو اماں۔'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''پت! سچا پیار کرنے والے جھوٹ نہیں بولا کرتے۔'' سیداں مائی دانائی سے پلکیں جھکاتے ہوئے بولی۔

''مگر............اماں............''

''نہ پتر نہ............اب جھوٹ نہ بول............میں نے سب کچھ تیرے چہرے پہ پڑھ لیا ہے۔ تُو اس سے خود سے بھی بڑھ کر پیار کرتی ہے۔ بتا اس کا نام کیا ہے؟''

''ہاں اماں! میں پیار کرتی ہوں............کرتی ہوں میں پیار'' بہت بڑے پہاڑ کا بوجھ اس کے سینے سے اتر گیا۔

واحد سیداں مائی تھی جس کے سامنے اس نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ اس کا وجود اس سے ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

''اماں! میں نے آج تک کسی کو نہیں بتایا کہ میں کسی سے پیار کرتی ہوں۔ صرف تمہیں بتایا ہے۔ تم یہ بات............کہیں کسی سے کر نہ دینا''

''باؤلی ہوئی ہے تُو............یہ بات بھلا کسی سے کرنے والی ہے۔ میں تجھے بھی نصیحت کروں گی کہ تو کسی کو اپنے پیار کے بارے میں نہ بتانا۔ یہاں تک کہ اپنی کسی قریبی سہیلی سے بھی نہیں۔ اس سے بوجھ تو ہلکا ہو جاتا ہے۔ پر سارے زمانے میں محبت کا ڈھنڈورہ پیٹا جاتا ہے۔ محبت تو سب کچھ خود پہ سہنے کا نام ہے۔ میں تجھ سے اس کا نام نہیں پوچھوں گی کہ مجھے پتہ ہے تو بتائے گی بھی نہیں۔''

''ہاں اماں! میں کبھی بھی نہیں بتاؤں گی............تُو مجھ سے روٹھ بھی جاتی تو کبھی نہ بتاتی۔'' یہ کہہ کر روتے ہوئے پروین سیداں مائی کی سوکھی چھاتی کے ساتھ لگ گئی اور بہت دیر روتی رہی۔ سیداں مائی نے پھر پیار کر کے اسے سیدھا کیا۔ ''چل اٹھ پت! بہت دیر ہو گئی ہے اب گھر جا۔'' سیداں مائی آہستہ سے بولی۔

پروین نے آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے سیداں مائی کی طرف دیکھا اور شمال کی طرف چل پڑی۔ دور مغرب میں ٹاہلی اور پیپل کے درختوں کے پار سورج غروب ہو رہا تھا۔ دم توڑتی سنہری روشنی ہرے چارے کے کھیتوں میں بڑی دور تک چلی گئی تھی۔ کھیتوں سے آگے کچے رستے پہ دھول اڑتی تھی۔ وہاں بھینسوں کے ریوڑ چلے جا رہے تھے۔ ان کے نوجوان رکھوالے پیچھے پیچھے چل رہے تھے اور ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔

آسمان پہ پرندے ایک سمت کو اڑے جا رہے تھے جیسے ہر پرندے کو گھونسلے میں پہنچنے کی جلدی ہو۔ کچھ عورتیں اور بچے اپنی مرغیوں کو گھیر کر گھر میں لے جا رہے تھے۔ کچھ سمجھدار مرغیاں آپوں آپ اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹ رہی تھیں اور ایک پھول سی لڑکی گاؤں کی گلیوں میں چلی جا رہی تھی جس کے پاؤں بھی زمین پر ہوا کی مانند پڑتے تھے۔ اس کی چال میں بڑی لچک تھی۔ اس کی کمر بڑی نزاکت سے آپو آپ ہی بل کھاتی تھی اور اس کے سینے کے اندر دھڑکتا دل کسی کی محبت سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

☆............☆............☆

سومی کی طبیعت کافی دن سے خراب چلی آ رہی تھی۔ اسے نبیل، ماموں کے کہنے پہ کئی دفعہ ڈاکٹر کے پاس لے جا چکا تھا مگر افاقہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے۔ اسے بھوک نہیں لگتی تھی' دو چار نوالے کھاتی تو بھوک مر جاتی۔ اس کا دل گھبراتا رہتا۔ وہ بہت چڑچڑی اور بدمزاج بھی ہوگئی تھی۔ جتنی دوائیں اس نے کھائیں تھیں ان سے ٹھیک ہونے کی بجائے وہ دن بدن کمزور ہونے لگی۔

''بہن انوری! مجھے تو اس لڑکی نے پریشان کر دیا ہے۔ ٹھیک ہونے میں ہی نہیں آتی۔'' نعمانہ پریشان ہوتے ہوئے بولی۔

''حوصلہ رکھو بہن! بچیاں اکثر بیمار ہو جاتی ہیں۔ نبیل سے میں نے کہا تھا کہ دفتر سے واپس آتے ہی اسے کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔'' انوری بیگم اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولی۔

''اللہ میری بچی کو صحت دے۔'' نعمانہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ ان لوگوں کی زبان پر اللہ کا نام صرف ایسے ہی موقعوں پر آتا تھا۔

دفتر میں ایک گھنٹے کی لنچ بریک ہوتی تھی اور وہ پھر نبیل کے سامنے آ بیٹھا تھا۔

''تم پھر یہاں بھی آ گئے۔'' نبیل سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''نبیل باؤ! تجھ کو پتہ ہے کہ مجھے تجھ سے پیار ہو گیا ہے۔''

''پر مجھے تجھ سے پیار نہیں ہوا۔'' نبیل کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔

''نہ یار نہ.........یاڑوں سے جھوٹ نہیں بولتے۔''

''تو میرا یار کہاں سے ہو گیا؟'' نبیل مصنوعی غصے سے بولا۔

نبیل نے اتنا کہا تو وہ اٹھ کر چل دیا۔ وہ چند سال ہی ہوئے لاہور سے یہاں آیا تھا اس کا نام ''شیدا'' تھا.........شرافت عرف شیدا.........وہ اندرون شہر کا رہنے والا تھا۔ لوہاری گیٹ میں پلاسٹک کی ڈوریوں اور شاپر بیگ کی چھوٹی سی دکان تھی اس کی۔

اس کی ملاقات نبیل سے ایک بار میں ہوئی تھی۔ شیدا شراب کے نشے میں دھت پڑا تھا تو نبیل نے اسے اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈالا تھا اور اس کے فلیٹ پر چھوڑ کے آیا تھا۔ تب سے ہی شیدا نبیل کے پیچھے دیوانہ ہوا پھرتا تھا۔ وہ اکثر نبیل کو مسٹر ولیم کے بار پر ہی آ لیتا تھا۔ جب نبیل نے بار جانا چھوڑ دیا تو پھر اس کی ملاقات شیدے سے نہ ہو سکی۔ آج صبح دفتر آتے ہوئے اس کا ٹاکرا اتفاقیہ شیدے سے ہو گیا تھا۔ پھر کیا تھا شیدا صبح سے اس کے لیے دردِسر بنا ہوا تھا۔ جب نبیل نے واسطے ڈال کر اسے دفتر سے نکالا تو وہ چلا گیا مگر اب پھر کنٹین میں اس نے نبیل کو آ لیا تھا۔ اب وہ نبیل کی بات پہ منہ بنا کر واپس چل دیا تھا۔

''اوئے شیدے! رک.........رک میری بات سن۔'' نبیل اٹھ کر اس کے پیچھے لپکا۔

''نہیں چھڈ یاڑ! میں اس قابل ہی نہیں کہ تجھ جیسا یاڑ بناؤں۔'' شیدا دل گرفتگی سے بولا۔

''میں تو اس قابل ہوں نا کہ تجھ کو منا لوں۔'' نبیل گردن ٹیڑھی کر کے شیدے کو دیکھ کر بولا۔

''آ.........میرے گلے لگ جا.........'' نبیل اس کی نقل کرتے ہوئے بولا تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیا اور نبیل سے بغل گیر ہو گیا۔ ''آ ادھر

آ............ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ جا۔'' نبیل کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

''یاڑ! ایک بات بالکل سچ سچ بتا۔''

''یاڑ یوڑ مجھے بعد میں کہنا پہلے مجھ سے ایک وعدہ کر۔'' نبیل کرسی سیدھی کر کے بولا۔

''کیا وعدہ............ کیسا وعدہ............ باؤ؟'' شیدا اپنے مخصوص انداز سے بولا۔

''کہ تو آج کے بعد شراب نہیں پیئے گا۔'' نبیل قطعی لہجے میں بولا۔

''یاڑ! یہ کام تھوڑا مشکل ہے۔''

''اچھا پھر یہ کرسی خالی کر دے............ کوئی اور میز ڈھونڈ جا کر۔'' نبیل غصے سے بولا۔

''یاڑ! ایسے بات نہ کر............ یہ سب ایک دم............ میڑا مطلب ہے یہ سب اتنی جلدی تو نہیں چھوٹے گا۔''

''تو چھوڑنے کی کوشش کرے گا تو چھوٹے گا نا۔''

''وہ............ کوشش تو میں کروں گا............ پر تھوڑا ٹائم لگے گا۔''

''تو کوشش شروع کر دے دیکھ لینا انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب تو یہ برائی چھوڑ دے گا۔''

''اچھا اب دیکھ میں نے تیڑی بات سن لی۔ اب میڑے سوال کا جواب بھی دے۔''

''ہاں پوچھ تو کیا پوچھنا چاہتا ہے۔''

''یاڑ! سچ سچ بتا تجھے کیا پریشانی ہے؟ یاڑوں سے بات چھپائے گا تو............ پھر اچھا نہیں ہوگا............ ہاں۔''

نبیل بڑے غور سے شیدے کی طرف دیکھنے لگا۔ نبیل کو اس لمحے اس پر بڑا پیار آیا۔

''یاڑ! میں تجھے جواب تو یہ دینا چاہتا تھا کہ کوئی پریشانی نہیں ہے۔ پر تُو نے تڑی ہی ایسی لگائی ہے کہ جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں پڑ رہی۔''

نبیل اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا۔

''اوئے خوش کیتا ای ظالماں۔'' شیدا بھڑک کی صورت بولا۔

''یار شیدے! میں واقعی بڑا پریشان ہوں۔ میری ماں میری شادی وہاں کرنا چاہتی ہے جہاں میں نہیں چاہتا۔''

''تو منع کر دے اماں جی کو............ ان کو بتا دے کہ تو شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' شیدا سینہ پھلاتے ہوئے جذباتی لہجے میں بولا۔

''یہی تو مسئلہ ہے ناں............ میں ان کو بہت دفعہ کہہ چکا ہوں کہ میں شادی نہیں کر رہا۔ پر ہر روز گھر جانے پر وہ رات کو مجھے پاس بیٹھا لیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اگر یہاں شادی نہیں کرے گا تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔''

''ہائے اور با............! یہ مسئلہ تو واقعی بڑا کھراب ہے۔'' شیدا فکر مند ہو کر بولا۔

''اچھا یاڑ! جدھڑ ماں جی شادی کا کہتی ہیں وہاں کیا ہڑج ہے کرنے میں۔''

''یار وہ لڑکی مجھے پسند نہیں ہے.........میرے ماموں کی لڑکی ہے وہ۔''

''نبیل یاڑ! ماں پیو کی بات ماننے میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ تو کوڑا گھٹ بھر کے وہاں شادی کر لے.........ڑب تیرے سارے مسلے ٹھیک کرڈے گا۔''

''یار خدا کا خوف کر، رب کو تو رب ٹھیک طرح سے کہہ تو نے رب کو ڑب بنا دیا ہے۔''

''توبہ.........توبہ.........باؤ!'' شیدا کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ ''ڑب تو ڑب ہی ہے ناں.........ہم نے اس کا ناں وگاڑ کے کٹ کھانی ہے اس سے۔''

مجھے لگتا ہے تجھے کٹ ہی پڑنے والی ہوئی ہے ہزار سمجھانے کے باوجود تو ''ر'' تو ''ڑ'' بولتا ہے اور ''ڑ'' کو ر بولتا ہے.........تیرا کوئی پرزہ تو نہیں ڈھیلا؟''

''یاڑ نبیل باؤ! ہم لوگوں کی بولی ہی ایسی ہے ہم اندرون شہڑ کے رہنے والے ہیں ناں.........ہم سے ایسا ہی بولا جاتا ہے۔ ہم سے ایسی شرڑط نہ رکھ کہ ہم بات کرڑنا ہی چھوڑ دیں تم سے۔''

''یار نہیں تُو تو برا ہی منا گیا میں مذاق کر رہا تھا تجھ سے.........سچی بات بتاؤں تمہاری یہ بولی مجھے بڑا مزا دیتی ہے۔ دل چاہتا ہے تو بولتا رہے اور میں سنتا رہوں۔ تیری ''ڑ'' سننے کے لیے ہی تو میں تجھ سے اتنے سوال جواب کرتا ہوں۔''

''باؤ نبیل ایک بات کہوں.........یار تو ویسے ہے بڑا شیطان.........'' شیدا قہقہہ مار کے بولا۔

''اچھا میں شیطان ہوں، تو کون سا فرشتہ ہے؟ ہر وقت وِسکی کے چکر میں رہتا ہے۔'' نبیل اسے چھیڑتے ہوئے بولا۔

''یار! اب تو تجھ سے وعدہ کرلیا ہے۔ اب دن بدن لگتا ہے یہ چھوڑنی ہی پڑے گی۔'' شیدا غمگین ہوکر بولا۔

''اچھا یار! یہ باتیں چھوڑ ہم تیری پریشانی والی بات کرڑ ہے تھے۔ تو مجھے یہ بتا کہ وہ لڑکی تجھے پسند کیوں نہیں ہے.........؟ میڑا مطلب ہے اس میں کھڑابی کیا ہے؟ لولی لنگڑی ہے' آنکھ سے کانی ہے یا پھر.........؟''

''یار! اس میں سے کچھ بھی نہیں.........بس وہ مجھے ایسے ہی پسند نہیں۔ مجھے سادی لڑکیاں پسند ہیں۔''

''تمہاڑا مطلب ہے سادہ حسن۔'' شیدا ایک ڈائریکشن سے اپنے جسم کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔

''ہاں.........ہاں.........سادا حسن.........'' نبیل کی آنکھوں میں پروین کی شبیہہ لہرائی۔

''اوئے یاڑ! کی یاڈ کرادتا ای.........اوئے گوالمنڈی اور بھاٹی کے چوباڑے۔''

''یہ کیا گوالمنڈی' بھاٹی.........یہ کیا کہہ رہے ہو تم.........؟''

''اوئے! لکشمی کی لسیاں' اوئے گوالمنڈی کی نہاڑی' ریگل کے چھولے۔ نبیل باؤ! میں صبح صبح اٹھ کر گوالمنڈی سے نہاڑی لایا کرتا تھا۔ ہم سب گھڑ والے نہاڑی کا ناشتہ کرتے تھے۔'' اس نے ایک دم پینترا بدلا۔ ''آئے اوئے! وہ دوپہر کا ویلہ وہ راستے میں کوٹھوں کی رونق۔''

''تم کوٹھوں پر بھی جاتے تھے؟'' نبیل اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''باؤ یاڑ! ہم چھت کو کوٹھا ہی کہتے ہیں۔'' شیدا برا سا منہ بنا کر بولا۔

''اچھا اچھا.........اب میں سمجھا۔'' نبیل جان بوجھ کر اسے چھیڑ رہا تھا۔

''اچھا یہ کوٹھے شوٹھے چھوڑ.........ہم سادے حسن کی بات کر رہے تھے۔'' شیدا بولا۔ ''تو چاہتا ہے کہ لڑکی سادی ہو.........سادہ حسن۔'' شیدا پھر منہ ٹیڑھا کر کے بولا۔

''ہاں سادہ حسن.........'' نبیل گہری سانس لے کر بولا۔

اصل میں نبیل بے حد پریشان تھا۔ وہ شیدے سے باتیں کر کے اپنا غم غلط کر رہا تھا مگر صرف باتیں کرنے سے وقتی تسلی اور دل کو بہلاوا تو مل جاتا ہے دل کا زخم نہیں بھرتا.........وہ رستا ہے.........وہ رستا رہتا ہے۔

''یاڑ نبیل باؤ! ایک بات کہوں سادہ حسن تجھے یہاں کہیں سے نہیں ملے گا۔ تو مامے کی کری سے ہی شادی کر لے۔ اس سے اچھی لڑکی تجھے کہیں سے نہیں ملے گی۔''

''کیوں نہیں ملے گی.........؟'' نبیل تیز آواز میں بولا

''کیونکہ.........یہ انگریز ساڑے ہی لچے لفنگے ہیں۔ مامے کی کری گھر کی دیکھی ہے.........کم از کم شرم حیا والی تو ہوگی ناں.........

تو بس اسی سے ویاہ کرلے۔"

"اچھا یار! لنچ آف ہو گیا ہے۔ میں چلتا ہوں۔" نبیل اٹھتے ہوئے بولے۔

"تو جا رہا ہے۔ پھر ملاقات کیسے ہوگی؟ گھر کا اڈریس دے کے جا مجھے۔" شید انبیل کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

نبیل نے جیب سے کارڈ نکال کر اسے تھما دیا۔ "یار اس پر گھر کا اڈریس اور میرا فون نمبر لکھا ہوا ہے۔ کبھی کبھی وقت نکال کا ضرور چکر لگا لیا کرو۔" نبیل اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔

"باؤ! تو فکر ہی نہ کر......... میں تیرا ابو ہا پٹ ماڑ دوں گا۔"

"یار شیدے! میرے لیے دعا کرنا......... مجھے دعاؤں کی بڑی سخت ضرورت ہے۔" نبیل غمزدہ لہجے میں بولا اور اس کا جواب سنے بغیر دفتر کی طرف ہولیا۔

☆.........☆.........☆

انوری بیگم نبیل کا انتظار کر کر کے تھک چکی تھی۔ وہ سومی کو ڈاکٹر سے دکھلا لایا تھا۔ اس نے کچھ میڈیسن دی تھیں اور دو دن بعد پھر آنے کا کہا تھا۔ نبیل سومی کو گھر چھوڑ کر باہر جا چکا تھا اور اس نے ماں کو کہا تھا کہ وہ کچھ لیٹ آئے گا اور آگے سے انوری بیگم نے کہا تھا جتنی مرضی لیٹ آؤ۔ مجھے انتظار کرتا ہوا ہی پاؤ گے۔ تم جس چیز سے اپنی جان چھڑانا چاہتے ہو۔ اس سے کبھی تمہاری جان نہیں چھوٹے گی۔ ایک ہفتہ ہوا تم سے مغز ماری کرتے ہوئے بس اب میں تمہیں تین دن کی مہلت دیتی ہوں اگر تم پھر بھی نہ مانے تو وہ ہوگا جو تم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"مام......... مگر آپ میری۔" نبیل نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"خبردار جو مجھے مام کہا......... ایک ہفتے سے میں تجھے بیٹا بیٹا کہہ کر باؤلی ہوئی جا رہی ہوں۔ ادھر بھائی جان مجھ سے تاریخ مانگ رہے ہیں اور میں انہیں اس بات پہ ٹرخا رہی ہوں کہ میں نبیل سے مشورہ کرلوں اور تم ہو کہ بکواس کیے جا رہے ہو۔ تمہارے انکار کا میرے علاوہ یہاں کسی کو علم نہیں اگر کسی ایک کے کان میں بھی یہ بات پڑ گئی تو یہاں قیامت آ جائے گی......... سنا تم نے۔"

اور پھر نبیل ماں کی بات کا کوئی جواب دیئے بغیر باہر چلا گیا تھا۔ وہ غم کی تصویریں دکھوں سے چور فٹ پاتھ پہ چلا جا رہا تھا۔ اس کے سامنے روشنیوں کا ایک سمندر تھا مگر یہ روشنیاں نبیل کو ڈس رہی تھیں۔ اس کے زخموں پر نمک پاشی کر رہی تھیں۔ زندگی نبیل کو بڑے کٹھن دوراہے پر لے آئی تھی۔ ایک طرف پروین کی محبت تھی جس میں تازہ گیلے گلاب کی مہک تھی۔ بارش میں نہائی ہوئی موتیے کی کلیوں کی مسکراہٹ تھی تو دوسری طرف ماں کا حکم تھا۔ پورے خاندان کا وقار اور عزت تھی۔ ماموں کی نوازشوں کا بلند پہاڑ تھا۔ وہ بلند پہاڑ نبیل کے سینے پہ بہت بڑا بوجھ بنا کھڑا تھا۔ اس بوجھ سے نبیل کا دم گھٹتا جا رہا تھا۔ اس پہاڑ کا اپنی جگہ سے سرک جانا ناممکن تھا اور اگر پہاڑ اپنی جگہ سے نہ سرکتا تو نبیل کی محبت ادھوری رہ جاتی۔ اب نبیل کو ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔ یا تو اپنی محبت بچالے یا پہاڑ کے بوجھ سے ہی انکار کردے مگر نبیل کے لیے پہاڑ کے بوجھ سے انکار کرنا بھی اتنا مشکل تھا جتنا

پہاڑ کا اپنی جگہ سے سرکنا۔ نبیل پہاڑ کے بوجھ نیچے آیا ہوا نیم جاں بدقسمت تھا۔

اسے نہیں پتہ چلا وہ کب روڈ ٹرین پہ سوار ہوا کب اترا۔ خیالات کا تسلسل تب ٹوٹا جب اسلامک سنٹر اس کے سامنے تھا۔ اس نے آستین سے آنسو صاف کیے اور اندر داخل ہو گیا۔ محمد علی اندر ہی بیٹھے تسبیح کر رہے تھے۔ نبیل کو ایک نظر دیکھ کر ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور آنکھیں مونده کے کچھ پڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ فارغ ہوئے تو نبیل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''بیٹے! پریشانی زیادہ ہو تو انسان خدا کے اور زیادہ قریب ہو جاتا ہے۔''

''ہاں بابا جان! میں اس کے قریب ہونا چاہتا ہوں۔''

''تو بیٹا! مخلوق سے محبت شروع کر دو وہ بھی تم سے محبت کرنے لگے گا تمہارے قریب آ جائے گا۔''

''وہ کیسے بابا جان؟'' نبیل نمناک آنکھوں کو جھکاتے ہوئے بولا۔

''اپنے حق چھوڑتے جاؤ دوسرے کے پورے کرتے جاؤ۔ دوسروں کی کوتاہیوں کو درگذر کرتے جاؤ۔''

''بابا جان! میرے لیے سب سے زیادہ حق کس کا ہے؟''

''بیٹے! اللہ اور اس کے رسول کا۔''

''حق ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟'' نبیل روانی میں بولتا جا رہا تھا۔

''ان کے حکموں کو مانا جائے' ان کے بتائے ہوئے طریقوں پہ چلا جائے۔''

''اللہ اور اس کے رسولؐ کے بعد کس کا حق ہے؟''

''تمہارے ماں باپ کا خاص طور پر تمہاری ماں کا۔''

''ماں.........ماں کا کیا حق ہے؟''

''یہ کہ اس کی نافرمانی نہ کی جائے.........اس کا ہر حکم مانا جائے۔''

''اگر غلط حکم ہو تب بھی؟''

''ہاں۔ اگر خدا اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کا کہے تو نہیں ماننا چاہیے کیونکہ یہ حق کو جھٹلانا ہے۔''

''اور اگر دنیا کے بارے میں ایسا حکم کریں کہ جس کا ماننا ناممکن جیسا ہو تو پھر.........'' نبیل کی درد سے ڈوبی آواز ابھری۔

''ان کو پیار سے سمجھایا جائے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر پھر بھی مسئلہ ٹھیک نہ ہو تو بہر حال ان کا احترام ملحوظ رکھا جائے۔ ان کی رائے مقدم رکھی جائے۔''

''بابا جان! میں بے حد پریشان ہوں۔ میرے لیے دعا کیجئے۔'' نبیل بڑے کرب سے بولا۔

''بیٹا! حوصلہ رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گاڈ جو بھی کرے گا تمہارے حق میں بہتر کرے گا.........اور یاد رکھنا۔ اس کی ذات فائدہ میں

سے نقصان نکال سکتی ہے اور نقصان میں سے فائدہ نکال کر دکھا سکتی ہے۔ بس اس پر پکا بھروسہ رکھو اگر وہ تمہارا ہو گیا تو تمہیں کسی چیز سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

نبیل وہاں سے تقریباً تین گھنٹے بعد اٹھا۔ وہ کافی حد تک پر سکون ہو چکا تھا۔ وہ سڑک پہ چلتے ہوئے سوچنے لگا۔ پہلے وہ جب رات کا کافی حصہ گزار کر کسی کلب سے نکلا کرتا تھا تو اس کی طبیعت میں کتنی کثافت کتنی بے کلی ہوتی تھی۔ اب جب آج وہ اسلامک سنٹر سے نکل رہا تھا تو اس کا دل اور ضمیر کتنا مطمئن تھا۔ ایسا مطمئن جیسا اچھا رزلٹ مل جانے والے طالب علم کا ہوتا ہے۔ ''میں ماں کو منا لوں گا۔'' اس نے دل میں سوچا۔ ''آخر ماں ہے میری۔ جب میں اپنی خواہش کا اظہار کروں گا تو وہ پہلے انکار کرے گی۔ جب میں اپنی ضد پر اڑ جاؤں گا اور انہیں بتا دوں گا کہ میں پروین سے بے حد پیار کرتا ہوں۔ تو وہ تھوڑی بہت منت سماجت کرنے پر مان جائے گی.........اسے ماننا ہوگا.........'' مسرت نے نبیل کے دل میں چٹکی لی۔

جب وہ گھر پہنچا تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ ''ماں میرا انتظار کر رہی ہوگی۔'' اس نے دل میں سوچا۔ ''آج میں ماں کے آگے دل کا سارا حال بیان کر دوں گا۔'' وہ ماں سے بات کرنے کے لیے پوری تیاری میں تھا۔ جب وہ ماں کے کمرے کے پاس پہنچا۔ دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا اور انوری بیگم سو چکی تھی۔ اس نے ماں کو ڈسٹرب کرنا بہتر نہیں سمجھا اور اپنے کمرے کی طرف ہو لیا۔ صبح بھی وہ جلدی اٹھ کر باہر نکل گیا۔ سارا دن دفتر میں بیٹھا بھی وہ یہی سوچتا رہا کہ ماں سے بات کیسے شروع کرے۔ وہ بڑی بے چینی سے شام کے ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے ماں کو قائل کرنا تھا۔ ہر صورت ہر قیمت پر۔ شام ہونے سے پہلے نبیل کے باس نے اسے کسی دوسرے علاقے میں بہت ضروری کام سے بھیج دیا۔ نبیل کی واپسی اگلے دن ہونا تھی۔ اس نے فون پہ گھر اطلاع کی اور اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ سارے رستے بھی وہ سوچوں کے بھنور میں ڈوبتا رہا۔ ''ماں نے اگر انکار کر دیا.........؟ وہ بالکل ہی نہ مانی.........تو؟'' اس کے دل میں سوال اٹھا۔ ''نہیں ماں کو ماننا ہوگا اسے بیٹے کی خواہش کا خیال کرنا ہوگا۔ میری ماں ایسی بھی سنگدل نہیں کہ میرے دل کی بات کو رد کر دے.........وہ باس کے حکم سے دفتر سے اٹھ آنے سے پہلے گاؤں ایک اور خط پوسٹ کر چکا تھا۔ اس کے سامنے اس وقت بڑے شہر کی بلند بلند عمارتیں اور بڑی بڑی شاہراہیں تھیں مگر اس کے اندر مکئی اور ساگ کی باس تھی۔ اس کی سانسوں میں کچی مٹی اور ہرے باجرے کی مہک گھلی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے کچی اور دھول اڑاتی چوڑی پگڈنڈی تھی جس کے اطراف میں مٹی لہرائی تھی۔ جس کے پار دور بہت دور ٹاہلی کے بوٹے پہرے داروں کی طرح کھڑے تھے۔ سارا کام نمٹا کر اس کی واپسی اگلے دن شام کو ہوئی۔ وہ واپسی پر سیدھا اپنے آفس پہنچا۔ مینجر کو کام کے متعلق ساری صورتحال سے آگاہ کر کے نبیل واپس گھر کی طرف ہو لیا۔

آج اس کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ ہونے والا تھا۔ آج اسے ماں کو قائل کرنا تھا۔ وہ سارا پلان ذہن میں ترتیب دے چکا تھا۔ وہ گھر پہنچا تو انوری بیگم اس کی منتظر تھی۔ ''مام! کیا بات ہے؟ آپ کچھ پریشان نظر آ رہی ہیں۔'' نبیل ماں کو سلام کرنے کے بعد بولا۔

''نبیل! سوی کو پتہ نہیں کیا ہے.........؟ ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟'' انوری بیگم الجھن میں بولی۔

''سوی ڈاکٹر کو بس یہی کہتی ہے کہ بھوک نہیں لگتی اور ڈاکٹر کہتا تھا دو دن میڈیسن استعمال کر کے دیکھیں تیسرے دن آ کر مجھے دوبارہ چیک کروا لیں۔'' میں ذرا کپڑے تبدیل کر لوں پھر میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔

''ہاں بیٹا! تمہارے ماموں کو تو اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ وہ بچوں کو توجہ دے سکیں۔ تم ہی اس گھر کے بڑے ہو۔ تمہیں ہی یہ سب کرنا ہے۔''

''مام! آپ سوی کو کہیں کہ وہ تیار رہے میں ابھی چینج کر کے آ رہا ہوں۔'' نبیل اپنے کمرے میں گھستے ہوئے بولا۔

''بیٹا! میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔'' انوری بیگم بولی۔

''مام! آپ فکر مند نہ ہوں آپ آرام کریں میں ٹھیک طرح سے اس کا چیک اپ کرواؤں گا۔''

جب نبیل کپڑے تبدیل کر چکا تو انوری بیگم سوی کو اپنے ساتھ ہی لے آئی۔

''ہیلو سوی! کیسی ہو تم..........؟''

سوی نے کوئی جواب نہیں دیا اور نبیل نے بھی برا نہیں منایا۔ اسے علم تھا کہ وہ اس وقت اپنی بیماری کی وجہ سے پریشان ہے۔

''مام! آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ سوی بالکل ٹھیک ہو جائے گی اور ہاں.......... مام! میں نے آپ سے ایک ضروری بات بھی کرنی ہے وہ میں واپس آ کر کروں گا۔'' نبیل ماں کے کان میں ہولے سے بولا۔

سوی سارے رستے خاموش رہی۔ وہ بے حد پریشان نظر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر کے کلینک میں بھی وہ برابر پہلو بدلتی رہی۔

''سوی! ڈاکٹر صاحب جو کچھ پوچھیں انہیں صاف صاف بتانا۔ میرا خیال ہے تم اپنی بیماری کے بارے میں کچھ چھپاتی ہو۔ جب تک مریض اپنے معالج سے کھل کر بات نہیں کرتا اپنی بیماری کے بارے میں نہیں بتاتا تو معالج کیسے تشخیص کر سکتا ہے؟''

جب ان لوگوں کی باری آئی تو دونوں ڈاکٹر کے بنے ہوئے شیشے کے کیبن میں چلے گئے۔

''آپ لوگ پہلے بھی آ چکے ہیں؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''جی ہاں دو دن پہلے آئے تھے۔'' نبیل نے مختصر جواب دیا۔

ڈاکٹر نے نام پوچھ کر فائل نکالی اور سوی کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ''اب آپ کیسا فیل کر رہی ہیں..........؟ اب آپ کو کتنی بھوک لگ رہی ہے؟''

''ڈاکٹر صاحب! بھوک لگتی ہے۔ کھانا کھانے کو دل چاہتا ہے مگر جب کھانا سامنے آتا ہے تو ساری بھوک مٹ جاتی ہے۔ ایک لقمہ لینے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ نیند بہت زیادہ آتی ہے۔ سارا جسم دکھتا ہے ہر وقت دل گھبراتا رہتا ہے۔ کبھی کبھار بخار بھی ہو جاتا ہے۔'' سوی نبیل کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق بولتی چلی گئی۔

''آپ نے یہ سب باتیں پہلے تو نہیں بتائی تھیں۔'' ڈاکٹر فائل کے صفحے الٹتے ہوئے بولا۔

''بس ڈاکٹر صاحب! یہ کچھ پریشان تھی۔'' نبیل سوی کی جگہ بولا۔

''ان کا بلڈ ٹیسٹ کروانا پڑے گا۔ ایک ٹیسٹ پیشاب کا بھی ہوگا۔'' ڈاکٹر چھوٹے لیٹر پیڈ پہ ٹیسٹ کے لیے کچھ ہدایات لکھتے ہوئے بولا۔

ڈاکٹر کے خیال میں یہ ٹائی فائیڈ تھا۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس لیے اس نے خون کے سارے ٹیسٹ لکھے تھے۔ سارے ٹیسٹ ملنے میں آدھا گھنٹہ لگنا تھا۔ ڈاکٹر بات کل پر ڈالنا چاہتا تھا مگر نبیل نے کہہ دیا کہ ہم ٹیسٹ آنے تک یہیں پر انتظار کر لیں گے۔

آدھا گھنٹہ دونوں نے کلینک میں ہی بیٹھ کر گزارا۔ آدھے گھنٹے کی بجائے پندرہ منٹ میں رپورٹ آ گئی۔ ڈاکٹر نبیل اور سومی کی طرف دیکھ کر تھوڑا سا مسکرایا اور بولا۔ ''آپ کے مریض کو تو بہت خطرناک بیماری ہے......... یہ ماں بننے والی ہیں۔'' شیشے کے اس کیبن میں ڈاکٹر کا جملہ کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ سارا شیشے کا کیبن نبیل کی نظروں کے سامنے گھوم گیا تھا۔ سومی نے ہچکیوں کے ساتھ رونا شروع کر دیا تھا۔ نبیل خاموشی سے آگے بڑھا رپورٹ ڈاکٹر کے ہاتھ سے لی سومی کا بازو پکڑا اور کلینک سے باہر نکل گیا۔ گاڑی کے اندر بیٹھنے تک خاموشی رہی۔ جونہی گاڑی چلی اس کے ٹائر چرچرائے تو نبیل سومی پر پھٹ پڑا۔ ''کہاں اپنا منہ کالا کر کے آئی ہو؟ بدبخت......... اتنا تو سوچ لیتی تم مسلمان ہو......... مسلمانی کا اتنا خیال نہیں تھا تو خاندان کی عزت کا خیال ہی کیا ہوتا۔ گناہ کی دنیا کے پتہ نہیں کون کون سے کیڑے تمہارے جسم پر رینگتے ہیں۔ کون اس بچے کا وارث ہوگا؟ اسے کس کا نام دوگی......... ؟ یہ کس کو اپنا باپ کہے گا؟'' نبیل طیش کے عالم میں بولتا جا رہا تھا۔ ''بولو......... جواب دو یہ کس کو پاپا کہہ کر پکارے گا؟'' نبیل سومی کے بازو کو زور سے جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔

''شکیل کو......... شکیل کو یہ اپنا باپ کہے گا......... شکیل ہے اس بچے کا باپ۔'' سومی چیختے ہوئے ڈیش بورڈ پہ اپنا ماتھا ٹکا کر بولی۔

زمین و آسمان نبیل کی نگاہوں میں گھوم گئے تھے۔ اسے یوں لگا تھا جیسے بہت اونچا درخت کٹ کر گرا ہے اور سیدھا اس کے اوپر آ پڑا ہے۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو! سومی؟'' نبیل کے منہ سے بمشکل نکلا۔ نبیل کی نظروں میں اس دن والا واقعہ گھوم گیا جب اس نے دونوں کو اوپر والے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔

''میں نے اسے بارہا سمجھایا کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہے مگر وہ کہتا تھا کہ ہماری شادی ہونے والی ہے۔'' سومی مسلسل روتے ہوئے بولی۔ کتنی ہی دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر نبیل نے اسے مخاطب کیا۔ ''دیکھو سومی! ادھر میری طرف دیکھو یہ آنسو صاف کر لو......... تمہارے اور میرے علاوہ ابھی کسی کو خبر نہیں ہے کہ تم شکیل کے بچے کی ماں بننے والی ہو۔'' نبیل سومی کے کندھے کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم کسی سے یہ بات نہیں کرو گی کہ تم امید سے ہو۔ میں......... باقی میں سب کچھ سنبھال لوں گا اور دیکھو گھر میں جا کر بالکل نارمل حالت میں رہنا۔ میں کچھ ایسا کرتا ہوں کہ تمہاری اور شکیل کی شادی ایک دو ہفتے کے اندر اندر ہو جائے گی۔''

سومی روئی آنکھوں سے نبیل کی طرف دیکھنے لگی۔ ''سچ بھائی! آپ......... مجھ سے جھوٹ تو نہیں بول رہے.........'' وہ آنکھوں میں آئے آنسو صاف کر کے بولی۔

''نہیں میری بہنا! یہ میرا وعدہ ہے تم سے.........'' نبیل گھمبیر آواز میں بولا۔

گھر پہنچ کر سومی اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ اسے نبیل نے سب کچھ سمجھا دیا تھا کہ گھر والوں کو کیا کہنا ہے۔ خود نبیل تھکے تھکے قدم اٹھاتا ماں کے کمرے کی طرف ہو لیا۔ کمرے میں داخل ہوا تو انوری بیگم شکیل کو پاس بٹھائے باتیں کر رہی تھیں۔ نبیل نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا اسے

لاک چڑھا دیا اور تھکے ہوئے انداز میں ماں کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''نبیل! کیا بات ہے.........؟ تو ٹھیک تو ہے نا.........؟ اور سومی کا ڈاکٹر نے کیا بتایا؟'' انوری بیگم ایک ہی سانس میں بولی۔

''ماں! مجھے شکیل کو اپنا بھائی کہتے ہوئے شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔'' نبیل شکیل کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ شکیل نے اس طرح نبیل کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے منہ بنایا۔

''کیا بات ہے مجھے ایسے گھور کیوں رہے ہو؟'' شکیل لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔

''شکر کرو گھور ہی رہا ہوں۔ تم پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔'' نبیل غصے کی شدت کو دباتے ہوئے بولا۔

''تم مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے؟'' شکیل بھی غصے کے عالم میں اٹھ کھڑا ہوا۔ انوری بیگم خطرے کی کیفیت بھانپتے ہوئے آگے بڑھی۔ ''کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو.........؟ کیوں ایک دوسرے سے الجھ رہے ہو.........؟''

''ماں.........! یہ......... یہ جو شکیل ہے ناں......... ماں گناہ گار آدمی بھی اپنا علاقہ چھوڑ کر واردات کرتا ہے مگر اس ذلیل نے اپنے ہی گھر میں جونک لگائی۔ اپنے ہی گھر کی عزت کو داغدار کیا۔''

''نبیل! تم کیا کہہ رہے ہو میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا؟'' انوری بیگم سینے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''ماں! یہ سومی کے ناجائز بچے کا باپ بننے والا ہے۔'' غصے اور بے بسی کے آنسو نبیل کی آنکھوں میں تیرنے لگے۔ نبیل کی بات سن کر انوری بیگم وہیں دل لے کر بیٹھ گئی۔ ''نبیل! نبیل بیٹا......... یہ تم کیا کہہ رہے ہو.........؟'' انوری بیگم کے منہ سے بڑی نحیف آواز نکلی۔

''ہاں ماں! یہ سچ ہے......... اس بدبخت نے.........'' نبیل کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔

شکیل بے حد طیش کے عالم میں آگے بڑھا اور اس نے نبیل کا گریبان تھام لیا۔ ''بکواس کرتے ہو تم......... جھوٹ بولتے ہو تم......... تم جلتے ہو مجھ سے اس لیے تم نے مجھ پر یہ الزام لگایا ہے۔'' شکیل غصے کی حدوں کو پھلانگتے ہوئے نبیل کے گریبان کو جھٹکا دے کر بولا۔

جواباً نبیل نے اس کا گریبان پکڑ کر زوردار تھپڑ اس کے گال پر جڑ دیا۔ شکیل تو پہلے ہی بپھرا ہوا تھا۔ وہ نبیل پر ہاتھ اٹھانا چاہتا تھا۔ انوری بیگم موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے آگے بڑھی اور دونوں کے بیچ میں آ گئی۔ جہاں غصے کی بلند دیواریں آسمان سے باتیں کر رہی ہوں وہاں رشتوں کا تقدس کیا معنی رکھتا ہے۔ وہ دو غصیلے انسانوں کے درمیان کھڑی ہوئی عورت ماں نہیں رہی تھی۔ رکاوٹ بن گئی تھی۔ شکیل نبیل پر ہاتھ اٹھا رہا تھا اور انوری بیگم اسکے اٹھے ہاتھ کو اپنے قابو میں کرنے کی سعی کر رہی تھی۔ غصے کے عالم میں شکیل نے ماں کو ایک دھکا دیا اور نبیل سے بھڑ گیا۔ انوری بیگم چکراتی ہوئی صوفے پہ گری اور پھر یکدم اس کی آنکھیں الٹ گئیں۔ اس کا جسم ایک دم سے اکڑ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے رنگ سرسوں کی طرح زرد ہو گیا۔ چہرے پہ بے تحاشہ پسینہ پتہ نہیں کہاں سے امڈ آیا۔ پہلے نظر شکیل کی پڑی اور وہ نبیل کا گریبان چھوڑ کر ماں کی طرف متوجہ ہوا۔ نبیل نے اس کی تقلید کی۔ چند لمحے چند سیکنڈ پہلے ایک دوسرے کی جان کے دشمن نوجوان اب مل کر ایک عورت کو گاڑی میں ڈال رہے تھے جو ان کی ماں تھی۔ جس نے ان کو جنا تھا۔ ہسپتال تک کا سفر بڑی مشکل سے کٹا۔ نبیل گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ شکیل ماں کا سر اپنی گود میں رکھے پچھلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کی اپنی

حالت بھی بڑی پتلی ہو رہی تھی۔ وہی شکیل جو چند لمحے پہلے خونخوار بھیڑیئے کا روپ دھارے ہوئے تھا۔ اس وقت ماں کا سر اپنی گود میں رکھے کسی سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں کے کٹوروں میں لرز رہے تھے اور وہ بڑی لرزتی ہوئی آواز میں ماں سے مخاطب تھا۔ ''مام! آنکھیں کھولو.......... مام! آپ کو کیا ہو گیا..........؟ یہ.......... یہ سب کیا ہو گیا؟''

شکیل کی حالت دیوانوں کی سی ہو رہی تھی۔ نبیل کو ڈرائیونگ کرتے ہوئے بار بار انوری بیگم کے ساتھ ساتھ شکیل کو بھی دیکھنا پڑ رہا تھا جو مسلسل ہذیانی انداز میں انوری بیگم کے ماتھے اور گالوں پر بوسے دے رہا تھا۔ ہاتھوں سے اس کے گال تھپتھپا رہا تھا۔

''شکیل! میرے بھائی پریشان نہ ہو.......... ماں کو کچھ نہیں ہوا.......... ٹھیک ہو جائے گی ماں..........'' نبیل اس کے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ حالانکہ نبیل شکیل سے کم پریشان نہیں تھا۔ پچھلی سیٹ پہ بیٹھے شکیل نے روتے ہوئے اپنا سر بھائی کے کندھے پر رکھ دیا تھا اور ہچکیوں کے ساتھ رونے لگا تھا۔ ''نبیل.......... !نبیل میرے بھائی مجھے معاف کر دو۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو.......... میں جھوٹا ہوں' میں کمینہ اور ذلیل ہوں۔ میں نے اپنے گناہ پر پردہ رکھنے کے لیے تم سے بدزبانی کی.......... تمہارا گریبان پکڑا میں نے.......... میں بہت نیچ ہوں۔ میری وجہ سے ماں کا یہ حال ہو گیا.......... پلیز.......... پلیز بھائی کچھ کرو.......... ماں کو بچا لو۔ میں.......... میں وعدہ کرتا ہوں۔ جیسا آپ لوگ کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔ بس.......... بس ایک دفعہ میری ماں کو بچا لو.......... میں ماموں کے قدموں میں گر جاؤں گا ان سے معافی مانگ لوں گا.......... میں.......... سومی کو اپنانا چاہتا ہوں بھائی۔'' شکیل پر جیسے غنودگی چھائی جا رہی تھی اور وہ بولتا چلا جا رہا تھا۔

''شکیل.......... !ہوش کرو.......... ہوش کرو شکیل..........'' نبیل نے سخت پریشانی کے عالم میں شکیل کو جھنجھوڑا تو اس نے پھر سے آنکھیں کھول لیں۔

''ماں کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے.......... میرا خیال تو یہی ہے۔ ہسپتال بھی آنے والا ہے۔''

''تم ہوشیار ہو جاؤ..........'' نبیل شکیل کو الرٹ کرتے ہوئے بولا۔

انسانی ذہن بھی کیا چیز ہے۔ پل میں کچھ پل میں کچھ۔ وہی بھائی جو تھوڑی دیر پہلے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوئے جا رہے تھے۔ اب سب کچھ بھول بھال کر ماں کی جان بچانے کی فکر میں تھے۔ غصہ ایک وقتی اور حواس پر چھا جانے والی چیز ہے۔ جب یہ نامراد اترتا ہے تو بہت کچھ بہا کر لے جا چکا ہوتا ہے۔

ایمرجنسی میں پہنچتے ہی تین چار بندے ایک اسٹریچر اٹھائے ہوئے آئے انوری بیگم کو اس پر لٹایا گیا اور اے۔ سی۔ یو میں پہنچا دیا گیا۔ شکیل نبیل کے گلے لگ کر دھاڑیں مار کر رونے لگا۔

''نبیل بھائی! یہ کیا ہو گیا۔''

''کچھ نہیں صبر کرو.......... اور خدا سے دعا مانگو۔''

شکیل دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر فرش پر ہی بیٹھ گیا اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگا۔ نبیل اسے اسی حالت میں چھوڑ کر اے۔ سی۔ یو کی طرف

بڑھا تو اسے واپس لاؤنج میں بھیج دیا گیا۔ لاؤنج میں واپس آ کر نبیل نے اپنے موبائل سے گھر فون کیا اور ماموں کو آگاہ کیا۔ وہ گھر سے اتنی جلدی میں نکلے تھے کہ انہیں کوئی ہوش نہیں رہا تھا کہ ماموں کو ساتھ لے لیں یا سوئی ہوئی عینی کو ہی اٹھالیں۔ عینی ابھی تک اس حادثے سے بے خبر تھی۔ فون پر اطلاع کرنے کے بعد نبیل بے حال سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سر چھت کی طرف کر کے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے رب سے دعا کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں بچپن سے لے کر اب تک کے مناظر گردش کرنے لگے۔ ان کی ماں نے ان پر کتنی محنت کی تھی۔ بچپن کا زمانہ لڑکپن اور پھر جوانی کا زمانہ نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ پھر پانی بہتا گیا۔ دعا میں آنسوؤں کی نمی شامل ہو گئی تھی۔ شکیل فرش پہ بیٹھا آہ وزاری کر رہا تھا جبکہ نبیل کرسی پہ بیٹھا اپنے رب سے لو لگائے ہوئے تھا۔ تقریباً بیس منٹ بعد نبیل کے ماموں ممانی عینی اور روبی بھی ہسپتال پہنچ گئے۔

عینی کی حالت بڑی بری ہو رہی تھی اس کو نعمانہ بیگم نے سہارا دے رکھا تھا۔ سیٹھ افضل بھی بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔

''نبیل! بیٹے یہ سب کیسے ہوا..........؟'' سیٹھ افضل آتے ہی نبیل کے کندھے پر دکھ سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

''بس ماموں..........! پتہ ہی نہیں چلا..........'' نبیل کرب سے ہاتھ مروڑتے ہوئے بولا۔

''انوری کیا سوئی ہوئی تھی..........؟'' سیٹھ افضل بولا۔

''نہیں ماموں! ہم سے باتیں کر رہی تھیں۔ میں اور شکیل امی کے پاس کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔'' نبیل کی پھر سے ہچکی بندھ گئی۔

''بھائی جان! کیا ہوا مام کو..........کدھر ہیں مام..........'' عینی نبیل کے ساتھ لگ کر بولی۔

''عینی گڑیا! دعا کرو..........ماما ٹھیک ہو جائیں گی..........'' نبیل اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولا۔

سیٹھ افضل کی وہاں جان پہچان تھی وہ ایمرجنسی کی طرف چلا گیا۔ نغمانہ بیگم تھوڑی دور پڑے ہوئے شکیل کو دلاسہ دینے کے لیے چلی گئی۔ عینی کو رومی نے سنبھال لیا۔

''نبیل! پھوپھو ہوش میں تو تھیں ناں.........'' رومی دھیمی آواز میں بولی۔

نبیل نے نمناک آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پہ بھی بڑی پریشانی تھی۔

''بس سب لوگ دعا کرو.........'' نبیل نے کہا اور ایک طرف کو چل دیا۔

نغمانہ بیگم شکیل کو دلاسہ دینے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ اس نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔ ''مامی! اگر.........اگر مام کو کچھ ہو گیا ناں تو.........میں زندہ نہیں رہ سکوں گا'' وہ ایک چیخ مار کر بولا۔

''نہیں بیٹا! ایسی بات نہیں کرتے.........تمہاری ماما بہت جلد صحت یاب ہو کر گھر آ جائیں گی۔''

''مامی! میں.........میں بہت برا ہوں۔ میں.........سب سے برا ہوں''

''ناں میرا بیٹا! تو سب سے اچھا ہے۔'' نغمانہ بیگم اسے اپنے ساتھ لگا کر بولی۔

اتنے میں دوسری طرف سے سیٹھ افضل آ گیا.........وہ کچھ مطمئن نظر آتا تھا.........سیٹھ افضل کی طرف سب لپکے۔ نبیل جو دور کھڑا تھا وہ بھی تیز تیز قدم اٹھاتا چلا آیا۔

''ماموں! ماں کیسی ہے.........؟'' سب سے پہلے نبیل بولا۔

''خدا کے فضل سے وہ اب ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے شدید ہارٹ اٹیک ہوا تھا''

''میرے خدایا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے.........'' نغمانہ بیگم عینی کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

شکیل آگے بڑھا اور نبیل سے لپٹ گیا۔ ''بھائی جان! خدا نے میری ماں کو بچا لیا.........خدا نے میری ماں کو بچا لیا.........''

''ہاں شکیل جب خدا سے صدقِ دل سے کچھ مانگو تو وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔''

''اب آپ سب لوگ گھر جائیں۔ ماں کے پاس میں رہوں گا۔'' شکیل آنسو صاف کر کے بولا۔

''بیٹا! یہ لوگ تو یہاں کسی کو بھی نہیں رہنے دیں گے۔'' سیٹھ افضل شکیل سے بولا۔

''ماموں! میں لاؤنج میں بیٹھ جاؤں گا' باہر پارک میں چلا جاؤں گا.........مگر ماں کو ساتھ لے کر ہی گھر جاؤں گا.........'' شکیل قطعی لہجے میں بولا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔'' نبیل بولا۔

''نہیں بھائی آپ گھر جائیں میں یہاں ہوں ناں۔'' شکیل ضد کرتے ہوئے بولا۔

''شکیل! ہم دونوں ہی یہاں رہیں گے۔'' نبیل اس کے کندھے پہ اپنا بازو رکھتے ہوئے بولا۔

''اچھا بھئی! تم دونوں یہاں رہو۔ عینی ہماری طرف ہی لیٹ جائے گی۔ ہم اسے ساتھ لے جاتے ہیں۔'' سیٹھ افضل اٹھتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو فون پہ رابطہ رکھنا۔''

''نہیں ماموں! میں بھی یہیں رہوں گی۔'' عینی بولی۔

''نہیں بیٹی! ہسپتال کا عملہ ابھی آ کر سب کو باہر نکال دے گا تم کہاں سردی میں باہر بیٹھو گی۔''

''چلو بیٹا! گھر چلو......... اللہ نے تمہاری ماں کو نئی زندگی دے دی ہے۔ خدا نے چاہا تو ایک دو دن میں انوری بیگم گھر ہوں گی......... تمہارے پاس......... تمہارے کمرے میں۔'' نعمانہ عینی کے گال کو تھپکتے ہوئے بولی۔

سب لوگ وہاں سے روانہ ہو گئے تو نبیل شکیل کو لے کر باہر پارک میں چلا گیا۔ ٹھنڈی ہوا ہڈیوں میں گھسی چلی جا رہی تھی۔

''شکیل.........! ادھر دیکھو۔''

''جی.........جی بھائی جان!'' وہ سعادت مندی سے بولا۔

''سومی والی بات ابھی کسی سے نہ کرنا۔''

''اچھا بھائی جان!''

''تھوڑے دنوں تک تم دونوں کی شادی کے دن رکھ لیں گے۔''

''جیسا آپ کہیں گے۔''

''خدا نے چاہا تو ہماری ماں بالکل ٹھیک ہو گی۔ ساتھ ہی تمہاری شادی بھی کر دیں گے......... اور ہاں ایک اور ضروری بات اب ہماری طرف سے ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے جس سے ماں کو شاک لگے۔''

''بھائی جان! میرے لیے یہ ایک جھٹکا ہی کافی ہے۔'' شکیل پرے جگمگ کرتی عمارتوں کو دیکھ کر بولا۔

''جس طرح ماں نے ہم لوگوں کی تربیت کی ہے۔ ہماری تعلیم' ہماری خوراک اور لباس کا دھیان رکھا ہے۔ اس طرح کم مائیں ہی کرتی ہوں گی۔''

''ہاں شکیل! ماں نے ہم لوگوں پر بہت محنت کی ہے۔ آج سے پہلے ہم نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ ماں ہمارے لیے کتنی اہم ہے۔''

''نبیل بھائی! میں نادانی میں وہ غلطی کر بیٹھا۔ اب آپ ایسا کوئی طریقہ نکالیں کہ اندر کی بات اندر ہی رہ جائے۔'' شکیل سر جھکا کر کرب سے بولا۔

''ہاں یہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔'' نبیل پرسوچ لہجے میں بولا۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے بھائی کو غور سے دیکھتا بھی جا رہا تھا۔ وہ گمراہ ہو گیا تھا، بھٹک گیا تھا۔ کیونکہ یہ معاشرہ ہی ایسا تھا۔ یہ غلیظ معاشرہ نمک کی کان جیسا تھا جہاں ہر شے نمکین ہو جاتی ہے لیکن کچھ بھی تھا شکیل کی رگوں میں ایک نیک خون تھا۔ حالات کی تپش نے برف پگھلا دی تھی اور یہ خون اپنی تمام تر نیکی کے ساتھ پھر اس کی رگوں میں رواں ہو گیا تھا۔ اچانک اسی دوران

نبیل کے موبائل کی گھنٹی بجی۔ نبیل نے موبائل آن کیا تو S.M.S پر نبیل کے لیے میسج تھا۔ نبیل نے فوراً میسج چیک کیا تو وہ ہسپتال کی طرف سے تھا۔ ہسپتال والوں نے انہیں بلایا تھا۔ شکیل اور نبیل دونوں تقریباً بھاگتے ہوئے ہسپتال میں داخل ہوئے۔ کاؤنٹر پر پہنچے تو انہیں پتہ چلا کہ انوری بیگم کی حالت بہتر ہے اور وہ اپنے بیٹے سے ملنا چاہتی ہے۔ دونوں کو سی۔ سی۔ یو کا رستہ دکھا دیا گیا۔ نبیل نے شکیل کو سمجھایا کہ ماں کے سامنے بالکل نہیں رونا۔ بس انہیں تسلی دینی ہے۔ اپنی کوتاہی کی معافی مانگنی ہے۔ شکیل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ دونوں سی۔ سی۔ یو میں پہنچے تو انوری بیگم نیم دراز تھی۔ اس کے چہرے پہ زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ اس کے بال پراگندہ ہو رہے تھے۔ ایک نفیس سا کمبل تھا جو اس کے گھٹنوں تک دھرا ہوا تھا۔ انوری بیگم کے بائیں بازو پر ایک ڈرپ لگی ہوئی تھی جبکہ آکسیجن ماسک سائیڈ ٹیبل پر پڑا ہوا تھا۔ دونوں بیٹوں کو ایک ساتھ دیکھ کر جیسے اس کی آنکھیں جاگ اٹھیں تھیں۔ شکیل باوجود کوشش کے بھی خود پر قابو نہیں رکھ سکا تھا اور خاموشی سے روتے ہوئے ماں کے قدموں سے لپٹ گیا تھا۔ نبیل نے آگے بڑھ کر ماں کے ماتھے پہ بوسہ دیا تھا۔ انوری بیگم کی آنکھیں خاموشی سے نمناک ہو کر بیٹے کے چہرے کا طواف کرنے لگی تھیں۔

''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو صحت عطا کی۔'' نبیل ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے آہستگی سے بولا۔ انوری بیگم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

نبیل کا دھیان شکیل کی طرف گیا تو وہ سر ماں کے قدموں میں رکھے زار و قطار رو رہا تھا۔ نبیل نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ ایسا نبیل نے جان بوجھ کر کیا تھا تا کہ ماں کو اندازہ ہو جائے جو لڑائی اور غصہ تھا وہ بالکل وقتی تھا۔ شکیل بھی میکے سے رخصت ہونے والی دلہن کی طرح نبیل کے کندھے کے ساتھ لگ کر ہچکیوں کے ساتھ رو رہا تھا۔

اتنا منظر ہی ماں کی ممتا کی ٹھنڈک کے لیے کافی تھا۔ انوری بیگم کی آنکھیں تشکر کے جذبات سے بھر آئیں تھیں۔ وہ دونوں آنکھوں میں دونوں بیٹوں کو سما لینا چاہتی تھی۔

''بیٹا! وعدہ کرو کہ آج کے بعد تم دونوں کبھی نہیں جھگڑو گے۔'' انوری بیگم دونوں کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔

''ہاں مام! یہ ہماری پہلی اور آخری لڑائی تھی۔ میں کبھی بھی بھائی جان کو ایسا موقع نہیں دوں گا۔ سارے فساد کی جڑ میں ہی ہوں۔'' شکیل خود کو کوستے ہوئے بولا۔

''نہیں میرے بھائی! کوئی فساد کی جڑ نہیں ہے۔ بس ہم دونوں تھوڑا تھوڑا بہک گئے تھے۔'' نبیل جان بوجھ کر ماں کے سامنے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ماں! چھوٹا ہے ناں.......... بس کبھی کبھی بڑے بھائی کا ڈانٹنے کا بھی تو جی چاہتا ہے ناں۔''

انوری بیگم کے زرد چہرے پر سکون کی طویل مسکراہٹ پھیل گئی۔ دونوں ماں کی اس مسکراہٹ سے کافی دیر لطف اندوز ہوتے رہے۔ وہ دوبارہ ہم کلام ہو کر ماں کی یہ مسکراہٹ کھونا نہیں چاہتے تھے۔ یہ کائنات کی سب سے حسین مسکراہٹ تھی۔ زندگی کی لطافتوں سے بھرپور خوبصورت اور پیاری مسکراہٹ۔

''عینی کہاں ہے..........؟'' انوری بیگم کی مسکراہٹ ٹوٹی تو دونوں بھی جیسے کسی سحر سے باہر آ گئے۔

''ماں! وہ آئی تھی.......... پھر ماموں وغیرہ کے ساتھ گھر واپس چلی گئی۔'' شکیل بولا۔

''بھائی جان بھی آئے تھے..........؟'' بھائی جان کے نام پہ انوری بیگم کے چہرے پہ برسوں کا کرب پھیل گیا۔ نبیل خطرے کی کیفیت بھانپ گیا۔ اس نے شکیل کو اشارہ کیا کہ وہ باہر نکل جائے جونہی شکیل گیا۔ نبیل ماں کے پاس بیٹھ کر پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ ''ماں جی! خدا کا شکر ہے کہ سب معاملہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ شکیل ابھی بچہ ہے چھوٹا ہے اور نا سمجھ ہے۔ بچوں سے غلطیاں اور نادانیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ اس نے اپنی کوتاہی کا اعتراف کر لیا ہے اور وہ بے حد شرمسار ہے۔ وہ اپنی غلطی کا ازالہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ فوری طور پر سومی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

''ماں جی! آپ کو کسی سے بات کرنے یا صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سارے کام میں خود کر لوں گا۔ آپ کی طرف سے صرف اجازت چاہیے۔ میرا تو خیال ہے کہ اسی مہینے کے آخر میں ان دونوں کی شادی کر دی جائے۔ جتنی شادی لیٹ ہوتی جائے گی اتنا ہی بوجھ ہم پر بڑھتا جائے گا۔ میرے خیال سے تیاری کی بھی اتنی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے گھر والی بات ہے۔ سب سے پہلے ان دونوں کا نکاح پڑھا دیا جائے باقی کام بعد میں بھی ہوتے رہیں گے۔''

انوری بیگم بڑے غور سے نبیل کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ اک اطمینان سا پھیل گیا تھا مگر اس اطمینان کے پیچھے اک الجھن اور پریشانی بھی بے طرح کروٹیں لے رہی تھی۔ پھر یکدم وہ الجھن بھی انوری بیگم کی زبان پر آ گئی۔ ''بیٹا! ایک بات کہوں..........؟'' انوری بیگم بڑی بے چارگی سے بولی۔

''جی ماں جی! کہیں..........؟'' نبیل ماں کے سوال سے لاعلم بولا۔

''مجھے سب سے زیادہ دکھ تو نے پہنچایا ہے۔'' بات کے بوجھ سے انوری بیگم کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

''یہ.......... یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں.......... مام۔'' نبیل حیرانگی سے ماں کی طرف دیکھ کر بولا۔

''بیٹا! مجھے اور نہ ستا۔ رومی سے شادی کے لیے ہاں کر دے۔''

''مگر مام.......... ! میں..........'' الفاظ نبیل کے حلق میں کانٹوں کی طرح چبھنے لگے۔

''تو ہمیشہ سے یہی کچھ کرتا آیا ہے۔ مجھے مار کر ہی دم لے گا۔ ادھر چھوٹے نے یہ گل کھلایا.......... اور ادھر بڑا شادی سے انکار کر رہا ہے۔ تو کیا تیرا مطلب ہے وہ لوگ سومی کی شادی شکیل سے کرنے کے لیے رضامند ہو جائیں گے۔ بڑی بیٹی بیٹھی رہے تو چھوٹی بیٹی کی شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ تمہارے شادی سے انکار کی صورت میں نئی رشتے داری بننے سے پہلے ہی پرانی ٹوٹ جائے گی۔ تمہارے ماموں نے تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ کسی طرف سے بھی کوئی کمی رہنے نہیں دی۔ تمہارے ایک انکار کی وجہ سے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔''

''مگر ماں! میں آپ سے ایک بات..........''

''خبردار! جو تو نے اب یہ لفظ مگر بولا تو.......... تو.......... تو مجھے مارنا چاہتا ہے نا.......... مارنا چاہتا ہے نا مجھے.......... لے..........

لے میں خود ہی اپنا گلہ دبا لیتی ہوں۔'' انوری بیگم کے ہاتھ تیزی سے اپنی گردن کی طرف بڑھے۔ نبیل کے لیے وہ منظر بڑا کربناک تھا۔ اس کی مریض ماں جس کے چہرے کی زردی بھی ابھی نہ چھٹی تھی جو ابھی ہسپتال کے بیڈ پہ پڑی تھی۔ جو چند گھنٹوں پہلے موت کے منہ سے نکل کر آئی تھی۔ اب پھر موت کے منہ میں جانے والی باتیں کر رہی تھی۔

''ماں! میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں کہنا چاہ رہا تھا'' نبیل کی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ انوری بیگم کھینچ کھینچ کر سانس لینے لگی تھی۔ نبیل چیختا ہوا ڈاکٹرز روم کی طرف بڑھا۔ چند لمحوں میں دو ڈاکٹرز اور نرسیں انوری بیگم کے بیڈ کی طرف بڑھیں۔

نبیل کو کمرے سے باہر نکال دیا گیا۔ وہ لاؤنج کی دیواروں سے سر ٹکرانے لگا۔ اسے وہاں سے بھی باہر نکال دیا گیا۔ وہ اکیلا پارک کے بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ شکیل وہاں نہیں تھا۔ نبیل کی آنکھوں میں آنسو تھے اور ذہن گھن چکر بنا ہوا تھا۔ اس کی ماں موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ وہ ماں کا مجرم تھا۔ وہ خدا کا مجرم تھا۔ اسے خود پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ ساری خطاؤں ساری غلطیوں کی جڑ پروین تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ اسے پروین پہ بے حد طیش آنے لگا۔ یہ طیش بھی عجیب طرح کا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ پروین اس کے سامنے ہو تو اس کے گالوں پہ تھپڑ مارتا چلا جائے۔ وہ روکنا چاہے تو بری طرح اسے پیٹ ڈالے جب سارا غصہ اتر جائے۔ اندر کی کڑھن باہر نکل جائے تو آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لے۔ اس کی پلکوں اس کے ہونٹوں اس کی گالوں اور اس کی گردن پر گرنے والے سارے آنسو ایک ایک کر کے اپنے ہونٹوں سے چن لے۔ آنسو چننے کے بعد ہمیشہ کے لیے اس سے رخصت ہو جائے۔ وہ اسے روکنا چاہے تو ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دے۔ یہ آخری ملاپ ہو' یہ آخری بات ہو' اس سے آگے برسوں کی جدائی ہو' قرنوں کا فراق ہو۔ ایسی جدائی ایسا فراق جس کا کوئی کنارہ نہ ہو' کوئی منزل نہ ہو۔ ہاں اس لمحے اس کے ذہن میں یہی کچھ تھا۔ اس نے روبی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ماں تا کے آگے اس نے اپنا سر جھکا دیا تھا۔ اپنی خواہشات اپنی تمناؤں کا گلا گھونٹ کر سب کچھ تباہ ہونے سے بچا لیا تھا۔ تیز رفتار گاڑی گاؤں کے کھیت کھلیانوں بل کھاتی پگڈنڈیوں جھاگ اگلتے ٹیوب ویلوں کو پیچھے چھوڑتی چلی جاتی ہے۔ نبیل کے اندر ذہن کی سکرین پہ بھی وہی منظر چل رہا تھا۔ مکئی کی لہلہاتی فصلیں' پیپل اور ٹاہلی کے درخت بڑی تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ وہ اس کی دسترس سے دور نکلے جا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے محو ہوتے جا رہے تھے۔ دور بہت دور کچے گھروندے مٹی کے دھبوں کی طرح دکھ رہے تھے۔ ان دھبوں کے اوپر کہیں کہیں کالا دھواں اٹھتا تھا۔ اسکے دل کے اندر اٹھتے دھوئیں کی طرح جہاں گاؤں کی فصلیں ختم ہوتی تھیں۔ کھیت ختم ہوتے تھے وہاں ایک نازک سی لڑکی کھڑی ہاتھ ہلاتی تھی مگر گاڑی رکنے کے لیے تو چلی ہی نا تھی۔ وہ تو چلی جا رہی تھی۔ دلوں اور ارمانوں کو روندتے ہوئے۔ گاڑی کو ہاتھ کی ایک جنبش پر کہاں رکنا تھا۔ وہ ہاتھ روکنے کے بجائے الوداعی انداز میں ہلنے لگے۔ پھر ان ہاتھوں ان آنکھوں میں لامتناہی انتظار کی جھاڑیاں الجھ گئیں۔ گاڑی گاؤں کی حدود سے نکل گئی۔ پکی سڑک اور پکے شہر میں آ گئی۔ روشنیوں اور رنگینیوں میں آ گئی.........لندن میں آ گئی۔

نبیل یکدم خیالات سے چونکا اس کے سامنے شکیل کھڑا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ ماں کچھ دیر کے لیے نیم بے ہوش ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں نے چند انجکشن دیئے آکسیجن وغیرہ لگائی.........اب وہ پھر بہتر ہے۔

نبیل نے آنسو صاف کر کے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ انوری بیگم کو وہاں سے چھٹی تین دن کی بجائے ایک ہفتے بعد ملی۔ گھر آئے ہوئے

اس دن اسے پہلا دن تھا جب انوری بیگم نے نبیل کو کمرے میں بلایا۔ یمنی ماں کے پاس بیٹھی تھی۔ انوری بیگم نے اسے باہر بھیج دیا۔ نبیل سعادت مندی سے ماں کے پاس بیٹھ گیا۔

''بیٹا! تو ٹھیک تو ہے نا۔'' انوری بیگم اس کے بالوں میں شفقت سے ہاتھ پھیر کر بولی۔

''ہاں ماں! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کو مجھ میں کوئی خرابی نظر آتی ہے۔'' نبیل مسکرا کر بولا۔

''بیٹا! میں نے تم سے ایک بات کہی تھی...... تمہیں......''

''ہاں ماں! مجھے پتہ ہے......'' نبیل ماں کی بات کاٹ کر بولا ''میں رومی سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' ایک دل میں ٹیس اٹھی ایک دل خوشی اور شادمانی سے بھر گیا۔ ''سچ بیٹا......! تو مجھے بہلانے کے لیے تو یہ سب نہیں کہہ رہا۔ میں...... میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہی۔'' انوری بیگم خوشی سے جھولتے ہوئے بولی۔

''ماں! آپ جلد از جلد ہم دونوں کی شادی کی تاریخ رکھ دیں۔''

''مجھ سے ایک وعدہ کر......'' انوری بیگم نبیل کا ہاتھ اپنے سر پہ رکھتے ہوئے بولی۔

''وہ کیا......! ماں۔''

''تو کبھی...... گاؤں نہیں جائے گا...... اپنی پھوپھی سے ملنے نہیں جائے گا۔'' انوری بیگم مضبوط لہجے میں بولی۔

''اچھا ماں! یہ بھی سہی۔'' نبیل کی آواز کسی کنوئیں سے برآمد ہوئی۔ اس کی آنکھوں کے کٹوروں میں بے پناہ پانی امڈ آیا تھا۔ صبر کا پانی فرمانبرداری اور وفا کا پانی......

''بیٹا! جب سے تو پیدا ہوا مجھے یہی ڈر لگتا تھا کہ ایک دن تیری پھوپھی تجھ کو مجھ سے چھین نہ لے۔ پتہ نہیں یہ کیا وہم تھا۔ مگر...... میرے بیٹے آج تو نے میرا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا ہے۔ خدا اس کا صلہ تجھے ضرور دے گا...... تو نے ایک ماں کی بات کو سنا ہے۔ ماں کی ہاں میں ہاں ملائی ہے۔ خدا تجھے بڑا خوش رکھے گا۔ میں...... میں تم لوگوں کو صرف اس لیے وہاں سے لے کر بھاگی تھی کہ پاکستان میں رہوں گی تو تمہاری پھوپھی کا رابطہ رہے گا اور میرے دماغ میں وہی اندیشے چیختے رہیں گے جنہوں نے میری زندگی حرام کی ہے۔''

نبیل سب کچھ خاموشی سے سن رہا تھا۔ غم جب حد سے بڑھ جائے سہل ہو جاتا ہے۔ انسان خود کو حالات کے دھارے پہ چھوڑ دیتا ہے۔ نبیل نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ وہ ماں کی ساری باتیں اور وضاحتیں بھی سن کر خاموش تھا...... اسے خاموش رہنا تھا۔ اس نے چپ کا روزہ رکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے سب حقوق چھوڑ کر اوروں کے حقوق ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ بڑے دل والا بننا چاہتا تھا وہ دیا لو بننا چاہتا تھا۔

کسی دور دراز علاقے سے سراب بھی اٹھ رہا تھا مگر وہ اس ناپید آواز کا اب متلاشی نہیں رہا تھا۔ اسے کسی چیز کی جستجو نہیں رہی تھی۔ ستاروں سے آگے جو جہاں تھے وہ اب انہیں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا مقدر اس کی منزل بس یہی تھی۔ یہیں اسی زمین پر اس کا آشیاں بننا تھا۔ اس رات نبیل کو اپنا باپ احسن نذیر ہمیشہ سے زیادہ یاد آیا۔ وہ گاؤں کے لیے اتنا کیوں تڑپتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کیسی بے چینی رہتی تھی۔ وہ نبیل کو بار بار

کیوں کہتا تھا کہ گاؤں ضرور جائے۔ نبیل کو اب یوں لگنے لگا تھا جیسے اس کے اندر اپنے باپ کی بوڑھی روح سمائی ہے جو اسے گاؤں کی طرف کھینچتی ہے۔ کھلی فضاؤں کی طرف بلاتی ہے مگر اس نے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی قید کے پروانے پر دستخط کر دیئے تھے تو کیا وہ بھاگ جائے۔ سارے رشتے، سارے ناطوں کو توڑ کر اپنی منزل کی طرف نکل جائے......... منزل جو اس کی منتظر تھی۔ جہاں کوئی دن رات سانسوں کے زیر و بم کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ جو اس کی دھڑکنوں میں سمانے کا متمنی تھا۔ جو اس کے سینے کی گرمی میں اپنی جوانی کو تاپنا چاہتا تھا۔ جو دن رات اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا مگر.........نہیں.........وہ قید سے نکل کر بھاگنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ قید رہنا چاہتا تھا۔ اسے اپنی ماں کو زندہ رکھنا تھا۔ وہ ماں کو زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ برسوں سے قائم پیار کے رشتوں کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ خود غرضی کی بنیاد پہ ایک رشتہ قائم کر کے دس رشتوں سے تعلقات ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی قید میں رہنا تھا۔

☆.........☆.........☆

ساون کی انیس تاریخ ہو چکی تھی۔ ہر گھر میں میلے کی تیاری ہو رہی تھی۔ صبح شاہ مدین کا میلہ لگنے والا تھا۔ جمعے کا دن تو ویسے ہی بڑا بابرکت ہوتا ہے۔ آج ہر کوئی عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد ہی سو گیا تھا۔ آج دائرے پہ بھی بڑوں کا اکٹھ نہیں ہوا تھا۔ ہر کسی کو پتہ تھا کہ صبح جلدی اٹھنا پڑے گا۔ باہر والے کھوہ پر بھی بہت رش ہوگا۔ ہر کسی کو نہانے کی جلدی ہوگی اور پھر سب بڑے بوڑھے جوان اور بڑی عمر کی عورتیں چھوٹی عمر کے بچے اور لڑکے بھی ٹولیوں کی شکل میں پیدل ''مدین وال'' گاؤں کی طرف رخ کریں گے۔ کچھ لوگ ٹریکٹر ٹرالیوں پر روانہ ہوں گے۔ لڑکیاں اور عورتیں ایک طرف کو ہو کر چلیں گی.........جبکہ مرد اور بڑے بوڑھے آگے آگے چلیں گے۔

☆.........☆.........☆

جونہی میاں جی نے صبح فجر کی اذان دی۔ ہر گھر کا دروازہ کھل گیا۔ مسجد کی طرف جانے والے کچے پہئیے پہ دھول اڑنے لگی تھی۔ لوگ ٹولیوں کی شکل میں نمی نمی روشنی میں مسجد کی طرف چلے جا رہے تھے۔ ان میں جوان' بوڑھے' بچے بھی شامل تھے ان میں سے کئی جوان نماز سے پہلے ہی کھوہ پہ نہا آئے تھے۔ سب کے چہروں پہ اک ولولہ ایک جوش پایا جاتا تھا۔ ''مسجد نور'' میں اس صبح کافی رش تھا۔ نماز فجر کے بعد میاں جی نے مختصر سا بیان کیا اور گاؤں کے لوگوں کو بتایا کہ قبر اور مزار پہ سجدہ کرنا قطعاً منع ہے۔ کئی لوگ نادانی میں ایسا کرنے لگ جاتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ اپنے اس فعل سے باز رہیں اور خدا سے معافی مانگیں۔ میاں جی نے یہ بھی کہا کہ میلے کے دوران نمازوں کے اوقات کا خصوصی طور پر دھیان رکھا جائے۔ لوگ میلے ٹھیلے میں جا کر فرض عین سے اکثر غافل ہو جاتے ہیں۔

میاں جی کا بیان ختم ہونے کے بعد لوگ جوق در جوق مسجد سے نکلنے لگے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈک اور نمی تھی جو پوری فضا میں گھلی ہوئی تھی۔ دور کچے گھروندوں سے پرے منجی کے کھیتوں کے بیچوں بیچ ٹیوب ویل چلتا تھا۔ اس کی ''کوکو'' مسجد تک سنائی دیتی تھی۔ کئی گھروں سے چکی کی گھر رگھرر باہر گلی میں سنائی دیتی تھی۔ کچی دیواروں کے چوباروں اور چھپروں سے آج صبح ہی صبح دھواں نکلنے لگا تھا۔ کہیں حقے گڑ گڑا رہے تھے۔ کہیں مرغیاں کڑ کڑا رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی فضا میں دیسی گھی کے پراٹھوں کی خوشبو بھی گھلنے لگی تھی۔

باہر کھوہ پہ بہت رش تھا۔ ٹنڈیں پانی نکال نکال کر کھالے میں پھینک رہی تھیں اور لوگ پانی کے بوکے بھر بھر کر اپنے اوپر پھینک رہے تھے۔ کھوہ پہ ایک عجیب سا سماں بندھا ہوا تھا۔ نہا کر فارغ ہونے والے اپنے ساتھ لائے ہوئے کپڑوں سے جسم خشک کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے سے باتیں کیے جاتے تھے۔ گپ شپ ہو رہی تھی۔

عورتیں گھروں میں نہا رہی تھیں۔ لوگوں کا عقیدہ سا بن گیا تھا۔ نہائے بغیر میلے پہ جانا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ پروین بھی اپنے گھر میں ہینڈ پمپ کے اردگرد چار پائیاں کھڑی کر کے ان پر کپڑا ڈال رہی تھی۔ اسے بھی نہانے کی بہت جلدی تھی۔ کل شام کو ہی آسیہ اسے کہہ گئی تھی کہ صبح جلدی تیار ہو جائے تاکہ میلے پہ جانے والے اگلے جتھوں میں شامل ہو سکیں۔

جنت بی بی نے گھر پہ ہی رہنا تھا۔ اس لیے وہ نہیں نہائی تھی۔ وہ پروین اس کے ابا اور اس کے دونوں بھائیوں کے لیے ناشتہ تیار کر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ پروین کو جلدی تیار ہونے کے لیے آواز بھی دے رہی تھی۔

''جلدی کر پروین تیرے بھائی بھی نہا کر آنے والے ہوں گے۔''

''بس ماں! میں ابھی آئی۔''

''تیرا ابا تو صبح سے ہی نہا دھو کر سفید دھوتی کرتا پہنے چھت پر حقہ گڑ گڑا رہا ہے۔ انہیں کتنی دفعہ کہا ہے کہ خالی پیٹ نہ پیا کریں مگر میری سنتے کہاں ہیں۔''

''کیا ہو گیا جنتے.........آج صبح ہی صبح کیوں شور مچا رہی ہے؟'' چاچا حیات گھر میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

''سلام علیکم چاچا.........!'' جنت بی بی جھکتے ہوئے بولی۔

''وعلیکم السلام پتر.........! تو تیار نہیں ہوئی میلے پہ نہیں جانا؟''

''نہیں چاچا! بڑے دونوں بعد لڑ کے آئے ہیں۔ میں ان کے پیچھے پانی تانی کا انتظام کرلوں گی۔''

''چل یہ بھی ٹھیک ہے.........وہ دین محمد کدھر ہے.........؟'' چاچا حیات اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر بولا۔

''چاچا! وہ چھت پہ ہیں۔ میں آواز دیتی ہوں۔''

''ہاں اسے نیچے بلا.........تم دونوں سے میں نے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' چاچا حیات منجی پہ بیٹھ کر بولا۔

جنت بی بی نے آواز دی تو دین محمد فوراً نیچے چلا آیا۔ ''لے دیکھ اسے میلے پہ جانے کی کتنی جلدی ہے۔ صبح ہی صبح تیار شیار ہو کر بیٹھا ہوا ہے۔'' چاچا حیات نیچے اترتے دین محمد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں چاچا! جیسے تو تو تیار ہو کر نہیں آیا نا۔'' دین محمد دبے دبے جوش میں بولا۔

''اوآ جا.........آ بیٹھ میرے پاس.........ادھر.........جنتے کو بھی ادھر بلا.........اک بڑی ضروری گل کرنی ہے تم دونوں سے۔''

''چاچا خیر تو ہے ناں.........'' دین محمد فکر مندی سے بولا۔

''اوہاں.........خیر ہی ہے.........تو جنتے کو بلا۔''

جنت بی بی بھی اپنے ہاتھ پونچھتے ہوئے منجی کے آگے پیڑھی ڈال کر بیٹھ گئی۔ ''ویکھو تم دونوں میرے سگے دھی پتروں کی طرح ہو۔ جنتے کو تو میں نے اپنے ہاتھوں سے پالا پوسا جوان کیا ہے۔ پھر اپنے ہاتھوں سے اس کا بیاہ کیا۔ اب اس کے دھی پتروں کے بیاہ کا وقت آ گیا ہے۔'' چاچا حیات اتنی بات کر کے چند لمحے خاموش رہا۔ پھر کھنگورا مارتے ہوئے بولا ''میرا مطلب یہ ہے کہ پروین کی شادی جلد ہو جانی چاہیے۔ بشیر کمہار کی چھوٹی کڑی خدیجہ کا واقعہ تو تم لوگوں کو نہیں بھولا ہوگا۔ جب چودھری بہشت علی کے چھوٹے لڑکے کے شہر سے آئے ہوئے دوست نے خدیجہ کے ساتھ بدتمیزی کی تھی۔''

جنت بی بی اور دین محمد خوفزدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ''دیکھ بھئی! اب زمانہ وہ نہیں رہا۔ ہر چیز بدل رہی ہے۔ وہ بھلے زمانوں کے دور اب گئے۔ اب تو ادھر کڑی جوان ہوا دھر اس کا نکاح دے دینا چاہیے۔''

''چاچا! تو بالکل ٹھیک کہتا ہے۔'' دین محمد ماتھے پہ بل ڈالتے ہوئے بولا۔

''میرے خیال ہے شوکے سا اچھا رشتہ اس گاؤں میں نہیں ہے.........آگے تم لوگوں کی مرضی ہے.........تمہارے بیٹے بھی شہر سے آ گئے ہیں۔ ان سے مشورہ کرو.........اور جلد از جلد کسی فیصلے پر پہنچ جاؤ۔ جتنی دیر کرتے جاؤ گے کام مشکل ہوتا جائے گا۔ رشتہ تو کرنا ہی کرنا ہے.........آج نہیں تو کل.........کل نہیں تو پرسوں۔''

جنت بی بی دین محمد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ دونوں کی آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے نیم رضامندی ہو گئی تھی۔ اب وہ حتمی فیصلے کے لیے دونوں بیٹوں سے مشورہ کرنا چاہتے تھے۔

''اچھا میں اب چلتا ہوں۔ تم لوگ سوچ وچار کرلو.......... پھر جب کسی نتیجے پر پہنچ جاؤ.......... تو مجھے بتا دینا.......... میں بات آگے چلالوں گا۔''

''اچھا چاچا! ٹھیک ہے..........'' دین محمد بھی اٹھتے ہوئے بولا۔

''لڑکے تو سارے ہی میلے پر پہنچ گئے ہوں گے اور مجھے اڈیک رہے ہوں گے۔ میں نے تو ویسے ٹریکٹر ٹرالی پے ہی جانا ہے.......... پہنچ جاؤں گا۔'' چاچا حیات خود کلامی والے انداز میں بولا۔

چاچا حیات جا چکا تو جنت بی بی پروین کو آوازیں دینے لگی۔ پروین نہا کر اوپر جا چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں بالوں کو خشک کر رہی تھی۔ اس کی گیلی زلفیں گیلے بدن سے مس ہو رہی تھیں۔ اس نے کالے رنگ کا سوٹ پہنا جس پر زرد پھولوں کی چھوٹی چھوٹی کڑھائی کی ہوئی تھی۔ کتاب میں سے نبیل کے خط کو نکال کر زور سے چوما اور پھر کلانچیں بھرتے ہوئے نیچے آ گئی۔

''لے دیکھ ماں! میں آ گئی۔'' پروین قمیض کا گھیرا دائیں بائیں کھینچ کر ماں کو اپنے کپڑے دکھاتے ہوئے بولی۔

''پُتر! جلدی سے چاٹی بادرچی خانے میں رکھ' تیرے بھائی آتے ہی ہوں گے۔ پھر جلدی سے تم لوگ ناشتہ کر لینا۔ مدین وال کا پینڈا ابھی تو کافی ہے نا۔''

''لے دیکھ ماں! سب کچھ ابھی ہو گیا۔'' پروین چٹکی بجاتے ہوئے باہر چلی گئی اور جنت بی بی اسے دیکھتی رہ گئی۔ کچھ عرصے بعد یہ سب رونقیں' سب شرارتیں' سب لاڈ اس گھر سے رخصت ہو جانے تھے۔

یہ سوچ کر ہی جنت بی بی کی اکھیاں آنسو برسانے لگیں۔ ''جانی دھئے.......... رب تیرا راکھا۔'' بے اختیار جنت بی بی کے منہ سے نکلا۔

پروین کے ناشتہ رکھتے رکھتے ہی اس کے دونوں بھائی بھی پہنچ گئے۔ ''پروین کی بچی! ابھی تو نے ناشتہ تیار نہیں کیا.......... ہم کتنی دیر بعد گھر آئے ہیں۔'' فضل دین پروین کا کان کھینچ کر بولا۔

''بھائی جان! صبح سے آپ کا ناشتہ تیار کر کر کے میں تو بالکل تھک گئی ہوں اور آپ ہیں کہ آتے ساتھ ہی چڑھائی کر دی ہے۔''

''پہلے جب ہم آئے تھے تو تُو اتنی دبلی تھی اب موٹی ہوتی جا رہی ہے.......... بالکل بھینس کی طرح۔'' علم دین پروین کو چھیڑتے ہوئے بولا۔ پروین نے جھوٹ موٹ منہ بنا لیا۔ جنت بی بی جب بادرچی خانے میں داخل ہوئی تو بولی۔

''پروین کو کیا ہوا یہ منہ بنائے کیوں بیٹھی ہے؟''

''ماں! چھوٹے بھائی کہتے ہیں پہلے تم اتنی دبلی تھی اب بالکل موٹی ہو گئی ہو.......... بھینس کی طرح..........'' پروین بھینس پر زور دیتے ہوئے بولی۔

''خاموش جو میری بیٹی کو کسی نے موٹی کہا۔ بیچاری اتنی دبلی پتلی ہے.......... دیکھو کتنے کتنے بازو ہیں اس کے۔''

''ماں! ایک بات تو بتا یہ خوراک تو بھینس جتنی کھاتی ہے موٹی کیوں نہیں ہوتی......؟ لگتا ہے جلتی رہتی ہے۔'' اب کے فضل دین بولا۔

''ہاں جلتی رہتی ہوں۔ اس لیے کہ دو بھائی ہیں اور وہ بھی شہر میں رہتے ہیں۔ اپنی ایک ہی ایک اکلوتی بہن کو چھوڑ کر..........'' پروین مصنوعی خفگی سے بولی۔

''جناب آپ حکم تو کریں.......... جب کہیں گی حاضر ہو جائیں گے۔ پھر کبھی شہر کا رخ نہیں کریں گے۔ شہر والا بلائے گا تب بھی نہیں جائیں گے۔'' علم دین سر جھکاتے ہوئے اداکاری کر کے بولا۔

''تو پھر حکم ہوتا ہے.......... کہ شہر کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا جائے۔'' پروین گردن اکڑاتے ہوئے بولی۔

''جناب والا! ہمارا تھوڑا سا مسئلہ ہے۔'' فضل دین کھنگھورا مارتے ہوئے بولا۔ جنت بی بی تینوں کی بونگیاں سن کر برابر مسکرائے جا رہی تھی۔

''تعمیل ارشاد ہے۔'' علم دین نے ہاتھ کو حرکت دے کر کہا۔

''جناب والا! ہمیں تعمیل ارشاد کے لیے تھوڑا سا وقت درکار ہے.......... وہ اس لیے کہ ہم لوگ کچھ روپیہ پیسہ اکٹھا کرنا چاہتے ہیں۔''

''وہ کس لیے؟'' پروین تیز آواز میں بولی۔

''جناب والا! ہم لوگ اپنی بہن کا جہیز تیار کر رہے ہیں۔ جب جہیز مکمل ہو جائے گا ہم لوگ گاؤں سے واپس آ جائیں گے۔'' فضل دین ''گے'' کو لمبا کرتے ہوئے بولا۔

پروین کی آنکھوں میں چبھن سی ہونے لگی مگر وہ پھر بھی زبردستی مسکرائی۔ ''یہ سب باتیں جھوٹی ہیں! بھائی جان۔''

''کون سی باتیں جھوٹی ہیں؟'' فضل دین کا انداز طنزیہ تھا۔

''جہیز مکمل ہو کر واپس آ جانے والی باتیں۔'' پروین کی آنکھوں میں آنسو لہرا گئے۔

''تو پگلی ہے.......... بھلا ہم نے واپس نہیں آنا تو کدھر جانا ہے۔'' علم دین بولا۔

''جو بھی شہر جاتا ہے۔ ایسے ہی کہتا ہے۔'' پروین دھیمی آواز میں بولی۔

''مگر ہم ''جو'' نہیں ہیں.......... ہم تیرے بھائی ہیں اور ایک بات کان کھول کر سن لے۔ ہمیں دوسرے لوگوں کے ساتھ نہ ملایا کر.......... رب دی سوں۔ تم لوگوں کے ایک اشارے پہ ہم دونوں شہر کو ٹھوکر مار کر گاؤں واپس آ جائیں گے۔ شہر میں تو ہم اس لیے پڑے ہوئے ہیں کہ تھوڑا بہت پیسہ اکٹھا کر لیں۔ روپیہ پیسہ پاس ہو تو عزت ہوتی ہے۔ معاشرے میں ایک نام بنتا ہے بندے کا۔''

''پترو! رب تہاڈا راکھا...... تم دونوں کو کبھی تتی ہوا نہ چھوئے۔'' جنت بی بی نمناک آنکھوں سے دونوں کے سر پہ پیار دیتے ہوئے بولی۔

''کیا بات ہے.......... پتروں سے بڑا پیار جتایا جا رہا ہے؟ ہم کیا مر؟'' یکدم باورچی خانے میں داخل ہوتے ہوئے دین محمد نے بات کو فل اسٹاپ لگا دیا۔ وہ کھنگورا مار کر کوئی اور بات کرنے لگ گیا۔ پروین کو ہنسی روکنی مشکل ہو رہی تھی۔ وہ گھٹنوں میں اپنا منہ دے کر ہنسی روکنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ ابے نے بات ہی ایسی کر دی تھی۔ فضل دین اور علم دین تو تھوڑا سا ہنس کر ہنسی کنٹرول کر گئے تھے جبکہ پروین کو یہ دنیا کا سب

سے مشکل کام نظر آ رہا تھا۔ گھٹنوں میں اس کا سانس پھولا جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا اور وہ ہنسی کی تیز چیخ کو دبانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی برابر اس کی وکھیوں میں گدگدی کر رہا ہے۔ گاؤں میں رہتے ہوئے ان کے گھر کا ماحول عجیب و غریب تھا۔ جب سب اکٹھے ہو جاتے تو آپس میں خوب ہنسی مذاق چلتا تھا۔ باتیں کم ہوتی تھیں منہ سے لطیفے زیادہ پھوٹتے تھے۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ دین محمد کی ادھوری بات احترام میں دب گئی تھی جبکہ پروین کی منہ زور ہنسی احترام کو کاٹ گئی تھی۔ وہ منہ کھول کر کھی کھی کر کے ہنسنے لگی تھی۔

فضل دین اور علم دین جو ہنسی روکے بیٹھے تھے۔ وہ بھی شرمندہ ہوئے جاتے تھے اور ہنسے جاتے تھے۔

''اچھا بھئی! میں تو دائرے میں چلا.........تم لوگ بھی پہنچ جانا۔'' دین محمد صافہ کندھے پر دھرتے ہوئے بولا۔

''آپ ناشتہ تو کر جائیں۔'' جنت بی بی بولی۔

''نہیں.........وہ چاچا حیات کہہ کر گیا تھا کہ ناشتہ میرے ساتھ دائرے پہ ہی کرنا۔'' دین محمد نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر وہاں سے رخصت ہو گیا۔ دین محمد کے گھر نکلنے کی دیر تھی۔ جنت بی بی پروین کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہ اس کی کمر پر مارتی جاتی تھی اور ہنستی جاتی تھی۔

''تو.........تو بس اپنے ابے کی ویرن ہے۔ جدھر اس نے کوئی الٹی سیدھی بات کی تو اسے لے کر بیٹھ جاتی ہے۔''

''ماں! میں کیا کروں ابا باتیں ہی ایسی کرتا ہے۔'' پروین پھر کھی کھی کر کے بولی۔

''ماں! میرا خیال ہے اس کڑی کے بارے میں بھی کچھ سوچنا پڑے گا۔'' فضل دین پروین کی طرف آنکھیں نکال کر دیکھتے ہوئے بولا۔

''اس کا بیاہ کل کرنا ہے تو.........آج ہی کر دیں.........جان چھٹے ہماری.........مغروں لتھے ہمارے۔'' علم دین پروین کی چٹیا کھینچ کر بولا۔ پروین نے اپنی چٹیا چھڑا کر باہر بھاگ جانا چاہا مگر فضل دین نے ہاتھ پکڑ کر اسے پاس بٹھا لیا۔ ''میری سوہنی بھینے! ناشتہ کرلو.........نہیں تو دیر ہو جائے گی۔ آگے ابا چلا گیا ہے اب تم بھی اٹھ کر چلی جاؤ۔ سارا ناشتہ یہاں دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔''

شرم سے پروین کا چہرہ سرخ ہوا جاتا تھا اور وہ سر نیچے جھکائے آہستہ آہستہ سے ناشتہ کرنے لگی تھی۔

''ماں! تو نے بتایا تھا مامے حسنے کا بیٹا نبیل آیا تھا یہاں۔'' علم دین روٹی کا لقمہ منہ میں لیتے ہوئے بولا۔

پروین کے کانوں میں گھنٹیاں سی بج اٹھیں۔ اس کے دل کی دھڑکن یکدم بہت تیز ہو گئی۔ کوئی بھی نبیل کا نام لیتا تھا تو اس کے دل کی حالت ایسی ہی ہو جایا کرتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے حرارت سی پھوٹنے لگتی تھی۔

''ہاں پتر! وہ یہاں پاکستان کسی کام سے آیا تھا تو تین چار دن کے لیے گاؤں بھی آ گیا تھا۔''

''کوئی اور بھی ساتھ تھا اس کے۔'' فضل دین بولا۔

''نہیں اکیلا ہی آیا تھا.........وہ.........وہ یہاں آ کر اتنا خوش ہوا کہ میں بتا نہیں سکتی۔ اس کے پیر زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ وہ.........وہ جیسے گاؤں کی کھلی ہواؤں میں اڑا پھرتا تھا۔'' جنت بی بی دور کہیں دیکھتے ہوئے بولی اس کی آنکھوں میں حسنے کی شبیہہ تھی۔

پروین کے دل میں کہیں کھد بد ہوتی جاتی تھی۔ وہ ماں کو خط کے بارے میں بھی یاد دلانا چاہتی تھی مگر باوجود کوشش کے ایسا نہ کر سکی۔

''ماں! ایک بات تو بتا.......... نبیل کیا شادی شدہ ہے؟'' علم دین کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''نہیں پتر.......... ابھی تو اس کی۔'' جنت بی بی کی بات منہ میں ہی تھی کہ فضل دین بیچ میں بول پڑا۔ ''ماں! کیا ہو اگر ہم پروین کی شادی نبیل سے کر دیں۔'' فضل دین ہنس کر بولا۔

پروین ایک دم سے اٹھی اور تیزی سے باورچی خانے سے باہر نکل گئی۔ ''او پروین! ادھر آ بات تو سن۔'' فضل دین آوازیں دیتا رہ گیا مگر پروین نہیں رکی۔ اس کی بریک اپنے کمرے میں جا کر لگی۔ اس کا دل دھڑ دھڑ دھڑکتا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہ دھڑکا تھا۔ اس کا سانس پھولا جا رہا تھا۔ لطیف آنسو آنکھوں کے کناروں سے پھوٹ پڑے تھے۔ اسنے خط کو نکال کر دیکھا چوما اور پھر کتاب کے اندر رکھ دیا۔ یہ عجیب حرکت تھی۔ وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا ہی تھا نبیل تو نہیں تھا مگر پروین کیلئے یہ خط ہی سب کچھ تھا۔ اس کاغذ کے ٹکڑے میں اس کے لمس کی باس چھپی ہوئی تھی اس کی انگلیوں کے پور اس کاغذ سے مس ہوئے تھے۔ وہ بار بار کاغذ چومتی تھی۔ انگلیوں کے پوروں پہ بوسہ دیتی تھی اور نبیل کھڑا محو حیرت اسے تکے جاتا تھا۔

کوئی اوپر چلا آ رہا تھا۔ پروین نے جلدی سے چنری سے آنسو صاف کیے۔ چنری کو چہرے کے گرد لپیٹا اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ باہر فضل دین کھڑا تھا۔ ''ہاں تمہارا کورس پورا ہو گیا۔'' فضل دین پروین کو چھیڑتے ہوئے بولا۔

''کون سا کورس بھائی جان؟'' پروین شہادت کی انگلی سے چنری دائیں کان کے پیچھے لپیٹتے ہوئے بولی۔

''رونے کا کورس میری بہین اور کون سا کورس.......... تم بالکل نہیں بدلیں.......... آنسو ہمیشہ تمہاری آنکھوں کے اوپر دھرے رہتے ہیں۔ جہاں کوئی رشتے کی بات ہوئی وہاں تمہاری آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔'' فضل دین پیار سے پروین کا کان مروڑتے ہوئے بولا۔

پروین نظریں نیچی کر کے مسکرانے لگی۔ اس کی آنکھیں تیزی سے حرکت کرنے لگیں۔ ''چل آ جا نیچے.......... دائرے پہ چلیں آگے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔'' فضل دین نیچے اترتے ہوئے بولا۔

تینوں ایک ساتھ گھر سے نکلے۔ کئی گلیوں سے ہوتے ہوئے وہ دائرے میں پہنچے۔ وہاں عجیب سماں بندھا ہوا تھا۔ رنگ رنگیلے کپڑے پہنے لوگ وہاں موجود تھے۔ سب کے چہروں پہ دبا دبا جوش تھا۔ بہت سے لوگ مدین وال کی طرف چل پڑے تھے۔ کچھ کھڑے اپنے ''ساتھ والوں'' کا انتظار کر رہے تھے۔ چاچا حیات سب کو جلدی چلنے کا کہہ رہا تھا۔ وہ کبڈی والے لڑکوں کو ٹرالی میں سوار کرا رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ کسی کو ماں کی ڈانٹ پڑ رہی تھی تو کوئی کپڑے گندے کرنے کی وجہ سے ماں سے مار کھا رہا تھا۔

کچھ بڑے اور درمیانی عمر کے لوگ بڑے برگد کے نیچے منجیاں ڈالے حقہ گڑگڑا رہے تھے انہیں میلے پہ نہیں جانا تھا۔ انہیں سارا دن دائرے پہ بیٹھ کر گپیں ہانکنا تھیں۔ منجی اور مکئی کی رکھوالی کرنا تھی۔ کبھی کبھی ڈوبومٹی کی طرف سے نالے کے پار سے سور اس طرف کا رخ کر لیتے تھے۔ وہ پھر فصلوں کی فصلیں اجاڑ کر رکھ دیتے تھے۔ یہ سب لوگ ان کے استقبال کے لیے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔

''آسو! آ گئی تو.......... میں کب سے یہاں کھڑی تمہارا انتظار کر رہی تھی۔'' پروین آسیہ کو دیکھ کر کوستے ہوئے بولی۔

''بس کپڑے بدلتے ہوئے کچھ دیر ہو گئی۔'' آسیہ بولی۔

''ایک دن پہلے سے رٹ لگائی ہوئی تھی۔ جلدی گھر سے نکلنا ہے...... جلدی نکلنا ہے......اب خود ہی دیر سے پہنچی ہے۔'' پروین بولی۔

''باقی لڑکیاں کدھر ہیں؟'' آسیہ اِدھر اُدھر دیکھ کر بولی۔

''وہ منجی کے پرلی طرف بیٹھی ہیں۔ چل جلدی کر..........'' پروین آسیہ کا ہاتھ کھینچ کر بولی۔

منجی کی فصل کے ساتھ ہی آٹھ لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان میں خدیجہ اور فہمیدہ بھی شامل تھیں۔ پروین اور آسیہ کے وہاں پہنچتے ہی یہ قافلہ وہاں سے چل پڑا۔ لوگ آٹھ آٹھ دس دس کی ٹولیوں میں چلے جا رہے تھے۔

دین محمد والی ٹولی میں بشیر کمہار' دینو موچی' شرفو نائی' بھولو ماچھی' صدیق ٹینڈ شامل تھے اور اب اصرار کر کے ان لوگوں نے چاچے حیات کو بھی ساتھ ملا لیا تھا۔ اسے ٹرالی سے نیچے اتار لیا گیا تھا۔ بشیر کمہار ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ یہ لوگ چلنے ہی والے تھے کہ بشیر کمہار اا پنا تہبند سنبھالے ہوئے بھاگم بھاگ وہاں پہنچا۔

''اوئے..........کھو..........کھو.......... تے..........تو نے فیر سب کو دیر کروا دی ناں..........'' دینو موچی کے علاوہ کوئی بھی ٹولی میں سے نہ بولا۔

''سب خاموش ہیں تیرے پیٹ میں کیوں پیڑ اٹھ رہی ہے کھو کے؟''

''کبھی کھو کما دیکھا ہے؟''

''ہاں دیکھا ہے۔ بالکل تیرے جیسا ہوتا ہے۔'' بشیر کمہار غصے سے بولا۔

''میں ایک دفعہ ڈوبو مٹی کی طرف گیا تو وہاں لنگور نظر آیا تھا.......... بالکل تیرے جیسا لگتا تھا۔''

بشیر کمہار نے دینو کو گالیاں نکالنی شروع کر دی تھیں۔ سب صافوں کے پیچھے منہ چھپائے ہنسے جا رہے تھے اگر ان کی نوک جھونک ختم ہو جاتی تو پھر سے کوئی مٹی کے تیل کو آگ دکھا دیتا۔

صدیق ٹینڈ نے جب دونوں کو خاموش ہوتے ہوئے دیکھا تو بول پڑا۔ ''چاچا بشیر! چاچا دینو کی تیرے ساتھ اتنی لگتی کیوں ہے؟'' بس اتنا کہنا ہی اس کے لیے کافی تھا۔

''بچپن میں اس کے دماغ میں ایک مچھر چلا گیا تھا۔ اس وقت سے یہ پاگل ہو گیا ہے۔''

''تیرے دماغ میں تو شہد والی مکھی چلی گئی تھی۔ جب وہ.......... ڈس ڈس۔'' دینو ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''جب.......... وہ ڈس ڈس کرتی ہے۔ اس کے دماغ میں بھری توڑی کو ڈنگ مارتی ہے تو پھر یہ.......... وہی بن جاتا ہے.......... کھوتا.......... ہنکنے لگتا ہے.......... ہیں او.......... ہیں او۔'' دینو گدھے کی آواز نکالتے ہوئے بولا۔

''اوئے بھوتنی دے.......... تو اج میرے ہاتھ سے بچ جا۔'' پھر بشیر کمہار دینو کو گالیاں دینے لگ گیا۔ سب کا ہنس ہنس کر برا حال ہوا جاتا تھا۔ صدیق ٹینڈ قہقہے لگا رہا تھا اور اپنے صافے کو ہوا میں اچھال رہا تھا اور منہ سے ''او.......... او'' کی عجیب وغریب آوازیں نکال رہا تھا۔

چاچا حیات نے ڈانٹ کر سب کو چپ کروایا اور پھر یہ ٹولی بھی ''مدین وال'' کی طرف چل پڑی۔ گاؤں سے باہر دور پگڈنڈیوں' خالی کھیتوں میں لوگ ہی لوگ نظر آ رہے تھے۔ رنگ برنگے شوخ کپڑے۔ دھوپ میں سفید لٹھے کی دھوتی کرتے کی چمک........... ہوا میں اڑتے رنگیلے آنچلوں کی بہار۔ گویا کہ ساری بہاریں اس سمے دھرتی پر اتر آئی تھیں۔ ہوا کے دوش پہ سنہرے کھیت بھی جھوم جھوم جا رہے تھے۔ دس بارہ میل کا پینڈا دو گھنٹے میں پورا ہوا۔ ڈیڑھ دو میل پہلے ہی ڈھول کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ جوں جوں وہ لوگ مدین وال کے قریب ہو رہے تھے ڈھول کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔ آواز کے ساتھ ساتھ لوگوں کی دھڑکنیں بھی تیز تر ہوتی جا رہی تھیں۔

فضل دین اور علم دین کی ٹولی میں لڑکے بالے شامل تھے۔ اسی ٹولی میں شوکا اور گوگا بھی شامل تھے۔ ''ہور سنا! فضل دینہ شہر کا کیا حال چال ہے؟'' شوکا فضل دین کے کندھے پہ ہاتھ مار کر بولا۔

''وہاں سب کچھ ٹھیک ہے۔ پر گاؤں والی بات وہاں کہاں۔'' فضل دین مسکراتے ہوئے بولا۔

''یار! سنا ہے کہ تو شادی کروانے والا ہے۔'' شوکے نے جان بوجھ کے کہا۔

''کہاں یار! جوان بہن کے گھر ہوتے ہوئے بھائی شادی کراتے کچھ اچھے نہیں لگتے۔'' فضل دین سر مارتے ہوئے بولا۔ ''پروین کی اللہ کرے شادی ہو جائے پھر شادی کرواؤں گا۔''

''ہاں یار! یہ بات تو نے بالکل ٹھیک کی ہے۔'' پھر شوکا بات کا رخ موڑتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔

آخر وہ سب مدین وال پہنچ گئے۔ پروین اپنی سہیلیوں کے ساتھ چلی جا رہی تھی اور اس نے نبیل کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ ایک پل کے لیے بھی تو نبیل اس سے جدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ نبیل کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہی انسانوں کے سمندر میں داخل ہوئی تھی۔ حقیقت میں تو نبیل ہزاروں میل دور بیٹھا تھا مگر تصورات کی دنیا میں اس نے پروین کے کندھے سے کندھا ملایا ہوا تھا۔ انسانوں کا سمندر........... جہاں بھانت بھانت کے لوگ جمع تھے۔ کسی کے سر پہ سفید پگڑی' کسی کی پگڑی کا اونچا شملہ' کوئی لاٹھی تھامے چل رہا تھا' کوئی جھک کر چل رہا تھا' کچھ سینے فخر سے پھولے ہوئے تھے' جوان سینہ پھلا کر چلتے تھے۔ وہ مونچھوں کو تاؤ دیتے تھے اور اکڑ اکڑ کر پھرتے تھے۔ وہاں بہت سے لوگ تھے مگر وہ نہیں تھا........... ہاتھ پکڑ کر ساتھ چلتے ہوئے بھی وہ نہیں تھا........... وہ اتنی بھیڑ میں بھی بالکل اکیلی تھی........... اکیلی اور تنہا........... صرف اس کا تصور پروین کا ساتھ دے رہا تھا۔

دائیں قطار میں قناطیں ہی قناطیں لگی تھیں۔ کہیں تکے بن رہے تھے' کہیں جلیبیاں نکالی جا رہی تھیں' کہیں پکوڑے تھے تو کہیں مٹھائی بنائی جا رہی تھی۔ فضا میں تیل اور دھوئیں کی باس تھی۔ قناطوں سے بائیں طرف عارضی دکانوں کی ایک اور لمبی قطار تھی۔ جہاں بچوں کے کھلونے گھگھو گھوڑے' چابی سے چلنے والے کھلونے' پلاسٹک کی کاریں' موٹر سائیکلیں........... گھریلو استعمال کی اشیاء مٹی کے برتن' نقش و نگار والے سفید مٹی کے برتن' پھول بوٹے بنی جھجھریں' گھڑے' ہانڈیاں سب کچھ وہاں تھا۔

اس سے آگے جھولے ہی جھولے تھے۔ آسمانی جھولے' گول چکر والے' ڈولی جھولے لڑکیوں کی پینگیں۔ پینگوں کے ساتھ دکانیں تھیں جہاں رنگلے پراندے لٹکے ہوئے تھے۔ نیلے' پیلے' کاسنی' گلابی' ہرے اور سرخ رنگ کے پراندے اس کے ساتھ ہی رنگ برنگی چوڑیوں کی دکان بھی

تھی۔ ہر رنگ اور ہر ڈیزائن کی چوڑیاں وہاں تھیں۔ان میں زیادہ چمکیلی اور شوخ رنگوں کی تھیں۔

ایک طرف جھولوں اور دکانوں سے کافی ہٹ کر زور زور سے ڈھول پیٹا جا رہا تھا۔وہاں کبڈی کے مقابلے ہونا تھے۔مرد جوان بوڑھے اور بچے ادھر کھچے چلے جا رہے تھے۔عورتوں کو اس طرف جانے کی اجازت نہیں تھی۔عورتیں ادھر جانا پسند بھی نہیں کرتی تھیں۔

''پروین! وہ دیکھ کون جا رہا ہے.........اوئے.........وہ اِدھر ہی دیکھ رہا ہے۔'' آسیہ پروین کا بازو کھینچتے ہوئے بولی۔

''کون اِدھر دیکھ رہا ہے؟'' پروین جلدی سے چنزی درست کر کے بولی۔

''وہ.........شوکا.........'' آسیہ نے اشارہ کیے بنا کہا۔اتنی دیر میں شوکا ان کے پاس پہنچ چکا تھا۔

''ہاں بھئی! بڑی سیریں ہو رہی ہیں۔آسو تو گوگے کو تو نہیں ڈھونڈ رہی؟'' شوکا آسیہ کو چھیڑتے ہوئے بولا۔

''نن.........نہیں بھاجی! وہ.........میں تو پروین کے ساتھ چوڑیوں والی دکان پر جا رہی تھی۔'' شرم سے اس کی نظریں زمین پر گڑی جا رہی تھیں۔

''تجھے پتہ ہے گوگا بھی آیا ہے میلے پر؟''

''مجھے کیا پتہ! بھاجی۔''

''ہاں تجھے تو جیسے کسی بات کا پتہ ہی نہیں ہے۔'' پروین اس کے چٹکی لیتے ہوئی بولی۔

شوکا بہت غور سے پروین کی طرف دیکھنے لگا۔''پروین! میں نے آج تیرے بھائی سے پوچھا کہ شادی کب کروا رہا ہے تو پتہ ہے کیا بولا؟ کہنے لگا پہلے پروین کی شادی کروں گا پھر اپنی کرواؤں گا۔''

''پھر تو بھائی کنوارہ ہی رہے گا پروین کا۔'' آسیہ بولی۔

''وہ کیوں بھئی؟'' شوکا کھنگورا مار کر بولا۔

''وہ اس طرح بھاجی! کہ اس پینو کی شادی کبھی بھی نہیں ہونی۔ادھر شادی کا نام لو ادھر یہ رونا دھونا شروع کر دیتی ہے۔''

''تو.........تو تو جیسے قہقہے مار کر ہنستی ہے۔'' پروین نے آسیہ کو ٹہوکا دیا۔

''جب ماں پینو کو چھوڑنے کا خیال آتا ہے تو دل بھر ہی آتا ہے۔'' شوکا مونچھوں پہ انگلی پھیرتے ہوئے بولا۔''اچھا میں چلتا ہوں۔کبڈی کا میچ ہونے والا ہے۔دعا کرو اس دفعہ ہمارا گاؤں پہلے نمبر پہ آئے۔''

پروین خاموش رہی جبکہ آسیہ دعا کی صورت ہاتھ منہ پر پھیرنے لگی۔''آمین.........آمین۔''

میدان سج چکا تھا۔سفید چونے کی لکیر بڑی دور تک چلی گئی تھی۔سفید لکیر کے ساتھ ساتھ وقفے وقفے سے رنگ برنگی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ڈھول پیٹا جا رہا تھا۔چند نوجوان ڈھول کے آگے دیوانہ وار بھنگڑا ڈال رہے تھے۔چاچا حیات لڑکوں کی ٹولی کو کبڈی کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا۔سب لڑکے بڑے غور سے چاچا حیات کی بات کو سن رہے تھے۔

''دیکھو پترو! اب تم سب شیر بن جاؤ۔ مقابلے کا وقت آ گیا ہے۔ تم ذہن میں یہ بٹھا لو کہ تم نے کسی کے آگے چت نہیں ہونا۔''

''اور بھاگنے والے کو بھاگنے نہیں دینا۔''

''ہاں.........شاباش.........اور جو تمہیں ہاتھ لگا کر بھاگنا چاہے اسے کسی قیمت پر بھاگنے نہیں دینا۔ تم نے یہ تصور کرنا ہے کہ بھاگنے والا تمہاری ساری زندگی کی جمع پونجی لے کر بھاگ رہا ہے۔''

سب لڑکے بڑی توجہ سے چاچے حیات کی باتیں سن رہے تھے۔ ان سب کے حوصلے بڑے بلند نظر آ رہے تھے۔ جیسے وہ سب مقابلہ شروع ہونے کے منتظر تھے۔ ڈھولی ڈھول پیٹے جا رہا تھا اور گاؤں کے لڑکے بالے ڈھول کے آگے دھمالیں ڈال رہے تھے۔ ایک گیم شحیم آدمی نے سیٹی بجائی اور دونوں طرف کی ٹیمیں میدان میں اتر آئیں۔ دونوں ٹیموں میں زیادہ تعداد جوانوں کی تھی جبکہ ایک دو ادھیڑ عمر بھی ان میں شامل تھے۔ وہ بڑے منجھے ہوئے کھلاڑی دِکھتے تھے۔ دونوں ٹیموں کے کھلاڑیوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے اور پھر اپنی اپنی پوزیشنوں پر چلے گئے۔ کبڈی کا میدان ایک پیلی پہ محیط تھا۔ دونوں ٹیموں کے جوان آمنے سامنے کھڑے تھے اور ان کا درمیانی فاصلہ دو سو گز کا تھا۔ دونوں ٹیموں کے بالکل درمیان میں دو برجیاں بنائی گئیں تھیں اور اس کے درمیان سفید چونے کی لائن کھینچ دی گئی تھی۔ یہ Win لائن تھی۔ کھیل شروع ہوتے ہی ایک ٹیم کے کھلاڑی کو یہ Win لائن کراس کر کے دوسری ٹیم کے جتھے کے قریب جانا تھا اور کوڈی کوڈی کرتے ہوئے مخالف ٹیم کے کسی بھی کھلاڑی کو ہاتھ لگا کر واپس بھاگنا تھا اور اس نے ہاتھ کھلاڑی کی پشت پر مار کر بھاگنا تھا۔ پشت پر ہاتھ کھانے والے نے مارنے والے کے پیچھے بھاگنا تھا اور مارنے والے نے کسی بھی صورت Win لائن کو کراس کر کے واپس اپنے ساتھیوں میں جانا تھا۔ اس طرح مارنے والی ٹیم کا ایک پوائنٹ ہو جانا تھا اور اگر بالفرض پشت پر مار کر بھاگنے والا ہاتھ کھانے والے کے قابو میں آ جاتا تو Win لائن کراس نہ کر سکتا تو ہاتھ کھانے والی ٹیم کا ایک پوائنٹ ہوتا تھا۔

''تیرے خیال میں ہماری طرف سے کون سالڑ کا کوڈی ڈالنے والا نکلے گا۔'' دینو موچی شرفو نائی کو ٹہوکا دیتے ہوئے بولا۔

''میرے کھیال سے پہلے فیقا نکلے گا۔'' شرفو نائی بولا۔

''نہیں.........نہیں.........پہلے داسو نکلے گا۔'' دینو موچی نفی کرتے ہوئے بولا۔

''تیری ماں کا کھسم نکلے گا۔'' بشیر کمہار دینو سے اکتایا ہوا بیٹھا تھا۔ وہ منہ میں بڑبڑایا۔

اس کی بات دینو کے کان میں چلی گئی۔ وہ گلا کھنکار کے شرفو سے بولا۔ ''اوئے شرفو! کبھی تو نے کھوتے کو پاگل ہوتے ہوئے دیکھا ہے؟''

''کھوتے کو پاگل ہوتے ہوئے؟'' شرفو نائی سوالیہ انداز میں بولا۔

بشیر کمہار کے یکدم کان کھڑے ہو گئے۔ وہ کن اکھیوں سے دینو کی طرف دیکھنے لگا۔

''یار ہلکائے کھوتے کو دیکھا ہے۔ جس کے منہ سے جھگ نکل رہی ہوتی ہے۔ جس کی آنکھوں میں کالا موتیا اترا ہوتا ہے.........بول دیکھا ہے کبھی.........''

''نہیں تو.........'' شرفو تعجب سے بولا۔

''تو دیکھ لے تیرے ساتھ ہی کھڑا ہے۔'' دینو، بشر کمہار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ شرفو نائی نے گڑبڑا کر بشیر کمہار کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ مونچھ کی نوکیں اوپر کو اٹھ گئیں تھیں۔ گرم سانسیں اس کے نتھنوں سے نکل رہی تھیں۔

''اوئے شرفو متر! تو نے کبھی موئے ککڑ کو دیکھا ہے۔ جس کو ککڑیاں ٹھونگے مار مار کے......... مار مار کے مار دیتیں ہیں۔'' بشیر کمہار غصے سے پھنکارتے ہوئے بولا۔

''ککڑ ہی ککڑیوں کو ٹھونگے مارتے ہیں۔ ککڑیاں کبھی ککڑ کو ٹھونگے نہیں مار سکتیں۔'' دینو موچی اپنا دفاع کرتے ہوئے بولا۔

''اوئے! کچھ ککڑ ہوتے ہی ڈرپوک ہیں۔ ککڑیوں سے مار کھا کھا کر مر جاتے ہیں۔''

بشیر کمہار غصے سے منہ ٹیڑھا کر کے بولا۔

''پھر وہ ککڑ تیرے جیسے ہوتے ہوں گے......... مار کھانے والے.........'' دینو منہ چڑھا کر بولا۔

''اوئے سور کے بڈاج میرے ہاتھ سے بچ جا'' بشیر کمہار دینو کا صافہ کھینچتے ہوئے بولا۔

''اوئے جنگلی لومڑ چھوڑ مجھے......... وہ دیکھ فیقا کوڈی ڈالنے کے لیے نکلا ہے۔'' دینو موچی اپنا صافہ کندھے پہ ٹھیک کر کے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''اوئے شاوا......... اوئے شاوا پتر! بھنبیری بن جا اوئے جوانا.........'' بشیر کمہار بڑک مار کے بولا۔

کوڈی شروع ہو چکی تھی۔ فیقا مخالفین کے جتھے کے پاس پہنچ چکا تھا۔ اب اس کو کسی لڑکے کی پشت پر ضرب لگانا تھی اور واپس Win لائن کے پار تک پہنچنا تھا۔ فیقا بڑی پھرتی اور ہوشیاری سے ہلال کی شکل میں بنی لڑکوں کی ٹولی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی جیسے بلی اپنے شکار کے سامنے چھ مار کر بیٹھتی ہے۔ ایسے فیقا کمر جھکائے ہاتھوں کے پنجے سامنے کی طرف کیے شکار کی گھات میں تھا۔

اس نے تاک کر ایک کمزور لڑکے کی پشت پر ضرب لگائی اور الٹے پاؤں واپس پلٹا۔ وہ بڑی تیزی سے Win لائن کی طرف بھاگ رہا تھا اور وہ کمزور لڑکا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ لڑکا فیقے کی سوچ سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا اس نے ایک جست لگائی اور Win لائن سے پہلے ہی فیقے کو آ لیا۔ فیقا اس کے نیچے مچل رہا تھا۔ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ Win لائن اس سے تین چار قدموں کی دوری پہ تھی۔ شور کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بھانت بھانت کو بولیاں سنائی دے رہی تھیں۔ ہر کوئی ''اپنے بندے'' کو ہدایات دے رہا تھا۔ پھر آناً فاناً بازی پلٹ گئی۔

فیقے نے اس لڑکے کو اپنے اوپر سے گھما کر نیچے پھینکا اور Win لائن کی طرف بھاگا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ لائن پار کر گیا۔ فیقے کے حامیوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ آوازوں اور شور شرابے میں ڈھول کی آواز کہیں نیچے دب گئی تھی۔ جہاں بھنگڑے پڑ رہے تھے وہاں سے بہت دھول اٹھتی تھی۔ کبڈی کے منتظمین لوگوں کو ہاتھ کے اشارے سے نیچے بیٹھنے کا مشورہ دے رہے تھے۔

چاچا حیات بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دین محمد اور صدیق ٹینڈ کھڑے تھے جبکہ بشیر کمہار، دینو موچی اور شرفو نائی ان

سے پرے کچھ فاصلے پہ کھڑے کبڈی دیکھ رہے تھے۔

آسانی جھولا دینے والا بہت پھرتیلا لڑکا تھا۔اس نے اپنا عنابی رنگ کا رومال سر پہ باندھ رکھا تھا۔اس کے گھنگھریالے بال رومال کے پیچھے جھاڑیوں کی طرح دِکھ رہے تھے۔وہ بڑی سرعت سے جھولے کے ساتھ لگی سیڑھی والی پٹی پہ چڑھ کر اوپر پہنچ جاتا تھا اور پھر کسی ڈولی کو منتخب کرتا تھا۔پھر کسی عقاب کی طرح اسے اچک کر اس کے ساتھ چمٹ جاتا تھا اور بڑی تیزی سے نیچے آتا تھا۔

پروین آج پہلی بار آسیہ کے اصرار پہ جھولے میں بیٹھی تھی۔پہلے تو جھولا آہستہ آہستہ چلتا رہا مگر جونہی جھولے کی رفتار بڑھی پروین کی چیخیں نکلنے لگیں۔وہ بڑی مشکل سے خود پر ضبط کیے بیٹھی تھی۔تماشہ بننے کا ڈر نہ ہوتا تو وہ اونچی اونچی رو کر جھولا رکوا لیتی۔اس نے مضبوطی سے آسیہ کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔جونہی جھولا اوپر جا کر نیچے آتا تھا۔وہ آنکھیں مضبوطی سے بھینچ لیتی تھی۔اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔آسیہ اس کی ایسی حالت دیکھ کر ہنسی سے دہری ہوئی جا رہی تھی۔

''پروین!اے پروین!تجھے کیا ہو گیا ہے؟''آسیہ بازو پہ چٹکی لیتے ہوئے بولی۔

''آسو کی بچی!میری جان نکلی جا رہی ہے تجھے ہنسنے کی پڑی ہے۔''

''لے دیکھ بھلا!جھولے پہ تو اتنا مزہ آتا ہے۔''

''تجھے آتا ہوگا۔''پروین ایک ہاتھ سے مضبوطی سے لوہے کے ڈنڈے کو پکڑ کر بولی۔

''سچ بتا.........پیٹ میں گدگدی نہیں ہو رہی۔''

''وہ تو ہو رہی ہے۔''پروین کچھ سہمی کچھ ڈری ہوئی ہنسی۔

''تو پھر تو مزہ بھی زیادہ آ رہا ہوگا۔''

''تو چپ نہیں رہ سکتی۔''پروین جھولے کو اور مضبوطی سے پکڑ کر بولی۔

''نہیں رہ سکتی چپ.........لے کر لے جو کچھ کرنا ہے۔''

''تو نا بس ڈھیٹ کی ڈھیٹ ہی رہے گی۔''پروین منہ پرے کر کے بولی۔

''سوہنیوں منہ تے ادھر کرو۔''

''ہاں اب کیا تکلیف ہے؟''

''پروین!رب دی سوں کاش میں منڈا ہوتی۔''

''تو پھر کیا کرتی؟''

''میں تجھے تیرے گھر سے چک کر لے جاتی تجھ سے بیاہ کرتی۔''

''شکل دیکھی ہے اپنی۔''

''اوہو........اسی لیے تو چک کر لے جاتی........تو نہیں سمجھے گی میری جان........تو جدھر کھڑی ہو جائے دس منڈے تیرے لیے جان دینے کے لیے تیار ہو جائیں........پر تو بڑی بھولی ہے........بھولی مجھ ہے تو........''

''آسو! تو ایسی باتیں نہ کہا کر........ہائے میں مرگئی۔'' جھلا وہ پروین والی ڈولی پہ چمٹ کر نیچے گیا تھا جبکہ یہ ڈولی نیچے سے ہو کر اوپر پہنچی تو بری طرح ہچکولے کھانے لگی۔ پروین نے آسیہ کا ہاتھ اور زور سے تھام لیا۔

''ایسی باتیں کیوں نہ کیا کروں........تو پاگل ہے جھلی ہے تو........میں تیری سب سے قریبی سہیلی ہوں اور سب سے ہمدرد بھی........یاد رکھ جو مشورہ میں تجھے دوں گی اور کوئی نہیں دے سکتا۔''

''اچھا دے مشورہ۔'' پروین اس کے چہرے پہ نظریں گاڑ کر بولی۔

''تو نے شوکے کو نہیں دیکھا؟''

''کیوں کیا ہوا ہے اسے؟'' پروین بے پرواہی سے بولی۔

''تو جھلی کی جھلی رہے گی۔ تیرے آگے بولنا بھینس کے آگے بین وجانے والی بات ہے۔''

''اچھا وجا بین۔'' جھولا ہلکا ہونے کی وجہ سے پروین کچھ مطمئن ہوگئی تھی۔

''تو نے شوکے کی آنکھوں میں نہیں دیکھا۔''

''اس کی آنکھوں میں موتیا اترا ہوا ہے کیا؟''

''تیرے دماغ میں موتیا اتر گیا ہے۔ پاگل پیار کرتا ہے وہ تجھ سے۔ اس کی آنکھوں میں صرف تُو ہی تُو ہے۔''

''آسو! بس ادھر ہی رک جا آگے کچھ نہ بول۔'' پروین غصے سے بولی۔

''کیوں نہ بولوں میں؟ تیرے دماغ میں پتہ نہیں کون سا فتور ہے۔ میرے گھر ڈھولکی پہ جب سب لڑکیاں تھیں انہوں نے شوکے کی بات چھیڑی تو تُو وہاں سے اٹھ بھاگی........مجھے یہ بتا کیا تو کسی اور سے پیار کرتی ہے؟''

''نن........نہیں تو........میں........میں بھلا کس سے پیار کرنے لگی؟'' غصے سے بھری پروین کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

''تو پھر تیرے دل میں کیا ہے تو کس کے انتظار میں ہے؟'' انتظار کے نام پہ پروین کو شدید جھٹکا لگا۔ ''تیرے لیے کوئی شہزادہ آسمانوں سے نہیں اترے گا........تو کس فکر میں ہے۔ شوکے جیسے بندے کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی موجود ہے۔ پر وہ کسی کو گھاس ہی نہیں ڈالتا۔ وہ صرف تجھ سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے کی دیکھ لے، وہ کیسے ہمارے پاس چلا آیا تھا جبکہ سب لوگ کبڈی کا میچ دیکھ رہے تھے۔ پروین دیکھ! میں تیری دشمن نہیں تیری ہمدرد ہوں۔ تیری خیر خواہ ہوں۔ میں تیرے بھلے کی ہی بات سوچوں گی اور تیرے فائدے کی ہی بات کروں گی........تو مجھے بتا شوکے میں کوئی کمی ہے۔ روپے پیسے کی طرف سے، شکل وصورت کی طرف سے، خاندان کی طرف سے؟ بول ہے کوئی کمی........کوئی کمی نہیں ہے۔ پھر تو ایسا کیوں کر رہی ہے؟ خوش قسمتی بار بار دروازے پر آ کر دستک نہیں دیتی۔ دروازہ نہ کھولو تو یہ واپس مڑ جاتی

ہے.........واپس۔ تیرے سارے گھر والوں کو تیری شادی کی فکر ہے۔ تیرے ماں باپ تیرے دونوں بھرا تیری شادی کی طرف سے بہت پریشان ہیں۔ میں تجھ سے پورے دو ورے چھوٹی ہوں۔ میری شادی ہور دو ڈھائی مہینوں میں ہونے والی ہے اور تیری ابھی کہیں بات بھی نہیں چلی۔ پروین یہ جو جوانی ہے ناں.........ایک دفعہ چلی جائے مڑ واپس نہیں آتی۔ سارا موج میلہ اس جوانی کا ہی ہے۔ عمر تھوڑی سی بڑی ہو جائے تو رشتہ دیکھنے والے سو سو نقص نکالتے ہیں۔"

پروین نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ خاموشی سے سر نیچے جھکائے آنسو بہانے لگی تھی وہ۔

"پروین! اِدھر دیکھ.........یہ رونا دھونا بند کر.........تُو مجھے بتا تجھے کیا پریشانی ہے؟ اپنی پریشانی کسی کو بتا دیں تو بھار ہَولا ہو جاتا ہے۔ بندہ سکھی ہو جاتا ہے۔ چل شاباش.........بتا مجھے تیرے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ کس بات کا غم تجھے کھائے جا رہا ہے؟"

پروین نے کوئی جواب نہ دیا۔

"پروین! یہ یاد رکھ کڑیاں ماں پیو کے سر کا بوجھ ہوتی ہیں۔ بہت بھاری بوجھ.........یہ بوجھ وقت پہ نہ اترے تو انسان کو ویلے سے پہلے ہی بوڑھا کر دیتا ہے۔ تو چاچے بشیر کی طرف ہی دیکھ لے۔ قسمت نے وقت سے پہلے ہی اس کے سر میں سفیدی بھر دی ہے اسے بوڑھا اور لاغر کر دیا ہے۔ دو کڑیوں کا بوجھ اس کے دونوں موڈھوں پہ ہے۔ تو بتا تو کب تک اپنے ماں پیو کے سر پہ بوجھ بنی رہنا چاہتی ہے۔" آسیہ کی بات پہ پروین ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی تھی۔ وہ خاموش تھی۔ بالکل خاموش.........وہ بولتی بھی تو کیا بولتی۔ قدرت نے اس سے تو قوت گویائی چھین لی تھی۔ وہ گونگی ہوگئی تھی۔ وہ اندھی ہوگئی تھی۔ وہ ہوش و حواس سے بیگانی ہوگئی تھی۔ اسے نبیل کے علاوہ کوئی نہیں دکھتا تھا۔ اس کو نبیل کے علاوہ کوئی نہیں سوجھتا تھا۔ اس کے من میں نبیل کی خوشبو تھی۔ اس کے اندر بہت اندر کچھ بہت دور تک اپنی جڑیں پکڑ چکا تھا۔ واپسی مشکل تھی۔ بس انتظار تھا.........جان لیوا انتظار.........وہ انتظار کے کرب میں جلنا چاہتی تھی۔ وہ دن رات کسی کی راہیں تکتی تھی۔ اس کے آنسو بستر کی خالی جگہ پر نقش و نگار بناتے تھے۔ بستر کی وہ خالی جگہ نبیل کی تھی۔ کوئی اور وہاں کیسے پہنچ سکتا تھا۔ اس نے نبیل کے علاوہ آج تک کوئی سوچا ہی نہیں تھا۔ کچھ چاہا ہی نہیں تھا۔ اس کی سوچ بڑی محدود تھی۔ اس کی چاہت ایک انسان تک محدود تھی مگر وہ سوچ وہ چاہت اس سے سینکڑوں میل کی دوری پر تھی۔ وہ وہاں نہیں پہنچ سکتی تھی۔ نبیل تو یہاں آ سکتا تھا۔ اسے آنا تھا.........پروین کے لیے آنا تھا جو بڑے تحمل اور مستقل مزاجی سے اس کی راہ تک رہی تھی۔ اس کے لیے آنا تھا۔ پروین نے کبھی کسی چیز کی تمنا نہیں کی تھی۔ اس نے کبھی کوئی خواب آنکھوں میں نہیں سجایا تھا۔ پر نبیل کے خواب تو آپوں آپ ہی اس کی آنکھوں میں بسے جا رہے تھے۔

"پلیز نبیل! واپس آ جاؤ.........پلیز.........." اس کے منہ سے سسکاری نکلی۔ "یہ نہ ہو کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے اور میں نقطہ سوالیہ نشان بن کے رہ جاؤں۔ اس سے پہلے.........کہ.........اڑتی محبت کے پر کاٹ کے زندان میں بند کر دیا جائے.........اس سے پہلے کہ پھول ٹہنی پہ سوکھ کر زمین پہ گرے اور پیوند خاک ہو جائے۔"

نبیل میں نے تو تمہارے کہنے پہ پڑھنا بھی شروع کر دیا ہے اور ہاں.........میں لکھنے بھی لگی ہوں۔ گیلی راتوں میں ٹھٹرتی ہوئی

نظمیں.........سنسان راتوں میں آسمان پہ اڑتے پرندوں کی غزلیں.......... جب لمبی دوپہروں کو کوئل کوکتی ہے تو تم مجھے بہت یاد آتے ہو۔ میں اس وقت اپنے بستر پر پہلو بدلتی ہوں مگر تم میرے پاس نہیں ہوتے۔ ہمیشہ کی طرح پاس ہوتے ہوئے بھی بہت دور ہوتے ہو۔ جب بارش کے بعد قوس قزح بنتی ہے تو میں تمہیں اس میں تلاش کرتی ہوں مگر تم وہاں بھی مجھ سے پردہ کر لیتے ہو۔ مجھے بتاؤ کب تک یوں ہی تڑپاؤ گے۔ میرے اندر پیار کے سمندر ٹھاٹھیں مارتے ہیں۔ میں.......... میں سیداں مائی کی طرح تمہارے سینے سے لگ کر سونا چاہتی ہوں۔ نبیل میں ساری ساری رات جاگتی رہتی ہوں۔ مجھے نیند نہیں آتی ہے۔ میں کیا کروں.......... یہ میلہ.........لوگوں سے بھرا ہوا ہے لیکن میرے لیے خالی ہے بالکل خالی۔''

تھوڑا عرصہ پہلے آئے ہوئے نبیل کے خط نے پروین کو بہت حوصلہ بخشا تھا مگر اب آسیہ کی باتوں نے پروین کو اندھیرے کنویں میں دھکیل دیا تھا۔ اس کے سامنے میلہ پورے جوبن پر تھا مگر اس کے لیے یہ سب بہت بے رنگ تھا۔ اداسی میں اسے سب کچھ اداس لگنے لگا تھا۔ جھولے' کھیل تماشے' باجے گانے' مٹھائیوں اور پکوانوں کی خوشبو کچھ بھی تو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

پھر آسیہ پروین کو لے کر مزار کی طرف چلی گئی۔ مزار پر خوب رونق تھی۔ ڈھول بج رہے تھے' گھنگھرو چھنک رہے تھے' دھمالیں ڈالی جا رہی تھیں' چادریں چڑھانے والوں اور تبرک لینے والوں کا اژدھام تھا۔ آسیہ اور پروین اس عمر رسیدہ ملنگ کے سامنے جا کھڑی ہوئیں جسے عقیدت مند شاہ جی کے نام سے پکار رہے تھے اور جو لوگوں کی آسیں' مرادیں پوری کرنے کے لیے دعائیں مانگ رہا تھا۔

اپنی باری آنے پر پروین شاہ جی کے سامنے پہنچی تو وہ یک ٹک اسے دیکھتے چلے گئے۔ اس سے پہلے کہ پروین کچھ کہتی۔ شاہ جی بولے۔ ''ہم تیرے دل کی بات جانتے ہیں بیٹا.......... اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک آس نے تیرے دل میں بڑی دیر سے گھر کر رکھا ہے.......... آس اور تقدیر میں ٹاکرا ہے بیٹا.......... پتہ نہیں آس جیتتی ہے کہ تقدیر.......... ویسے نراش ہونے کی لوڑ نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے آس ہی جیت جائے.......... لیکن اس میں وقت لگنا ہے اور انتظار بھی بہت کرنا پڑے گا۔ بہت زیادہ..........''

پروین حیرت کے عالم میں ہنستی رہی۔ پروین کے بعد آسیہ شاہ جی کے سامنے آئی۔ شاہ جی نے اسے بھی چند باتیں بتائیں۔ پھر وہ دونوں اس ہجوم سے نکل کر منیاری کی دکانوں کی طرف چل دیں۔

آسیہ بڑے تجسس سے پروین کو دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ آخر دل کی بات اس کی زبان پر آ ہی گئی۔ ''پینو! یہ شاہ جی تیری کس آس کا ذکر کر رہے تھے؟''

''مجھے کیا پتہ؟'' پروین نے اداسے کہا۔

''تجھے سارا پتہ ہوگا۔ بس تو ویسے ہی گھنی بنتی ہے۔ شاہ جی بڑے پہنچے ہوئے ہیں۔ کبھی کوئی غلط اندازہ نہیں لگا سکتے۔ بتا کیا آس ہے تیرے دل میں؟''

جواب میں پروین مسلسل اسے ٹالتی رہی۔ آخر آسیہ سر ہلا کر بولی۔ ''میں سمجھ گئی۔ اگر کچھ اور نہیں تو یہ وہی لڑکیوں کے اسکول والی بات ہو گی۔ تیرے دماغ میں یہ پروگرام گھسا ہے کہ تم نے گاؤں میں لڑکیوں کا اسکول کھول کر چھوڑنا ہے۔ ہے نا یہی بات؟''

پروین نے اپنی جان چھوٹتے دیکھی تو بڑے طریقے سے کچھ جھجک جھجک کر آسیہ کی ہاں میں ہاں ملادی۔ پھر باتوں کا رخ ''اسکول'' کی طرف مڑ گیا۔ اسکول کا منصوبہ کئی مہینوں سے پروین کے ذہن میں پروان چڑھ رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ وہ کسی کا گھر بسانے اور اس کی شریک حیات بننے کے لائق نہیں رہی ہے۔ اور اگر وہ ایسا کرے گی تو اپنے ساتھ اور اپنے شریک حیات کے ساتھ بہت بڑا جھوٹ بولے گی اور اگر اسے گھر نہیں بسانا اور بس نبیل ہی کا انتظار کرنا تھا تو پھر انتظار کے پہاڑوں سے بوجھل لمحے کاٹنے کے لیے کوئی وسیلہ تو ہونا چاہیے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسکول کا منصوبہ دن بدن اس کے ذہن میں پختہ تر ہوتا جا رہا تھا۔

اچانک پروین اور آسیہ کو اپنی باتوں سے چونکنا پڑا۔ ڈھول کی زوردار آواز انکے کانوں میں پڑنے لگی تھی۔ ایک بہت بڑا جلوس ناچتا جھومتا ان کی طرف آ رہا تھا۔ جلوس کے شرکاء نے بہت سے لنگوٹی پوش لڑکوں کو کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ لڑکوں کے گلے میں ہار تھے۔ جلوس قریب پہنچا تو ہر طرف سے مبارکباد اور خیر مبارک کا شور بلند ہونے لگا۔ سب سے آگے چاچا حیات تھا۔ دین محمد 'فضلو چاچا' شرفو نائی سب خوش و خرم چلے آ رہے تھے۔

چاچا حیات تیزی سے چل کر پروین اور آسیہ کے پاس آیا۔ خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔ ''پروین پتر..........آسیہ پتر اپنا گاؤں کبڈی جیت گیا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی ایک دوسرے بزرگ نے آگے بڑھ کر گرما گرم جلیبیاں پروین اور آسیہ کے سامنے کر دیں۔ پروین اور آسیہ کو یوں لگا جیسے ہر طرف خوشی اور جوش کا سمندر لہریں لے رہا ہے۔ خوشی کے اس ٹھاٹھیں مارتے ماحول میں دینو موچی اور بشیر کمہار اپنی نوک جھونک بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ ان کی باتوں پر بار بار زبردست قہقہے گونج رہے تھے۔

کبڈی کے بعد گاؤں کے اکثر لوگ مزار پر حاضری دینے چلے گئے۔ ان کو واپس آتے آتے اتنی دیر ہو گئی کہ سورج ڈوب گیا۔ اب ہر شخص کو گاؤں واپس پہنچنے کی جلدی تھی۔ اس موقعے پر شوکے نے بڑی ہمت ماری۔ وہ اپنے واقف کاروں کی طرف گیا اور وہاں سے تین ٹریکٹر ٹرالیاں لے آیا۔ سب لوگ خوشی خوشی ٹریکٹر ٹرالیوں پر سوار ہو کر گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہر کوئی شوکے کی تعریف کر رہا تھا اور شوکا چپکے چپکے چور نظروں سے پروین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی ٹرالی پر سوار تھا جس پر آسیہ اور پروین وغیرہ بھی تھیں۔ اس نے درحقیقت صرف پروین کے لیے یہ ٹرالیوں والا پاپڑ بیلا تھا۔ اب پروین کو خوش دیکھ کر اس کا سینہ اور چوڑا ہو رہا تھا۔

اس ٹرالی پر فضلو چاچا کے دو بیٹے' نوری اور جھوری بھی سوار تھے۔ دونوں خاصے تگڑے اور جی دار لڑکے تھے۔ وہ شوکے سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ پہلے تو بھٹے کی اور پکی پکی اینٹوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر پتہ نہیں کیسے باتوں کا رخ ماضی کی طرف چلا گیا۔ ہنسی ہنسی میں جھوری نے کہا۔ ''ویسے شوکے بچپن میں تو کچھ زیادہ ہی کوڑا تھا۔ یاد ہے ایک دفعہ تو نے روٹی نہ دینے پر اپنی ماں کو روڑا مار دیا تھا۔''

نوری بولا۔ ''اور ہو سکتا ہے کہ وہ بے چاری روڑا کھانے کے بعد ہی گاؤں سے غائب ہو گئی ہو۔''

نوری کا خیال تھا کہ اس کی بات پر زوردار قہقہہ پڑے گا لیکن جب کوئی بھی ہنسا نہیں تو نوری کو اندازہ ہوا کہ اس کے منہ سے ذرا غلط بات نکل گئی ہے۔ وہ خود ہی کھسیانی ہنسی ہنس کر چپ ہو گیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔

گاؤں کے اکثر لوگ جانتے تھے کہ شوکے کی ماں عرصہ پہلے اچانک گاؤں سے چلی گئی تھی لیکن شوکے کے غصے کی وجہ سے کوئی بھی عام

محفلوں میں اس موضوع پر بات کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

دینو موچی اور بشیر کمہار ایک دفعہ پھر ایک دوسرے کو نت نئے ناموں سے پکارنے لگے تھے۔ساتھ ساتھ وہ ہلکی پھلکی ہاتھا پائی بھی کرتے جا رہے تھے۔تھکن سے نڈھال ہونے کے باوجود سب لوگ ان کی باتوں پر مسکرانے پر مجبور تھے۔

ٹریکٹر ٹرالیاں جب دائرے پہ پہنچیں تو رات کافی ہو چکی تھی۔چند بوڑھے اور جوان دائرے پہ منجیوں پہ بیٹھے حقہ گڑ گڑا رہے تھے اور بڑے فکرمند تھے۔ٹرالیاں پہنچتے ہی دائرے پہ میلے کا سا سماں ہو گیا۔مرد آپس میں بات چیت کرنے لگے جبکہ عورتوں نے اپنے گھروں کی راہ لی۔پروین جب گھر پہنچی تو جنت بی بی مصلے پہ بیٹھی نفل پڑھ رہی تھی۔سلام پھیرنے کے بعد اس نے پروین کو خود سے لپٹا لیا۔

''کدھر رہ گئے تھے تم لوگ.......... تیرے بھائی کدھر ہیں؟''

''ماں! وہ دائرے پہ ہیں۔''

''اتنی دیر کیوں لگ گئی؟''

''ماں! وہ..........صدیق ٹینڈ کے کہنے پہ سب لوگ مزار پہ سلام کرنے چلے گئے۔وہیں پہ دیر ہوگئی۔''

''سب خیر خیریت سے پہنچ گئے ہیں ناں..........؟''

''ہاں ماں! اور ہمارے گاؤں نے کبڈی کا میچ بھی جیت لیا ہے۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔''

''ماں! میں نے تجھے خوشخبری سنائی اب جلدی سے مجھے کھانا دے۔''

''پتری! تو مجھے خوشخبری نہ بھی سناتی تو میں نے کھانا تیار کر کے رکھا ہوا ہے۔تجھے کھلائے بغیر کبھی نہ سونے دیتی۔''

''اچھا ماں! جلدی کر مجھے بھوک لگی ہوئی ہے۔''

''بھائیوں کو تو آنے۔'' جنت بی بی بولی۔

''اس وقت تک میرا دم نکل جائے گا۔'' پروین پیٹ پہ ہاتھ پھیر کر بولی۔

''اچھا پھر..........بیٹھ ادھر میں روٹی ڈالتی ہوں۔'' جنت بی بی اسے گھورتے ہوئے بولی۔

''لے مجھے یاد آیا..........ایک خط آیا پڑا ہے۔'' جنت بی بی بولی۔

پروین کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔''کیا کہا..........ماں۔'' وہ جان بوجھ کے ماں کے منہ سے وہ سب سننا چاہتی تھی۔

''پتر دوپہر کو ستار باؤ ایک خط دے گیا تھا اسے دیکھ لینا۔''

''ماں! خط کدھر ہے۔'' پروین نے دھڑکتے دل کے ساتھ باورچی خانے کے پاس جا کر پوچھا۔

''اندر انگیٹھی پہ پڑا ہوا ہے۔'' جنت بی بی اشارہ کر کے بولی۔

پروین تیزی سے اندر کی طرف لپکی خط اٹھایا تو وہی لفافہ وہی الفاظ وہی خوشبو۔ پروین کا جسم دھیرے دھیرے لرزنے لگا۔ آنکھوں کے پپوٹے تیزی سے حرکت کرنے لگے۔ اس نے خط کو مضبوطی سے ہاتھ میں تھاما اور اوپر کی طرف دوڑ لگا دی۔ اپنے کمرے اپنی جائے پناہ کی طرف۔

''مشکل دور ہوگی پر وقت لگے گا۔'' شاہ جی کے الفاظ پروین کے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس نے بڑی عجلت میں لفافہ چاک کیا۔ ایک مسحور کن خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔ نبیل نے سلام دعا کے بعد آگے بہت کچھ لکھا تھا۔ گاؤں کے سب بوڑھوں بڑوں کو سلام' منجی کی فصل کا حال۔ پھوپھو اور پھوپھا کی صحت کا حال۔ خط نہ لکھنے کا گلہ اور آخر میں اس نے لکھا تھا کہ پروین میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ میں گاؤں پہنچ گیا ہوں۔ پھوپھو بیٹھی آٹا پیس رہی ہیں اور تم ان کے پاس منجی پہ بیٹھی پڑھ رہی ہو۔ تمہاری آنکھوں پہ چشمہ لگ چکا ہے۔ تم بہت بڑھا کو ہوگئی ہو۔ تمہاری منجی کے نیچے چوزے پھر رہے ہیں۔ ایک مرغی تمہاری چپل پہ بیٹ کر دیتی ہے۔ تم چپل پہنتی ہو تو............ آگے تمہیں خود پتہ ہے کہ کیا ہوا ہوگا..........؟''

خط کے آخر میں لکھا تھا کہ ''میں بہت جلد گاؤں آنے کا سوچ رہا ہوں۔ میں تو سوچتا ہوں۔ وہیں کہیں زمین لے لوں اور منجی کی فصل بیج دوں۔ صبح صبح اٹھ کر پھوپھا کے ساتھ کھیتوں میں جایا کروں۔ ہر طرف ہریالی دیکھا کروں۔ پھر میرے لیے بھی کوئی کھیتوں میں مکھن کے پیڑے اور چاٹی کی لسی لے کر آیا کرے۔ میں روٹی کے ساتھ اچار لگا کر گھونٹ گھونٹ لسی پیا کروں۔''

خط پڑھنے کے بعد سکون اور بے چینی کی لمبی چادر ایک ساتھ اس کے وجود میں بچھ گئی تھی۔ نبیل کو خط میں ایسی باتیں نہیں لکھنی چاہئیں تھیں۔ پروین کا پنڈا لو دینے لگا تھا۔ اس کے انگ انگ سے حرارت پھوٹ پڑی تھی جو اس کے دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کو ترتیب دے سکتا تھا وہ یہاں نہیں تھا۔ سینکڑوں میل دور تھا.......... درد دینے والے کے پاس ہی مرہم تھا۔ درد تو پہنچ گیا تھا' مرہم ابھی دوری پر تھا۔

''پروین! آ نیچے کھانا کھالے۔''

''ماں! ابھی آئی۔''

''پہلے کھانے کے لیے رٹ لگا رکھی تھی۔ اب خود ہی غائب ہوگئی ہے۔'' جنت بی بی بڑبڑائی۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ پروین خط لے کر اوپر گئی ہے۔

پروین نے چنری اتار کر پلنگ کے پائے پہ دھر دی تھی۔ وہ چت لیٹی تھی۔ آدھ کھلے گریبان پہ کاغذ کا ٹکڑا یوں رکھا تھا کہ عریانیت چھپ گئی تھی۔ خط کے الفاظ اس کی دھڑکن کی ایک ایک زبان پڑھ رہے تھے۔

تینوں باپ بیٹا نیچے آگئے تھے۔ فضل دین اور علم دین ماں کے پاس بیٹھ گئے تھے جبکہ دین محمد حقہ تازہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے علم تھا کہ پروین تھکی ہوگی۔ اسے اٹھانا مناسب نہیں ہوگا۔

''ماں! شوکے سے مل کر میرا دل تو خوش ہوگیا ہے۔'' علم دین کہہ رہا تھا۔

پروین دروازے کی اوٹ سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

''ماں! میں تو کہتا ہوں جلد سے جلد تو رشتے کی بات چلا۔'' فضل دین بڑا پرجوش ہو رہا تھا۔ ''کہیں یہ نہ ہو کہ رشتہ ہاتھ سے نکل

جائے..........ایسے رشتے بار بار نہیں ملتے۔''

''اپنے ابے کو بھی اِدھر ہی بلالو۔'' جنت بی بی بولی۔

دین محمد بھی ان کے پاس ہی چلا آیا۔''ابا! آپ ادھر بیٹھیں میں حقہ تازہ کر دیتا ہوں۔''علم دین فرمانبرداری سے بولا۔

''اوئے نہیں پتر! رہنے دے۔تم شہری باؤ ہو تمہارے سے یہ کام نہیں ہونے والا۔''

''ابا! شہری باؤ تو اب بنا ہوں۔ پہلے تو پینڈو ہی تھا نا..........اور..........اب بھی ہوں۔''علم دین کی بات پر سب ہنسنے لگے۔

''اوئے میرے پینڈو پتر! پھر تمبا کو ذرا اکلٹر ا رکھنا۔ میلے نے تو اج تھکا ہی دیا ہے۔''دین محمد منجی پہ ٹھیک سے بیٹھتے ہوئے بولا۔

''یار! ہم لوگ تم دونوں کے انتظار ہی میں تھے کہ جب آ ؤ تو تم سے مشورہ کر کے رشتہ پکا کر دیں۔''دین محمد چلم حقے پہ دھرتے ہوئے

بولا۔

''تو نیک کام میں دیر کس بات کی؟''فضل دین کی آنکھوں کی چمک یکدم بڑھ گئی تھی۔

''پر..........میرا خیال ہے کہ پروین سے بھی پوچھ لینا چاہیے۔''جنت بی بی بڑی آہستہ سے بولی۔

''لے دس ماں! اس نے بھلا کیا کہنا ہے جو اس کے ماں پیو اور بھائی فیصلہ کر لیں گے اسے بھلا کیا اعتراض ہوگا۔''علم دین بولا۔

پروین کی نظریں کچے گھروندوں سے پرے کھیتوں کی طرف اٹھ گئیں تھیں۔سارے منظر اس کی جھیل سی آنکھوں میں ڈبڈبا گئے تھے۔اس کی نازک کلائی کا کنگن ہولے سے بولنے لگا تھا۔غموں کے ہار پرونے لگا تھا۔منجی سے پرے دائرہ تھا۔دائرے سے پرے مکئی اور باجرے کے کھیت شروع ہوتے تھے۔مکئی کے کھیتوں سے پگڈنڈی نما راستے نکلتے تھے جو آم کے رکھوں کی طرف جاتے تھے۔جہاں آموں کا جڑواں رُکھ تھا۔ایک رُکھ پر N لکھا ہوا تھا۔دوسرے پر P لکھا ہوا تھا مگر پڑھنے والا نہیں جانتا تھا کہ رکھوں پر کچھ لکھا ہوا ہے۔کوئی جاتے جاتے اپنے پیار کی نشانی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہاں چھوڑ گیا ہے۔

☆..........☆..........☆

گھر بھر میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ عزیز و اقارب یار دوست ملنے ملانے والے بھی وہاں موجود تھے۔ نبیل اور شکیل دولہے بنے ہوئے تھے۔ دونوں کی شادیاں رومی اور سومی سے ہو رہی تھیں۔ انوری بیگم خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ شکیل اور سومی والی تمام بات انوری بیگم نے خود خاموشی سے نغمانہ سے کی تھی۔ پہلے تو بہت رونا دھونا مچا۔ پھر جب انوری بیگم نے دلاسہ دیتے ہوئے اسے یہ بتایا کہ دونوں فوری شادی کرنا چاہتے ہیں اور ایک دوسرے سے بے حد پیار کرتے ہیں تو نغمانہ بیگم کو کچھ حوصلہ ہوا۔ سیٹھ افضل کو یہ بات فوری نہیں بتائی گئی تھی بلکہ نغمانہ بیگم نے آہستہ آہستہ بڑی حکمت سے یہ بات سیٹھ افضل کے کان میں ڈالی تھی۔ سیٹھ افضل آزاد خیال آدمی تھا اس لیے اس کا ردِعمل اتنا شدید نہیں تھا۔ پھر اسے یہ اطلاع بھی مل چکی تھی کہ دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔ پھر بڑوں کی مرضی سے دونوں کی شادی ایک ہی دن رکھ دی گئی تھی۔ شکیل اور سومی شادی سے خوش تھے۔ رومی شاید ضرورت سے زیادہ خوش تھی جبکہ نبیل نے بھی حالات کے ساتھ سمجھوتا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ قدرت کو جو منظور تھا وہ ہو کے رہنا تھا۔ پروین کو اب بھولی بسری داستان ہو جانا تھا۔

اس رات ہار بر ہال میں شادی کی بڑی رنگا رنگ تقریب سجی ہوئی تھی۔ ہر چہرہ مسکرا رہا تھا۔ کھنکتے بول رسیلے لہجے ہر طرف گونج رہے تھے۔ تالاب کے کناروں پہ لگی لائٹیں پانی میں منعکس ہو کر لرز رہی تھیں۔ ایک طرف سازندے اپنا ساز چھیڑ رہے تھے۔ بڑے بڑے دبیز قالینوں پہ چلنے سے یوں لگتا تھا جیسے پانی پہ چل رہے ہوں۔ شیدا ایک دفعہ قالین سے سلپ ہو کر گر بھی چکا تھا۔

''یاڑ نبیل! اج تو تو شہزادہ ہی لگ ڑہا ہے۔'' شیدا اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

''تو پہلے کیا لگتا تھا؟'' نبیل مسکرایا۔

''یاڑ تُو تو پہلے بھی شہزادہ تھا پڑ اج زیادہ ہی شہزادہ لگ ڑہا ہے۔ ایسے شہزادے میں نے پاکستان میں بہت دیکھے ہیں۔''

''کہاں پر..........؟'' نبیل گلے میں پڑے گلاب کے ہار کو ٹھیک کر کے بولا۔

''شاہ عالمی کی دکانوں پہ! یاڑ۔''

''شاہ عالمی کی دکانوں پہ.......... میں کچھ سمجھا نہیں۔'' نبیل بولا۔

''شاہ عالمی کی دکانوں.......... یاڑ کھلونوں کی دکانوں پہ جو چینی گڈے ہوتے ہیں ناں.......... تو بالکل ان جیسا لگ ڑہا ہے۔ چینی گڈوں جیسا۔''

''شیدے! مجھے لگتا ہے تیرے سر میں مونکی کا دماغ ہے۔''

''یاڑ! یہ مونکی کیا ہوتا ہے؟'' شیدا اپنی دانست میں خوش ہو کر بولا۔

''بندر.......... بندر دیکھا ہے تم نے؟'' نبیل مسکراتے ہوئے بولا۔

''نہیں۔'' شیدا برا سا منہ بنا کر بولا۔ ''یاڑ! لگتا ہے مولوی صاحب ادھر ہی آ رہے ہیں۔'' شیدا تیزی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''تجھے کھانے تو نہیں آ رہے۔ ڈر کے بھاگ کیوں رہا ہے؟'' نبیل اسے بٹھاتے ہوئے بولا۔

''یاڑ! تیرا نکاح شروع ہونے لگا ہے۔'' شیدا جیسے نبیل کو یاد دلاتے ہوئے بولا۔

''اچھا پھر دفع ہو یہاں سے۔'' نبیل اسے اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

مولوی صاحب آئے تو نکاح شروع ہو گیا۔ نکاح ہو چکا تو انوری بیگم کا چہرہ خوشی سے انار کی طرح سرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ آنسوؤں کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ کچھ باہر گرتے ہیں اور اپنا آپ منوا لیتے ہیں۔ کچھ من کے اندر ہی اندر گرتے ہیں اور جھلسا دیتے ہیں' سلگا دیتے ہیں۔ کئی آنسو ایک ساتھ نبیل کے من میں بھی گرے تھے۔ پھر ان گرتے آنسوؤں نے آبشار کی شکل دھار لی تھی۔ پھر پانی خشک ہو گیا آبشار رک گئی۔

نبیل اپنی ناتمام محبت کا اظہار کسی سے کیا کرتا۔ اس نے تو محبت کے آنسو بھی کسی کو نظر نہیں آنے دیئے تھے۔ آبشار رکا تھا تو اس کے من کو بھی قرار آ گیا تھا۔ اس کے سینے میں ہلکا سا سکون کا چشمہ پھوٹ پڑا تھا۔ شاید یہ حالات سے سمجھوتے کا سکون تھا۔

ہر طرف مبارک بادیں دی جا رہی تھیں۔ مٹھائی بانٹی جا رہی تھی۔ ہر کوئی باری باری نبیل اور شکیل سے بھی گلے مل رہا تھا۔ ایک بندے سے گلے ملتے ہوئے نبیل دہل کے رہ گیا تھا۔ یہ وہی خوفناک بلوری آنکھیں تھیں جو نبیل پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ نقاب کے اوپر حرکت کرتی ہوئی خوفناک متحرک آنکھیں۔ وہ نبیل سے ملنے کے بعد ایک طرف کو بیٹھ گیا تھا۔ وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا جبکہ نبیل بدستور اسی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ مسٹر ولیم کی بار سے چند قدموں کے فاصلے پہ نبیل کو لوٹنے والا نقاب پوش یہی تھا۔ نبیل ایک بار جو چہرہ دیکھ لیتا تھا کبھی نہیں بھولتا تھا جبکہ اس نقاب پوش کو شاید دوسرا ''مرض'' تھا وہ غالباً چہرے بھلانے کا عادی تھا۔ اس نے نبیل کو لوٹا تھا اور اب اسی کی بارات میں براتی بن کر بیٹھا ہوا تھا۔

''یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟'' نبیل کو تشویش ہونے لگی۔ ''کہیں کسی واردات کی نیت سے تو یہ یہاں نہیں آیا۔'' نبیل نے سوچا۔ ''ہو سکتا ہے کسی نے اسے انوائیٹ کیا ہو.......... مگر ایسے چور اچکے کو کون انوائیٹ کر سکتا ہے۔ کہیں یہ شکیل کا دوست تو نہیں؟'' کئی طرح کے وہم نبیل کے دماغ میں پلنے لگے۔ اس نے شیدے کو پاس بلایا اور کہا کہ ''وہ سامنے بیٹھے بلی آنکھوں والے سے پوچھ کر آ کہ اسے کس نے انوائیٹ کیا ہے؟''

شیدا تعمیل ارشاد میں اٹھا اور سیدھا ناک کی سیدھ میں اس کے سر پر جا پہنچا۔ نبیل کو دور سے وہ گفت و شنید کرتے نظر آ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد شیدا واپس آ گیا۔

''یاڑ! اس کی زبان ہی میڑی سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''تو بھی نہ بس گدھا رہے گا۔'' نبیل پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

''یاڑ! میں کیا کڑوں ابھی اتنی انگریزی نہیں آتی مجھ کو۔''

''یار! خاموش ہو جا۔'' نبیل غصے سے بولا تو شیدا حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''یاڑ! خیریت تو ہے ناں.......... میڑا مطلب ہے تو اتنا لال پیلا کیوں ہو ڑہا ہے..........؟ یہ بلوڑی آنکھوں والا بلا بندہ تو ٹھیک ہے ناں..........؟'' شیدا دور سے ہی اسے گھورتے ہوئے بولا۔

نبیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی اثناء میں دونوں دلہنیں ڈریسنگ روم سے اسٹیج کی طرف آ گئیں۔ نبیل اور شکیل ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہوگئے۔ ہر طرف سے تالیاں گونجنے لگیں۔ ہر طرف سے مبارک بادیں دینے والے امڈ آئے۔ نبیل مبارک بادیں دینے والوں میں سے ایک چہرہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ وہی بلوری بلا تھا۔

''Congratulation! رومی۔'' بلوری بلا رومی کے ہاتھ پہ بوسہ دیتے ہوئے بولا۔ زمین اور آسمان نبیل کی نگاہوں میں گھوم گئے تھے۔

''Thank you! ہنی۔'' رومی چہکی۔

''نبیل! یہ میرے بڑے اچھے دوست ہیں.......... ہنی.......... کالج میں ہم اکٹھے پڑھتے رہے ہیں۔'' رومی اس کا تعارف کرواتے ہوئے بولی۔

''اوہنی! یہ میرے Husband ہیں نبیل۔''

''ہیلو! نبیل Nice to meet you'' ہنی نبیل سے مصافحہ کر کے بولا۔

نبیل کے ہاتھ کی پکڑ بہت بڑھ گئی تھی۔ اس کے جبڑے بھینچ گئے تھے۔

''Nice to meet you'' نبیل بڑے دکھ سے بولا۔

''آپ کو پہلے بھی میں کہیں دیکھ چکا ہوں غالباً۔''

''مسنر ولیم کے بار میں شاید۔'' نبیل نے تیر چھوڑا۔

''اویس! اصل میں مجھے لوگوں کے چہرے یاد نہیں رہتے.......... صبح دیکھوں تو شام کو بھول گیا ہوتا ہوں۔''

''مگر بچو! میں تمہیں نہیں بھولا۔'' نبیل نے دل میں سوچا۔

''یار نبیل باؤ! تسلی ہوگئی۔'' شیدے نے نبیل کے کان میں سرگوشی کی۔ نبیل کو اس لمحے اس کی سرگوشی بڑی زہر لگی۔

وہ ہنس ہنس کر رومی سے باتیں کر رہا تھا اور کبھی کبھار قہقہہ لگا کر رومی کے ہاتھ پر ہاتھ بھی مار رہا تھا۔ نبیل کے لیے یہ سب بہت اذیت ناک تھا۔ نبیل کے چہرے کی الجھن رومی نے پڑھ لی۔ وہ ہنی کو شکیل اور سومی سے باتیں کرتا ہوا چھوڑ کر نبیل کے پاس چلی آئی۔

''کیا بات ہے نبیل؟''

''کک.......... کچھ نہیں۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''میری طرف دیکھو نبیل.......... تمہیں مجھ سے کوئی شکایت ہے؟'' رومی تیوری ڈال کر بولی۔

''نہیں تو۔'' نبیل آنکھیں جھکاتے ہوئے بولا۔

''پھر.......... تم۔''

''رومی! یہ لڑکا کون ہے؟''

''کالج میں میرا کلاس فیلو رہا ہے نبیل............ہم اکٹھے پڑھتے رہے ہیں۔''

''یہ لعنتی پھر مجھے یہاں کبھی نظر نہ آئے۔'' نبیل نفرت سے بولا۔

''It is too much! نبیل۔'' رومی آہستگی سے سخت لہجے میں بولی۔

نبیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رومی سے رخ پھیر کر وہ بڑوں کی طرف ہولیا۔ رومی حیران کھڑی رہ گئی۔ وہ آہستہ سے چلتی ہوئی اپنی سہیلیوں کی طرف ہولی۔

شادی سے فارغ ہو کر جب سب لوگ گھر چلے گئے تو نبیل تب بھی اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ وہ اوپر کمرے میں بیٹھا سوچوں کے سمندر میں غرق تھا۔ اس نے کیا سوچا تھا یہ کیا ہو گیا تھا۔ اسے گاؤں میں آم کے جڑواں درختوں پہ P اور N لکھنا یاد آ رہا تھا۔ اس نے اپنے پیار کا اظہار صرف اس جڑواں درخت سے کیا تھا۔ شاید اور کوئی اس کی زبان نہیں سمجھتا تھا۔ کوئی بھی جاندار۔ کھلی فضاؤں اور معطر ہواؤں میں گھرے ہوئے وہ درخت نبیل کی سچی لگن کے امین تھے۔ وہ اس کے پیار کے رازداں تھے۔ ایسا راز جو شاید اب ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتا تھا۔ ہمیشہ کے لیے گمنام ہو جاتا تھا۔ نبیل نے زندگی کی کتاب کے اس باب کو بند کر دیا تھا۔ اسے اب نیا باب پڑھنا تھا۔ نیا باب............رومی............جو دلہن بنی نیچے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ نبیل نے اپنے ہاتھ کاٹ کر پھینک دیئے تھے۔ اسے اب پروین کو سوچنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ وہ کسی بندھن میں بندھ چکا تھا۔ ایسا بندھن جو اس کے لیے ایک زندان کی حیثیت رکھتا تھا۔

اس نے اس رات چھت پہ بیٹھے ہوئے خود سے عہد کر لیا کہ وہ اب پروین کے بارے میں کبھی نہیں سوچے گا اور اپنی نئی زندگی کا آغاز کرے گا اور پھر وہ ماں سے گاؤں نہ جانے کا عہد بھی تو کر چکا تھا۔ وہ بوجھل قدموں سے نیچے چلا آیا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر اندھیرا تھا۔ چھت پہ جابجا تارے چمک رہے تھے۔ اس نے دروازہ بند کیا تو سائیڈ ٹیبل کا لیمپ جل اٹھا۔ رومی دلہن بنے چوکڑی بھرے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شوخی تھی۔

''آ گئے............آپ۔'' رومی چہکی۔

''ہاں۔'' نبیل نے آہستہ سے کہا۔

نبیل بستر پر بیٹھا تو رومی کھسک کر نبیل کے پاس آ گئی۔

''ناراض ہو مجھ سے؟'' وہ بولی۔

''نہیں............میں بھلا تم سے کیوں ناراض ہونے لگا۔'' وہ بہت آہستہ سے بولا۔

''نبیل! میں تم سے اپنے رویئے کی معافی مانگتی ہوں۔ ہنی اگر تمہیں اچھا نہیں لگتا تو میں آج کے بعد اس سے نہیں ملوں گی۔'' رومی سر جھکا کر ندامت سے بولی۔

نبیل ڈبڈبائی آنکھوں سے رومی کی طرف دیکھنے لگا۔ ''Its ok''

نبیل کی شادی ہوئی جیسے وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ نبیل کی زندگی نہایت مصروف ہوگئی۔ وہ صبح ساڑھے سات دفتر کے لیے نکلتا اور چھ بجے تک گھر لوٹتا۔ پھر رومی کو گھمانے لے جاتا۔ رات کو دیر سے سونے کی وجہ سے صبح آنکھ بڑی مشکل سے کھلتی۔ دل جمعی سے کام کرنے کی وجہ سے اس کی تنخواہ میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔

انوری بیگم دونوں کو دیکھ دیکھ کر پھولے نہیں ساتی تھی۔ وہ ان کو آتے جاتے دیکھ کر نذریں اتارتی رہتی تھی۔ وہ بہت جلد پوتے کی خوشخبری سننے کی متمنی تھی مگر وہ بے چاری یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی بہو ابھی ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔

''بیٹا! تم لوگ کہیں ہنی مون کے لیے ہی چلے جاؤ.......... میرا مطلب ہے کچھ آؤٹنگ ہو جائے گی۔'' انوری بیگم ایک دن نبیل سے کہنے لگی۔

''مام! آج کل ایک پراجیکٹ مکمل ہونے والا ہے۔ جونہی مکمل ہوگیا ہم چلے جائیں گے۔''

''بیٹا! کام تو ساری زندگی ہوتے رہتے ہیں۔ یہ دن بار بار نہیں آتے۔'' انوری بیگم رومی کو آنکھ مار کر بولی۔

''مام! پراجیکٹ مکمل ہونے میں بس چند دن ہی باقی ہیں۔''

''یہ چند دن کتنے ہوں گے آپ کے خیال میں؟'' رومی بولی۔

''آٹھ.......... دس دن۔'' نبیل نے کہا۔

''مام! آپ بھی ہمارے ساتھ چلنا۔'' نبیل نے تجویز پیش کی۔

''تو بھی بس بدھو ہی ہے.......... میں وہاں بھلا کیا کروں گی؟''

''ہمارے ساتھ سیر۔'' نبیل نے جواب دیا۔

''تو اپنی بیوی کو ہی سیر کرا.......... میں بہت کر چکی سیر۔''

''مگر ہم جائیں گے کہاں؟'' رومی نے پوچھا۔

''پیرس۔'' نبیل بولا۔

''اوسویٹ.......... مجھے کتنا شوق ہے ایفل ٹاور دیکھنے کا۔'' رومی تجسس سے بولی۔

''بیٹا! ایفل ٹاور تو ہر وقت تمہارے ساتھ چلتا پھرتا ہے۔'' انوری بیگم نبیل کی طرف اشارہ کر کے بولی۔

''مام..........!'' نبیل نے آنکھیں دکھائیں۔

''یس.......... مائی سن۔''

''میں ایفل ٹاور ہوں۔'' نبیل بولا۔

''آف کورس مائی سن۔'' انوری بیگم نے برجستہ جواب دیا تو تینوں ہنسنے لگے۔

''میرے ذہن میں ابھی ابھی ایک خیال آیا ہے۔'' انوری بیگم رک کر بولی۔

''وہ کیا.........پھوپھو؟'' رومی بالوں کی لٹ کان کے پیچھے اڑستے ہوئے بولی۔

''تم لوگ شکیل اور سومی کو بھی ساتھ ہی لے جاؤ۔ بور نہیں ہو گے۔'' انوری بیگم دانت نکال کر بولی۔

''اوہ یس مام! یہ تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا۔'' اٹس آ گڈ آئیڈیا۔'' رومی خوش ہو کر بولی۔ پھر نبیل سے کہنے لگی۔ ''نبیل! آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ان لوگوں کو ساتھ لے جانے میں۔''

''عجیب نامعقول لڑکی ہو۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہوگا؟''

''اس کا مطلب ہے کہ ہم سب اکٹھے پیرس جائیں گے۔'' رومی خوش ہو کر بولی۔ ''میں.........ابھی.........شکیل اور سومی کو بتا کر آئی۔'' رومی یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

''بیٹا! میں کتنی خوش قسمت ہوں کہ میں نے زندگی میں تم دونوں بھائیوں کی خوشیاں دیکھ لیں۔ مر جاتی تو یہ افسوس رہتا۔''

''خدا نہ کرے.........مام۔ پلیز ایسی بات آپ دوبارہ منہ سے نہیں نکالیں گی۔''

نبیل یکدم بہت افسردہ ہو گیا تھا۔

''نبیل! تو نے میرا بیٹا ہونے کا حق ادا کر دیا ہے۔ مری ہوئی ماں میں جان ڈالی ہے تُو نے بیٹے.........رومی سے شادی کر کے مجھے دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔''

نبیل کی آنکھیں کچھ تشکر کچھ دکھ کے بوجھ سے بند ہونے لگیں۔ ''مام! آپ کو دیکھ کر ہی تو ہم سب جی رہے ہیں۔ آپ ہی ہمارا مان...... ہماری پہچان ہیں۔''

''بیٹا! پہچان تو اولاد سے بنتی ہے۔ خدا نے چاہا تو شکیل کو اولاد مل ہی جائے گی۔ میں تمہاری طرف سے فکرمند ہوں۔ میں.........میں تمہارا بچہ کھلانا چاہتی ہوں بیٹے۔''

''مام! اصل میں..................''

''دیر.........اچھی نہیں ہوتی اس معاملے میں.........بعد میں بڑے مسئلے پڑ جاتے ہیں۔'' انوری بیگم ڈھکے چھپے الفاظ میں بیٹے کو بتا رہی تھی۔

''جی اچھا مام!'' نبیل نے آہستگی سے کہا اور باہر نکل گیا۔

اگلے دن جب نبیل آفس پہنچا تو آگے خط آیا پڑا تھا۔ خط اس کے ٹیبل کے ساتھ بنے لیٹر باکس میں پڑا تھا۔ اس نے بٹن دبا دیا تو خط ایک جھٹکے سے اچھل کر باہر آ گیا۔ خط کی پشت پر گاؤں کا پتہ تحریر تھا اور اوپر دین محمد کا نام لکھا ہوا تھا۔ نبیل کو یوں لگا جیسے دین محمد کے حقے کا انگارہ اس نے

ہاتھ میں پکڑ لیا ہو۔ اس نے چاہا کہ خط کو پھاڑ پھینک دے مگر اتنا بڑا دل اس کے سینے میں نہیں تھا۔ گھر آئے ہوئے مہمان کو واپس بھیج دینا تو ویسے بھی گناہ میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے خط دراز میں رکھ دیا اور کام کرنے لگ گیا۔ اسی دوران انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ نبیل کو باس نے کمرے میں بلایا تھا۔ نبیل جا کر باس سے ملا۔ جب پندرہ بیس منٹ بعد وہ باہر آیا تو اس کا سارا پروگرام بدل چکا تھا۔ وہ چند دن بعد کی بجائے فوری طور پر پیرس روانہ ہو رہا تھا۔ خوشگوار یا ناخوشگوار اتفاق یہ ہوا تھا کہ باس اسے ایک ارجنٹ کام کے سلسلے میں پیرس بھیجنا چاہ رہا تھا۔ وہاں اسے کم و بیش ایک ماہ لگ جاتا تھا۔ باس کے دفتر سے نکلتے نکلتے نبیل فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ روی کو بھی اپنے ساتھ لے جائے گا۔ یعنی نبیل اور روی والا پروگرام اب باس کے پروگرام میں مدغم ہو گیا تھا۔

بعد کے واقعات بڑی تیزی سے رونما ہوئے۔ گھر جا کر نبیل نے روی اور دیگر اہل خانہ کو اپنے بدلے ہوئے پروگرام کے متعلق بتایا۔ فوری طور پر روانگی کی تیاری ہوئی۔ نبیل اور روی نے شکیل اور سوی کے سلسلے میں گھر والوں کو تاکید کر دی کہ جونہی شکیل لندن سے واپس آئے اسے سوی کے ساتھ پیرس روانہ کر دیا جائے اور اگر ہو سکے تو چھوٹے ٹونی کو بھی ساتھ بھیج دیا جائے۔

وہ لوگ بلٹ ٹرین کے ذریعے ایک مختصر مگر مزیدار سفر کے بعد پیرس پہنچے۔ پیرس، رنگوں، روشنیوں اور خوشبوؤں کا شہر۔ ایک نہایت صاف ستھرے ہوٹل میں ان کے لیے کمرہ بک تھا۔ نبیل اور روی کو کمرہ اور ہوٹل بہت پسند آئے۔

☆............☆............☆

''نبیل یہاں سردی لندن سے کچھ زیادہ نہیں ہے؟'' روی بیڈ پہ ڈھیر ہو کر بولی۔

''ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔''

''نبیل! بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' روی بولی۔

''تم ایسا کرو............ چینج کر لو............ میں کھانا یہیں پر منگوا لیتا ہوں۔''

''میں نہانا چاہتی ہوں۔'' روی باتھ روم میں گھستے ہوئے بولی۔

''اچھا تم نہا لو............ میں بیرے کو بلوا کر آرڈر دے دیتا ہوں۔''

روی باتھ روم میں نل کھول کر گرم پانی چیک کرنے لگی۔ گرم پانی وافر مقدار میں آ رہا تھا۔ روی نے دروازہ بند کیا اور نہانے لگی۔ نبیل نے بیل دی تو فوراً ایک اپ ٹو ڈیٹ ویٹر بھاگا ہوا آیا۔ ''یس سر!'' وہ مؤدب لہجے میں بولا۔

نبیل نے اس سے مینیو مانگا تو اس نے ایک بڑی لسٹ نبیل کے سامنے کر دی۔ نبیل ان میں سے حلال کھانے ڈھونڈنے لگا۔ دو تین ڈشوں کا آرڈر دے کر نبیل نے اسے رخصت کر دیا اور پھر ہاتھ سر کے پیچھے جما کر بیڈ پہ نیم دراز ہو گیا۔ خوبصورت کمرہ ڈیزائن اور آرائش میں اپنی مثال آپ تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں بہت بڑی کارنر کھڑکی خوبصورت شہر کی طرف کھلتی تھی۔ بیڈ پر لیٹتے ہوئے پردہ پیچھے ہٹانے سے پورا شہر

آنکھوں میں روشن ہو جاتا تھا۔نبیل نے بیڈ پہ لیٹے ہوئے بٹن دبایا تو کھڑکی سے پردہ پیچھے کھسکتا چلا گیا۔سارا شہر خوبصورت دلہن کی طرح سجا خنکی میں ٹھٹھر رہا تھا۔

نبیل لیٹا لیٹا سوچنے لگا۔اس نے پروین سے اظہار محبت نہ کر کے کتنا اچھا کام کیا تھا۔ایک نازک کلیوں سی پیاری زندگی تباہ و برباد ہونے سے بچا لی تھی مگر وہ کتنا کم علم تھا کہ یہ ''آگ'' اظہار کا مطالبہ کب کرتی ہے؟ یہ تو آپ ہی آپ بھڑک اٹھتی ہے۔بن سوچے بن سمجھے..........شاید پہلی نظر میں..........پہلی ادا میں۔

پھر یہ رلاتی ہے تڑپاتی ہے۔در بدر گھماتی ہے۔فرصت کے لمحات چھین کر اک کرب مسلسل سے آشنا کر دیتی ہے۔یہ آگ..........یہ آگ..........پروین کے دل میں جلتی تھی لو دیتی تھی اسے سلگاتی تھی۔یہ آگ نبیل کے دل میں بھی تھی۔پر کہاں تھی؟ کہیں بھی نہیں تھی۔وہ اپنی زندگی جی رہا تھا۔اس نے خود کو اپنی زندان کا قیدی بنا لیا تھا۔

روبی نہا کر نکلی تو بڑی نکھری ہوئی تھی۔اس نے اپنے جسم پر بڑا تولیہ لپیٹ رکھا تھا۔

''کھانا ابھی تک نہیں آیا۔'' وہ بیڈ پہ ایک ادائے دلنواز سے نیم دراز ہو کر بولی۔

''آرڈر دے دیا ہے..........ابھی آتا ہی ہوگا۔''

''چکن جلفریزی منگائی ہے نا آپ نے؟'' وہ نبیل کے سینے پہ ہاتھ دھر کے بولی۔

''وہ میں کیسے بھول سکتا تھا؟ کیونکہ..........''

''کیونکہ آپ کو علم ہے کہ وہ مجھے بہت پسند ہے۔'' روبی بات کاٹ کر بولی۔

''واہ بھئی! آج مزاج یار میں بڑی شوخی ہے۔'' نبیل روبی کے گلے میں بازو حمائل کر کے بولا۔

''یہ شوخی تمہاری ہی دین ہے نبیل۔'' روبی غور سے نبیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

اتنے میں دروازہ Knock ہوا۔ ''May I come in sir'' بیرا بولا۔

نبیل نے روبی کو اشارہ کیا کہ وہ باتھ روم میں چلی جائے۔روبی نے تھوڑا تردد کیا وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔پھر برا سا منہ بناتے ہوئے باتھ روم میں چلی گئی۔بیرہ کھانا رکھ کے جا چکا تو نبیل نے روبی کو آواز دی۔روبی باہر آئی تو اس کا منہ بنا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے؟ تمہارا موڈ کیوں خراب ہے؟'' نبیل بولا۔

''میرا باتھ روم میں جانا ضروری تھا۔''

''بھئی تم اس حالت میں نہیں تھی کہ کسی غیر آدمی کے سامنے جا سکو۔''

''میرا جسم ڈھکا تو ہوا تھا۔''

''وہ نا کافی تھا۔''

رومی بے چینی سے ہاتھ مروڑنے لگی۔اس کی پیشانی پہ سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔

''نبیل! تم کچھ تنگ نظر سے نہیں ہو گئے؟ دقیانوسی سے؟ پہلے تو تم ایسے نہیں تھے۔''

''میری جان! یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔'' نبیل اسے اپنے ساتھ بٹھاتے ہوئے بولا۔

''کیا..........؟''

''کسی غیر آدمی کے سامنے اس طرح آنا.......... ہمارا مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا۔''

رومی خاموش ہو گئی۔اس کے چہرے پہ گہری سنجیدگی آ گئی تھی۔کھانا دونوں نے خاموشی سے کھایا۔

''کھانے کے بعد باہر گھومنے چلیں۔'' رومی نے خاموشی توڑ دی۔

''بھئی! صبح جلدی اٹھنا پڑے گا۔مجھے آفس جانا ہے۔پہلا دن ہے۔میں نہیں چاہتا کوئی بدمزگی ہو۔'' نبیل کی بات پر رومی خاموش ہو گئی تو نبیل بولا۔

''میں کوشش کروں گا کہ آفس سے جلدی آ جاؤں۔پھر گھومنے چلیں گے۔''

رومی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔اگلے دن دفتر سے نبیل بہت دیر سے لوٹا۔

رومی بہت دیر سے اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔نبیل نے دیر سے آنے کی معذرت کی اور رومی کو کہا کہ ''میں تیار ہو جاؤں تو باہر چلتے ہیں۔''

رومی نے انکار کیا تو نبیل نے اسے خود سے لپٹا لیا۔''میری جان! مجھے پتہ ہے میرے دیر سے آنے کی وجہ سے تم ناراض ہو۔'' رومی خاموش رہی۔

''اچھا بھئی! سوری.......... اور دیکھو کھانا ہم باہر کسی اچھے سے ریستوران میں کھائیں گے۔'' رومی ایک دم سے مسکرانے لگی۔اسکی حرکتیں ایسی ہی تھیں۔کبھی ایسے ہی کسی چھوٹی سی بات پہ بگڑ جاتی تھی۔پھر ایک دم سے خود ہی مان بھی جاتی تھی خوش ہو جاتی تھی۔کئی دفعہ نبیل اسے نہ بھی مناتا تو وہ خود بخود ہی مان جاتی۔

''اچھا اٹھیں آپ جلدی سے تیار ہو جائیں۔'' رومی کھکھلاتے ہوئے بولی۔

وہ ایک دم سے یوں ٹھیک ٹھاک ہو جاتی تو نبیل کو لگتا جیسے سب مصنوعی مصنوعی سا ہے۔جیسے رومی اسے بچوں کی طرح بہلاتی ہے۔دونوں تیار ہو کر نکلے تو موسم بڑا خوشگوار تھا۔دریائے سین خوبصورت دوشیزہ کی طرح بل کھاتا ہوا شہر کے وسط میں بہتا تھا۔دونوں طرف روشنیوں کی ایک لمبی قطار اس کے ہونے کا ثبوت دیتی تھی۔نوے پچانوے لاکھ کی آبادی کا یہ شہر پوری دنیا کے سیاحوں کی نگاہوں کا مرکز ہے۔شہر کے دونوں اطراف بپھرے ہوئے سمندر رہتے ہیں۔

دونوں دریائے سین کے کنارے کنارے چلے جا رہے تھے۔دھیمی دھیمی خنک ہوا پورب پچھم چل رہی تھی۔رومی نے اپنا سر نبیل کے

کندھے پہ رکھا ہوا تھا اور وہ ٹیڑھی ہو کر اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔

''رومی! ایک بات کہوں؟''

''جی کہیں!''

طویل خاموشی چھا گئی۔ پھر نبیل ٹھہر ٹھہر کر بولا۔ ''رومی! تمہیں پتہ ہے کہ میں چھوٹے بچوں سے بہت زیادہ پیار کرتا ہوں اور میں چاہتا ہوں......''

''پلیز اس ٹاپک کو یہیں بریک لگا دیں۔ میں نہیں چاہتی دونوں کا موڈ خراب ہو۔''

''رومی پلیز! ٹھنڈے دل و دماغ سے میری بات سنو۔ مجھے بچے کی خواہش ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس میں دیر ہو۔ امی بھی پوتے کو کھلانے کی خواہش مند ہیں۔''

''سومی کا بچہ ہوگا ناتو ان کے پوتے کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔'' رومی بولی۔

''اور میری خواہش؟'' نبیل نے دکھ سے کہا۔

''نبیل! میں ابھی اس جنجال میں نہیں پڑنا چاہتی۔''

''مگر............''

''دیکھو نبیل! میں اس سے انکار نہیں کر رہی مگر پلیز تھوڑا سا انتظار کر لیں۔''

''کتنا انتظار؟''

''سال ڈیڑھ سال۔''

نبیل خاموش ہو کر دور کہیں دیکھنے لگا۔ روشنیاں، اُگلتی بلند عمارتیں، ریلوے پل، بازار، رش، بھیڑ، نفسا نفسی، رنگ برنگے چہرے، خوشبودار معطر ہوائیں سب کچھ تھا دل میں سکون نہیں تھا۔ نبیل نے رومی سے بچے کے بارے میں پھر بات کی تھی اور اس نے پہلے کی طرح پھر انکار کر دیا تھا۔ انتظار.........لمبا انتظار شاید نبیل کو کرنا تھا۔ ایک بڑے ریستوران میں کھانا کھا کر جب دونوں واپس لوٹے تو کافی تھکے ہوئے تھے۔ نبیل نے جاتے ہی واش روم میں وضو کیا اور مصلّے پر کھڑا ہو گیا۔ نماز سے فارغ ہوا تو رومی بستر پہ لیٹی ہوئی تھی۔

''رومی! نماز پڑھ لو۔''

''میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔'' وہ کروٹ بدلتے ہوئے بولی۔

''مگر نماز ضروری ہے۔'' نبیل اس کا بازو کھینچ کر بولا۔

پہلے تو اس نے بُرا سا منہ بنایا مگر پھر ایک دم ہی وہ نارمل ہو گئی اور واش روم سے وضو کر کے مصلّے پہ کھڑی ہو گئی۔ اس لمحے نبیل کو اس پر بہت پیار آیا۔ وہ سمٹی تھکی ماندی نماز میں مشغول تھی۔ خواہ مخواہ نبیل کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ وہ جب نماز سے فارغ ہوئی تو نبیل نے اسے بانہوں میں

بھرلیا۔ ''آئی لو یو..........!رومی۔'' وہ اس کے گال پہ پیار کر کے بولا۔

رومی نے جواباً کچھ نہیں کہا۔ نبیل کے سینے پہ سر رکھ کے آنکھیں میچ لیں۔

وہ آفس میں نبیل کا دوسرا دن تھا۔ وہ اپنے کام میں بری طرح مصروف تھا۔ وہ آس پاس سے بالکل بے گانہ تھا۔ جب وہ کام میں مصروف ہوتا تھا تو اس کی ایسی حالت ہوتی تھی کہ اگر کوئی اس کے پاس بیٹھ کر چلا بھی جاتا تھا تو اسے خبر نہ ہوتی تھی۔ اس کی نگاہیں مونیٹر پہ ٹکی ہوئی تھیں اور انگلیاں کی بورڈ پہ تیزی سے حرکت کر رہی تھیں۔ کبھی کبھار وہ ماؤس کو پیڈ پہ حرکت دینے لگ جاتا تھا۔ اس دوران اس کا ایک پیر دائیں سے بائیں حرکت کر رہا تھا۔ کمپیوٹر پہ کام کرتے ہوئے اس کا دھیان کسی اور طرف جانا ناممکن بات لگتی تھی مگر اب کام کرتے ہوئے یکدم سے کچھ ہوا تھا۔ ایک جھٹکا.........آگہی کا اک مختصر سا لمحہ آنکھوں میں روشن ہو کر بجھ گیا تھا۔ یہ کیسا لمحہ تھا.......... یہ کیسا جھٹکا تھا.......... وہ کھو سا گیا تھا.......... گردوپیش کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر اور اپنے کام سے ہی بے خبر ہو گیا تھا۔ یہاں ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورتی منہ کھولے کھڑی تھی۔ یہاں دنیا کی سب سے پیاری خوشبوؤں کا بیوپار ہوتا تھا۔ وہ خوشبوئیں پھر دنیا کے کونے کونے میں تقسیم ہوتی تھیں مگر نبیل کے نتھنوں سے یہ کیسی باس ٹکرائی تھی یہ کیسی خوشبو نے اس کا استقبال کیا تھا۔ ایسی باس ایسی خوشبو ایسا نظارہ جو نہ لفظوں میں بیان ہو سکے نہ اس کا اظہار کیا جا سکے۔ نبیل کا سینہ خوشبو اور روشنی سے بھر گیا۔ یہ روشنی تیز دھوپ کی روشنی تھی۔ تیز دھوپ میں کندن رنگ کی روشنی تھی۔ دوپہر کے ویرانوں میں دور کہیں سے سُر اٹھتا تھا۔ ہلکی ہلکی خاموشی تھی جو کندن رنگ ماحول میں فراٹے بھر رہی تھی۔

ایک متناسب جسم نازنین تھی جو آدھا گھونگھٹ نکالے بل کھاتی پگڈنڈیوں پہ چلی جا رہی تھی۔ اس کی دراز پلکوں پہ ستارے ٹوٹتے تھے۔ اس کے دہکتے گالوں پہ سورج کی کرنیں مچلتی تھیں۔ اس کا خوبصورت جسم نرم و نازک شاخ کی طرح لچکتا تھا۔ اس کی نازک سفید کلائی کا کنگن کچھ گنگناتا تھا۔ کچھ کہتا تھا۔

''نبیل! تم مجھے بھول گئے۔ میں تو تمہیں نہیں بھولی۔ میں تو آج بھی تمہاری راہیں دیکھتی ہوں۔ سرد راتوں میں سنسان دوپہروں میں جب کوئی میرے پاس نہیں ہوتا۔''

ملازم کب سے نبیل کے لیے چائے لیے کھڑا تھا' جبکہ نبیل کسی بہت گہری سوچ میں غرق تھا۔ کافی دیر سے ماؤس نہ ہلنے کی وجہ سے مونیٹر کی سکرین بلینک ہو چکی تھی۔ نبیل کی آنکھ کے باہر کی طرف نمی نے ہلکی سی جگہ بنالی تھی۔

''سر! پلیز چائے لے لیں۔'' ملازم بڑبڑایا۔

نبیل یکدم خیالات سے چونکا۔ وہ ایسے ہڑبڑا گیا جیسے کوئی بڑا خوفناک خواب دیکھ کر بیدار ہوا ہو۔ اس نے معذرت کرتے ہوئے چائے لے لی اور پھر کام میں مصروف ہو گیا۔ کام اس نے کیا کرنا تھا۔ رہ رہ کے وہی جاگتی آنکھوں کا خواب اس کے ذہن میں گردش کرنے لگا۔ وہ سوچنے لگا یہ کیسا خیال اس کے ذہن پہ حملہ آور ہوا تھا۔ وہ تو پروین کو ایک طرح سے بھول چکا تھا مگر یہ کیسی سوچ تھی جس نے یکدم سے اسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اسے سرتاپا لرزا دیا تھا۔ اس نے اپنے ذہن کو جھٹکا اور اپنی بیوی رومی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا نہیں تھا رومی میں خوبصورت تھی' جوان اور پڑھی

لکھی تھی۔ معاشرے میں ایک اعلیٰ مقام کی حامل تھی۔ اس سے پیار کرتی تھی۔ نبیل بہت دیر اس بارے میں سوچتا رہا۔ پھر چند منٹ پہلے ذہن میں ابھرنے والے پروین کے خیال کو جھٹک دیا۔ وہ سب خیالی دنیا کی باتیں تھیں۔ خیال جو انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ نبیل حقیقت پسند آدمی تھا۔ حقیقت میں رہنے والا انسان اور حقیقت یہ تھی کہ اس کی شادی رومی، اس کے ماموں کی لڑکی سے ہو چکی تھی۔ وہ اب کسی کا ہو چکا تھا۔ زندگی بھر کا ساتھی۔ گاؤں میں گزرے دن ایک نہایت یاس انگیز تجربے کے علاوہ کچھ نہیں تھے۔ وہ اب سب کچھ بھلا دینا چاہتا تھا بلکہ بھلا چکا تھا۔

ایک شام کو آفس سے واپسی پر وہ جان بوجھ کر ایک دکان پر رکا۔ اس نے ایک خوبصورت پرفیوم اور کچھ پھول رومی کے لیے خریدے۔ وہ اپنے ذہن پہ حملہ آور ہونے والے خیال پہ اک کاری وار کرنا چاہتا تھا۔ ہوٹل پہنچا تو رومی سوئی پڑی تھی۔ اس نے پھول اس کے سرہانے کے پاس رکھے پرفیوم سائیڈ ٹیبل پہ رکھا اور اس کے پاس بیٹھ کر آہستہ آہستہ اس کی زلفوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ وہ کسمسانے لگی۔

''ہیلو رومی! جان رومی.......... اٹھو دیکھو میں آیا ہوں۔'' اس نے آہستہ سے رومی کے کان میں سرگوشی کی۔

''کون ہے؟'' وہ کروٹ بدل کر بولی۔

نبیل نے رومی کو بانہوں میں اٹھایا اور واش روم میں لے جا کر واش ٹب میں لیٹا کر اوپر سے شاور چلا دیا۔ رومی چیخیں مارنے لگی۔ وہ لیٹی لیٹی ہاتھ پاؤں چلانے لگی۔ نبیل کی شرٹ اس کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نے زور سے کھینچا تو نبیل بھی اوندھے منہ ٹب میں گر گیا۔

''اب مزا آیا؟'' رومی نبیل کی ٹائی کھینچتے ہوئے بولی۔

''نہیں ابھی نہیں۔'' نبیل نے دانت نکالے۔

رومی تیزی سے اٹھی۔ وہ ٹب سے باہر نکلنا چاہتی تھی کہ نبیل نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے گرا لیا۔ اس کے بال نبیل کے چہرے پہ بکھر گئے۔

''نبیل......... چھوڑو مجھے......... پلیز......... پلیز۔''

''نہیں چھوڑوں گا۔ ایک بار جو پکڑ لیا۔ پھر نہیں چھوڑوں گا۔'' نبیل اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا۔

''نبیل! دیکھو میرے کپڑے بھیگ رہے ہیں۔ بخار ہو جائے گا۔''

''ہو جانے دو۔'' وہ اس کا چہرہ اپنے قریب کرتے ہوئے بولا۔ ''رومی! ایک بات پوچھوں۔'' نبیل سرگوشی کے انداز میں بولا۔

اس کا جواب نہ پا کر نبیل پھر سے بولا۔ ''رومی! تم مجھ سے پیار کرتی ہو نا؟''

''نہیں کرتی بالکل نہیں کرتی۔'' رومی منہ پرے کر کے بولی۔

''رومی! میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔'' رومی آنکھیں بند کر کے بولی۔

''کیا......... کیا کہا تم نے؟'' نبیل اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

''یہی کہ میں تم سے پیار نہیں کرتی بلکہ محبت کرتی ہوں۔'' رومی نبیل کے کان کو کاٹتے ہوئی بولی۔

''رومی کی بچی۔'' نبیل چیخا۔''ہائے میرا کان۔'' رومی نبیل کو انگوٹھا دکھاتے ہوئے بیڈ روم میں بھاگ گئی۔ نبیل بھی ٹب سے نکل کر اس کے پیچھے بھاگا۔

''تمہاری تو ایسی کی تیسی۔'' وہ اسے پکڑنے کے لیے لپکا۔

''او............ گاڈ............ پلیز............ نبیل بس۔'' رومی بیڈ کے گرد بھاگتے ہوئے بولی۔

نبیل نے بیڈ سے چھلانگ لگا کر رومی کو دبوچ لیا اور بیڈ پہ گرا لیا۔'' رومی............! آئی لو یو سوچ............ تم سوچ بھی نہیں سکتی کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں۔''

نبیل کو اپنے الفاظ میں زور اور دم خم نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو بس اپنے اندر کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اپنے آپ سے الجھ رہا تھا۔ وہ اپنے من میں پیدا ہونے والی پروین کی سوچ کا سر کچلنا چاہتا تھا مگر ہر وار کی ناکامی کا احساس بے چین کر رہا تھا۔ وہ رومی کے لیے پرفیوم لایا تھا' پھول لایا تھا مگر سب پھیکا پھیکا سا تھا سب جیسے بے رنگ سا تھا۔ کوئی خلا تھا کچھ کمی سی تھی۔ کچھ کھویا کھویا سا تھا۔

''کتنا پیار کرتے ہو تم مجھ سے؟'' رومی نے نبیل کی خاموشی توڑی۔

''بہت زیادہ۔'' نبیل کھڑکی کے پار دور کہیں دیکھتے ہوئے بولا۔

''نبیل! ادھر دیکھو کیا ہوا تمہیں؟'' رومی پریشان ہو کر بولی۔ نبیل کے چہرے پہ ڈھیروں کرب امڈ آیا تھا۔

''نہیں............ کچھ بھی نہیں۔'' وہ ہنسنے کی کوشش کر کے بولا۔ اس لمحے پتہ نہیں کیوں اسے پروین سے کہی ہوئی بات یاد آ گئی تھی۔

''انسانوں سے بھی کبھی پیار کیا؟''

''ہاں کیا۔''

''کس سے؟''

''اپنی ہونے والی بیوی سے۔'' نبیل نے یہ جملہ پروین کے لیے کہا تھا۔ وہ پروین کو اپنی بیوی بنانا چاہتا تھا۔ وہ جتنے دن گاؤں میں رہا پروین سے اپنا پیار چھپاتا رہا اور اسے تنگ کر کے اس کا تماشا دیکھتا رہا۔

وہ انجانے میں پروین سے کھیلتا رہا اسے کھلاتا رہا۔ وہ اپنے پیار کا اظہار کر کے اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اسے حیران کرنا چاہتا تھا۔ جتنا اس کو رلایا تھا اس سے کہیں زیادہ اسے ہنسانا چاہتا تھا مگر یہ وقت کبھی نہ آ سکا۔

گاؤں سے چلتے وقت جب نبیل اپنے پھوپھا دین محمد سے بغل گیر ہوا تھا تو دین محمد نے کہا تھا۔''پُتر! تجھے تیرے مرے باپ کا واسطہ ہمیں بھول نہ جانا۔'' تو نبیل کا دل بھر آیا تھا۔ وہ آگے سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ نہیں کہہ سکا تھا۔ زبان نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

وہ دیوانہ وار پیار کے ہاتھوں مغلوب ہو کر پروین سے پیار کا اقرار کر لینا چاہتا تھا۔ وہ دین محمد کو بتا دینا چاہتا تھا کہ وہ یہاں اپنی امانت چھوڑے جا رہا ہے۔ وہ پروین کو بیاہنے آئے گا مگر بہت کوشش کے باوجود بھی وہ ایسا نہ کر پایا تھا۔ حالات نے اسے ڈس لیا تھا۔ زمانے کی گردش اس

کی دشمن ٹھہری تھی۔ وقت کا بے رحم پہیہ سب کچھ روندتا ہوا گزر گیا تھا۔ انگلینڈ جانے کے بعد وہ پُرسکون ہو گیا تھا کہ اس نے کسی کی نازک زندگی تباہ ہونے سے بچالی تھی۔ ایک چھوٹے سے اقرار کی خوشی دے کر پروین کو فراق کے طویل جہنم میں نہیں دھکیلا تھا۔ اس نے سوچا کہ انگلینڈ میں رہ کر حالات سازگار ہونے کا انتظار کرے گا اور حالات کے سدھرتے ہی کسی اچھے موقع پہ اپنی ماں سے پروین کے بارے میں بات کرے گا۔ مگر یہ بات ایک راز بن کر ہی اس کے سینے میں دفن ہو گئی۔ حالات کی بے رحمی نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ رومی سے شادی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ انکار کی صورت میں اسے اپنی ماں سے ہاتھ دھونے پڑتے تھے اور وہ ماں کھونا نہیں چاہتا تھا۔ یوں نبیل کی رومی سے شادی ہو گئی۔ پھر ایک دن اس نے اپنی عقل و دانش سے اس اندھیرے کو ختم کرنے کا عہد کرلیا۔ کیونکہ وہ گاؤں نہ جانے کا وعدہ بھی کر چکا تھا۔ تمام رستے مسدود ہو چکے تھے۔ تمام خواہشوں کا سر کچلا جا چکا تھا۔ اس نے پھر حالات سے سمجھوتا کرلیا۔ اپنے آپ کو خود تک محدود کرلیا۔ اپنی بیوی تک محدود کرلیا۔ اپنے ماضی کو بھلا دیا مگر بھولا کب تھا۔ وہ تو اس کے سینے میں دفن تھا۔ وہ راز جو کسی پہ نہ کھل سکا مگر اس کے سینے میں دفن رہا۔ پھر ایک دن مدفن میں ہلچل ہوئی اور ایک قیامت خیز انگڑائی لے کر وہ بیدار ہو گیا۔ اب نبیل اس ''مدفن'' کو دوبارہ دبانا چاہتا تھا' دفن کرنا چاہتا تھا مگر یہ سب اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ وہ لاکھ کوشش کر چکا تھا۔ ہزار حربے آزما چکا تھا مگر اسے ناکامی ہوتی تھی۔

''نبیل! یہ پھول تم میرے لیے لائے ہو؟'' رومی چہکتے ہوئے بولی تو نبیل خیالات کی دنیا سے واپس لوٹ آیا۔

''ہاں رومی! یہ میں تمہارے لیے لایا ہوں۔'' نبیل نے عجیب سے انداز میں کہا۔

''اور یہ پرفیوم؟'' وہ پرفیوم اٹھاتے ہوئے بولی۔

''یہ بھی تمہارے لئے۔'' نبیل بوجھل آواز میں بولا۔

''نبیل تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''

''ہوں۔'' نبیل کھویا کھویا سا بولا۔

''نبیل کیا ہو گیا ہے تمہیں؟'' رومی اس کے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر بولی۔

''کچھ نہیں.........کچھ بھی نہیں۔'' نبیل بیڈ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

''نبیل! ابھی تم بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔ میرے ساتھ ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ ابھی تمہیں نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟'' رومی کی پیشانی پہ سلوٹیں ابھر آئیں۔

''وہ.........میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔'' وہ اپنا ہاتھ ماتھے پہ رکھ کر بولا۔

''چائے منگواؤں تمہارے لیے؟''

''ہاں.........شاید کام کی زیادتی سے تھکن ہو گئی ہے۔''

رومی روم سروس کو کال کرنے لگی تو نبیل نے اسے روک دیا۔ ''سنو رومی.........! ایسا کرتے ہیں کہ باہر چلتے ہیں۔ چائے بھی وہیں پی

لیں گے۔''اصل میں نبیل اپنا ذہن بٹانا چاہتا تھا۔

''جیسے آپ کی مرضی۔ویسے آپ ابھی کہہ رہے تھے کہ تھکن ہو رہی ہے۔''رومی غور سے نبیل کی طرف دیکھ کر بولی۔

''ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟''نبیل نے پوچھا۔

''ڈر رہی ہوں کہیں آپ مجھ سے تو خفا نہیں ہیں۔''

''او......نہیں میری جان.........میں.........میں بھلا تم سے کیسے ناراض ہو سکتا ہوں؟''

''تھینکس گاڈ۔''رومی نے شکر ادا کیا۔

''رومی! تم کتنی اچھی ہو۔''نبیل اس کے گلے میں بازو ڈال کر بولا۔

''آپ اچھے ہیں۔اس لیے میں آپ کو اچھی لگتی ہوں۔''رومی ایک ادا سے بولی۔

''اچھا زیادہ تعریف نہ کرو،نہیں تو خراب ہو جاؤں گا۔''نبیل مسکرایا۔

''مجھے سب ٹھیک کرنا بھی آتا ہے۔''رومی ہونٹ سکیڑ کے بولی۔

''اچھا..........''

''جی ہاں۔''رومی نے کہا اور پھر دونوں ہنسنے لگے۔

''ایک بات کہوں؟''دریائے سین کے کنارے چلتے ہوئے رومی بولی۔

''حکم کریں جناب۔''نبیل سر جھکا کر بولا۔

''نہیں ،ہمیں عرض کرنا ہے۔''

''جو کچھ بھی کرنا ہے جلدی کریں۔''نبیل تیزی سے بولا۔

''کیوں جلدی کیا ہے؟''

''محترمہ! ٹرین نکلی جا رہی ہے۔''

''کیوں کہاں جانا ہے؟''

''میں اپنی جان کو شاپنگ کروانا چاہتا ہوں۔''

''اووٹ آ امیزنگ۔''رومی چیخی۔

''اچھا پہلے تم اپنی عرض کرو۔''

''عرض ہم ٹرین میں بیٹھ کر کریں گے۔''

نبیل نے رومی کا ہاتھ تھاما اور تیزی سے ٹرین کی طرف بڑھا۔ٹرین چلی تو رومی کا سر نبیل کے کندھے سے ٹکا ہوا تھا۔فرنچ لڑکیاں حسرت

بھری نظروں سے نبیل کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ نہ وہ انگریز پورا تھا نہ ایشین۔ اس کا رنگ سفید سر کے بال بھنویں پلکیں گہری سیاہ تھیں۔ اس کی آنکھوں میں بڑی مقناطیسی کشش تھی۔ دیکھنے والا پہلی نظر اٹھا کر پلکیں جھپکنا بھول جاتا تھا۔ وہ انگلینڈ میں جوان ہوا تھا۔ اس نے یورپ کی بہاریں دیکھی تھیں۔ لڑکیاں کچے دھاگے سے بندھی اس کی طرف چلی آتی تھیں۔ بہت سی اس کے ایک اشارے پر اپنا سب کچھ وارنے پر تیار ہو جاتی تھیں۔

اس نے بہت سوں سے دوستی کی تھی۔ بہتوں کے ساتھ دادِ عیش دے چکا تھا مگر پیار اسے کسی سے نہیں ہوا تھا اور جب پیار ہوا تھا تو یوں ہی ہو گیا تھا۔ پہلی نظر میں.......... کہنے والے کہتے ہیں اصل پیار چھ ماہ میں ہوتا ہے مگر نبیل کو تو تین دن میں ہو گیا تھا۔ وہ تین دن تین سالوں کے برابر تھے۔ پروین کا پیار نبیل کے سینے پہ ایسا نقش ہوا تھا کہ مٹنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ وہ اس نقش پہ حیلے بہانوں اور مصلحتوں کا غلاف چڑھا رہا تھا۔ وہ ہوٹل میں آرام کرنے کے بجائے رومی کے ساتھ یوں باہر نکل آیا تھا۔ اس کی بھی یہی وجہ تھی وہ اپنا دھیان بٹانا چاہتا تھا اور وہ اس میں کافی حد تک کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ وہ ہنس ہنس کر رومی سے باتیں کر رہا تھا۔

''اب تو آپ کافی فریش لگ رہے ہیں۔'' رومی نبیل کو Kiss کرتے ہوئے بولی تو آس پاس بیٹھی لڑکیوں کے دل جل کر راکھ ہو گئے۔

''میں تمہیں اسی لیے کہہ رہا تھا کہ باہر چلتے ہیں۔ ہوٹل میں میرا دل گھبرا رہا تھا۔''

''اب دل گھبرانا بند ہو گیا؟'' رومی چٹکی لیتے ہوئے بولی۔

''آف کورس۔''

''اوہ ہاں مجھے یاد آیا.......... تمہاری وہ عرض۔''

''جی ہاں.......... عرض کیا ہے۔''

''تم کوئی شعر سنانے لگی ہو؟''

''نہیں محترم! بندی عرض کرتی ہے کہ آپ کو میرے سے کوئی شکایت ہو تو مجھی سے کہئے گا۔ مام یا ڈیڈ سے بات نہیں کرنا۔''

''کیوں وہ ڈانٹیں گے؟''

''بس یہی سمجھ لو۔'' رومی یکدم سنجیدہ ہو کر بولی۔ ایک دم سے ہی اس کے لہجے میں سختی آ گئی جسے نبیل نے بھی شدت سے محسوس کیا۔ نبیل کے ماتھے پہ سلوٹیں ابھر آئیں۔

''رومی کیا بات ہے؟'' نبیل بھی سنجیدہ ہو گیا۔

''کچھ نہیں۔'' رومی بدستور سنجیدگی سے بولی۔

''تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو؟''

''میں نے تم سے کیا چھپانا ہے؟'' رومی تیوری ڈال کر بولی۔

''پھر ایسے behave کیوں کر رہی ہو؟''

''کیسے behave کر رہی ہوں میں؟''

''رومی تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟ ابھی تم اچھی بھلی تھیں۔''

''ہر بات کا جواب دینا ضروری ہے کیا؟'' رومی تلخی سے تیز آواز میں بولی۔

نبیل حیران اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کے بعد نبیل نے رومی سے کوئی بات نہیں کی۔ رومی بھی منہ بنائے بیٹھی رہی۔ نبیل خاموش بیٹھا رومی کے ناراض ہونے کے اسباب پہ غور کرتا رہا۔ ناراض ہونے کی وجہ لڑکیوں کا مسلسل اس کی طرف دیکھنا تو نہیں تھا یا اس کا لڑکیوں کی طرف دیکھنا۔ بات نبیل کے دل کو نہیں لگی ایسی کوئی وجہ نہیں تھی۔ نبیل اس سے پہلے بھی رومی کے ساتھ باہر نکلتا تھا۔ لڑکیاں اس کی طرف گھور گھور کر دیکھتی تھیں۔ پھر کیا وجہ تھی؟ جو رومی کا لہجہ یکدم بدل گیا تھا۔ اس میں تلخی آ گئی تھی۔ نبیل بہت دیر سوچتا رہا مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا۔

''رومی! آئی ایم سوری.......... میں نے بلاوجہ تمہیں تنگ کیا۔'' نبیل حق پہ ہوتے ہوئے بھی سوری کرنے لگا۔

پھر یکدم رومی کی جون بدل گئی۔ ''نہیں نبیل.......... سوری تو مجھے کہنا چاہیے۔'' یکدم اپنا رویہ بدل لینا اسے شاید وراثت میں اپنی ماں سے ملا تھا۔ ''میرے ہی لہجے میں ایک دم تلخی آ گئی تھی۔''

''اٹس او کے۔'' نبیل مسکرا کر اسے خود سے لگاتے ہوئے بولا۔

نبیل خاموش ہو گیا تھا مگر ایک شک نے نبیل کے دل میں جگہ پکڑ لی تھی۔ وہ دودھ پیتا بچہ نہیں تھا۔ پیچیدہ رویوں اور انسانوں کو جانتا تھا۔ رومی کا لہجہ ایک دم سے سرد کیوں ہو گیا تھا؟ وہ اس لمحے بالکل بدلی ہوئی رومی لگ رہی تھی۔ نبیل سے محبت کرنے کی بجائے نفرت کرتی رومی۔

''میری بات کا غصہ لگا ناں آپ کو۔'' وہ خاموش بیٹھے نبیل کے ساتھ لگ کر بولی۔ وہ کبھی ''آپ'' اور کبھی خود ہی ''تم'' پر اتر آتی تھی۔

''نہیں.......... ایسی تو۔''

''نہیں، لگا تھا۔ آپ ایسے ہی جھوٹ مت بولیں۔'' وہ نبیل کی بات کاٹ کر بولی۔

''ہاں.......... تھوڑا.......... تھوڑا لگا تھا۔'' نبیل ہلکا سا مسکرایا۔

''تھوڑا تھوڑا کیوں آپ کو بہت غصہ لگنا چاہیے تھا ہاں۔'' رومی نبیل کی ٹانگ پہ ہاتھ مار کر بولی۔

''اچھا پھر بہت غصہ لگا تھا۔'' نبیل نے کہا تو ایک بار پھر دونوں ہنسنے لگے۔

نبیل رومی کے اس رویے کی وجہ سے بہت بری طرح ڈسٹرب ہوا تھا مگر اس نے پھر اس بارے میں بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور پھر سے رومی کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

''نبیل! پلیز آپ مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ مجھے پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا۔ میں اس بارے میں بہت حساس ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہو اور آپ اس کا ذکر ڈیڈی سے کریں۔ اس طرح وہ بہت پریشان ہوں گے اور میں نہیں چاہتی کہ ڈیڈی میری وجہ سے پریشان ہوں۔ آگے انہیں بھلا کم پریشانیاں ہیں۔''

''رومی! پہلی بات تو یہ کہ مجھے تم سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوگی اور اگر ہو بھی تو میں بھلا اس کا ذکر ماموں سے کیوں کروں گا؟''

''نبیل! ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں پوچھو۔''

''نبیل! تمہارے دل میں کیا ہے؟ تم بیٹھے بٹھائے ایک دم سوچوں میں گم ہو جاتے ہو۔ تمہارے چہرے پہ انجانا سا کرب اُمڈ آتا ہے۔''

یکبارگی نبیل کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ اسے یوں لگا جیسے دل کا چور پکڑا گیا ہے۔

''نن.........نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' نبیل نظریں چرا کر بولا۔

''تمہیں میرے بارے میں کوئی شک ہے؟ مجھ سے کوئی شکایت ہے؟''

''نہیں میری جان ایسی کوئی بات نہیں۔''

''کہیں ہنی کی طرف سے تو آپ پریشان نہیں رہتے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ جس دن سے آپ کے ساتھ عہد کیا تھا کہ میں اسے کبھی نہیں ملوں گی۔ اس دن سے آج تک نہ ملی ہوں نہ کبھی ملوں گی۔ آپ میرا اعتبار کریں نبیل۔''

اس لمحے بھی نبیل کو اس پر بہت پیار آیا۔

نبیل اپنے بارے میں ڈر گیا تھا کہ شاید رومی کو اس کی سوچوں اور اس کی افسردگی کا سبب معلوم ہو گیا ہے مگر وہ تو اپنی صفائیاں پیش کرنے لگ گئی تھی۔ اطمینان کی ایک ٹھنڈی لہر نبیل کے پورے وجود میں پھیل گئی۔

انہیں پیرس میں ٹھہرے ہوئے ساتواں آٹھواں دن تھا۔ جب ایک رات سومی، ٹونی اور شکیل بھی وہاں پہنچ گئے۔ ایک دم زبردست رونق لگ گئی۔ ان لوگوں کے آتے ہی سیر و سیاحت، ہنسی مذاق اور تفریحات کا گراف بہت اوپر تک چلا گیا۔ سومی امید سے تھی۔ شکیل اٹھتے بیٹھتے اس کے لیے ہدایات جاری کر رہا تھا۔ آرام سے چلو، سیڑھیاں مت چڑھو، وزن نہ اٹھاؤ۔ اس کی یہ ہدایات بھی ہنسی کا بہانہ بن رہی تھیں۔

شکیل نے ایک دن معنی خیز لہجے میں نبیل سے پوچھا۔ ''بھائی جان! آپ کب اس قسم کی ہدایات جاری کرنے والے ہیں؟''

نبیل کی بجائے رومی نے جواب دیا تھا اور اس کا جواب خاصا سنجیدہ تھا۔ وہ بولی تھی۔ ''ابھی کافی دیر تک نبیل کو ایسی ہدایات کی ضرورت نہیں پڑے گی۔''

رومی کا موڈ دیکھ کر ان میں سے کسی نے مزید بات کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

شکیل، سومی اور ٹونی کی آمد کے پانچ چھ دن بعد وہ لوگ ایفل ٹاور دیکھنے گئے۔ تقریباً ساڑھے نو سو فٹ اونچا لوہے کا عظیم الشان مینار۔ اس کے نیچے اور اس کی چوٹی پر باقاعدہ مارکیٹیں اور ریستوران بنے ہوئے تھے۔ ٹونی نے اپنی معلومات کا اظہار کرنے کے لیے ان سب کو بتایا کہ یہ نادر تقریباً ایک سو دس سال پہلے مکمل ہوا تھا اور اس زمانے میں اس نادر عجوبے پر دس لاکھ ڈالر خرچ آیا تھا۔ ہر سال دنیا کے ہر خطے سے ہر نسل اور رنگ کے کروڑوں انسان اس عجوبے کی سیاحت کے لیے آتے ہیں۔

ٹاور کی لفٹس بند تھیں لہٰذا انہیں طویل سیڑھیوں کے ذریعے ٹاور پر چڑھنا پڑا۔ سومی بھی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی لہٰذا شکیل کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ جب وہ سارے نصف ٹاور کی بلندی پر پہنچ چکے تو اچانک رومی کو یاد آیا کہ وہ اپنا کیمرہ نیچے ہی بھول آئی ہے۔ ٹاور کے اوپر سے نظر آنے والے حسین مناظر کیمرے کے بغیر بیکار تھے۔ نبیل کے منع کرنے کے باوجود وہ کیمرہ لینے کے لیے نیچے چلی گئی۔ وہ سارے وہیں کھڑے اس کا انتظار کرنے لگے اور اپنے اردگرد پھیلے ہوئے رنگوں اور روشنیوں کے سمندر سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

جب کافی دیر ہوگئی تو نبیل نے شکیل سے کہا۔ ''میں جا کر اسے لے آتا ہوں۔''

وہ سیڑھیاں اترنے لگا۔ اس کے ذہن میں عجیب سا وسوسہ تھا۔ پتہ نہیں کس وقت کیوں اسے رومی کا رویہ عجیب سا لگتا تھا۔ وہ رومی کی جانب سے ایک غیر یقینی سی کیفیت کا شکار ہو جاتا تھا۔ ٹاور کے نچلے حصے میں ایک مختصر سی مارکیٹ کے سامنے اچانک نبیل کے قدم زمین نے پکڑ لیے۔ اسے یوں لگا تھا جیسے ایک دم کسی نے اس کی آنکھوں میں دو دہکتی سلائیں اتار دی ہیں۔ نبیل کی نظر ایک سیاہ فام پر جم کر رہ گئی تھی۔ چھوٹی چمکیلی آنکھوں اور کسرتی جسم والا یہ سیاہ فام نوجوان نبیل کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ یہ اسمتھ تھا۔ وہی اسمتھ جسے نبیل اسلامک سینٹر کے باہر رومی کے ساتھ جیپ میں دیکھ چکا تھا اور جو رومی کے ساتھ ایک دو مرتبہ گھر بھی آچکا تھا۔ اسمتھ کا بازو رومی کی کمر کے گرد کسا ہوا تھا۔ وہ اس کے کان میں سرگوشی کے انداز میں بات کر رہا تھا۔ پھر وہ رومی سے علیحدہ ہو کر مسکرایا اور اس کی طرف فلائنگ کس اچھالتا ہوا بھیڑ میں گم ہو گیا۔

نبیل اس منظر سے اور رومی کی نظروں سے چھپ کر دور نکل جانا چاہتا تھا مگر اچانک رومی کی نظر نبیل پر پڑ گئی۔ اس کا چہرہ سرسوں کی طرح زرد ہو گیا۔ وہ پہلے ٹھٹک گئی۔ پھر تیزی سے نبیل کی طرف بڑھی۔

☆............☆............☆

''اوئے گوگے! تو سب کچھ سمجھ گیا ہے ناں؟'' شوکا کھنگورا مار کے بولا۔

''چھوٹے سائیں! آپ فکر ہی نہ کریں۔ یہ بات آپ نے مجھے پہلے بتا دی ہوتی تو اب تک سارا کام سیدھا ہو گیا ہوتا۔''

''سنا ہے پروین گاؤں میں کڑیوں کا سکول کھولنے کا سوچ رہی ہے۔'' شوکا مونچھوں پہ ہاتھ پھیر کر بولا۔

''ہاں سائیں! سنا تو یہی ہے۔ پر لگتا ہے چوہدری بہشت علی ایسا نہیں ہونے دے گا۔ وہ اس معاملے میں بہت سخت ہے۔'' گوگا حقہ تازہ کر کے شوکے کے سامنے دھرتے ہوئے بولا۔

''گوگے! تیری شادی کو کتنے دن رہ گئے ہیں؟''

''سائیں! آپ بار بار کیوں پوچھتے ہیں؟ آپ کو تو پتہ ہی ہے ایک ہفتہ باقی ہے۔'' گوگا نیاز مندی سے بولا۔

''گوگے! تجھے کیا نہیں پتہ کہ میں کیوں بار بار پوچھتا ہوں؟'' شوکا گھوری ڈال کر بولا۔

''پتہ ہے.......... پتہ ہے سائیں!'' گوگا عجیب سی ہنسی ہنس کر بولا۔

''تو کہتا ہے ناں وہ گیندے کا پھول ہے۔'' شوکا حقہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

''ہاں چھوٹے صاحب!''

''سچ کہتا ہے تو گوگے.......... میلے سے واپسی پہ ٹرالی کے اوپر بیٹھے ہوئے میں نے اس رات اسے غور سے دیکھا ہے۔ پھر ساری رات میں سو نہیں سکا گوگے۔''

''چھوٹے صاحب! لگتا ہے پیار ہو گیا ہے آپ کو..........!'' گوگا آنکھ میچ کے ہنسا۔

''اوئے نہیں اوئے گوگے! پیار کیا ہوتا ہے؟ ہم تو ملنگ آدمی ہیں۔''

گوگا، شوکے کی بات سن کر بہت زور سے ہنسا۔

''بس سائیں میری شادی ہونے کی دیر ہے۔ آپ کو پتہ ہے نا پروین کی ایک ہی پکی سہیلی ہے اور اس کا نام ہے آسیہ۔''

''ہاں آسیہ تیری منگیتر۔''

''سائیں منگیتر کہاں اب تو گھر والی ہی کہیں۔ دو چار دن کی تو بات ہے۔''

''گوگے! یہ تو بتا پروین کا کسی پنڈ کے منڈے کے ساتھ کوئی چکر شکر تو نہیں؟''

''نہ جی نہ.......... وہ تو کسی کو گھاس ہی نہیں ڈالتی۔ بڑی سیدھی پدری ہے جی وہ۔''

''ٹیڑھی ہو جائے گی۔'' شوکا منجی پہ ہاتھ مار کے بولا۔

''وہ کیسے جی؟''

''بس تو دیکھتا جا میں کرتا کیا ہوں۔''

''میں سمجھا نہیں.........سائیں؟'' گوگا کبھی سائیں اور کبھی چھوٹے صاحب کہہ کر شوکے کو مخاطب کرتا تھا۔

''تو جبرو کو تو جانتا ہی ہوگا ناں؟''

''وہ جو شہر میں اینٹیں سپلائی کرتا ہے۔ وہی ناں۔''

''ہاں ہاں وہی جبرو۔ بڑے کام کا آدمی ہے۔ تین قتل کر چکا ہے۔''

''تو کوئی قتل کروانا ہے؟'' گوگا حیران ہو کر بولا۔

''اوئے نہیں اوئے مورکھا.........قتل نہیں کروانا۔ ہم تجھے ایسے آدمی نظر آتے ہیں؟''

''تو پھر! چھوٹے صاحب؟''

''ایک کھیل کھیلنا ہے۔''

''کیسا کھیل جی؟''

''اب ہر بات پوچھتا ہی جائے گا بس دیکھتا جا اور وقت کا انتظار کر۔''

''چھوٹے صاحب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک طرف آپ پروین کی طرف رشتہ بھیج رہے ہیں۔ دوسری طرف ایسی باتیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔''

''سب کچھ تیری سمجھ میں آجائے گا.........سب کچھ۔'' شوکا آنکھیں میچ کر بولا۔

اچانک ان دونوں کو چونکنا پڑا۔ دینو موچی اور بشیر کمہار ان دونوں کی طرف تقریباً دوڑے چلے آرہے تھے۔

دینو ہانپتا ہوا شوکے کے قریب پہنچا اور بولا۔ ''شوکے! بڑا غضب ہوا ہے۔ اس فضلو بیچارے کی تو بس کمر ہی ٹٹ گئی۔''

''پر ہوا کیا ہے؟'' شوکا حیران ہو کر بولا۔

بشیر نے کہا۔ ''فضلو کے دونوں پتروں کو کسی نے اتنا مارا ہے کہ ان کی ساری ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ جھوری تو پتہ نہیں بچتا بھی ہے کہ نہیں۔''

''کہاں ہیں وہ؟'' گوگے نے پوچھا۔

''دونوں قبرستان میں پڑے ہیں۔ نوری تو ہوش میں ہے لیکن جھوری بس مردہ ہی نظر آرہا ہے۔ ہم چوہدری صاحب کی طرف جا رہے ہیں ان سے کہنا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے اپنی جیپ دے دیں تاکہ ان بدنصیبوں کو ہسپتال تو پہنچایا جائے۔''

''یہ تو بہت برا ہوا۔'' شوکا بڑبڑایا۔ ''لیکن یہ ظلم کیا کس نے ہے؟''

''پتہ نہیں جی.........نوری نے بس اتنا بتایا ہے کہ مارنے والوں نے منہ پر منڈھاسے باندھ رکھے تھے۔ ان کے پاس کلہاڑیاں اور ڈانگیں تھیں۔''

شاید دینو کچھ اور بھی بتاتا لیکن ان کے پاس وقت کم تھا۔ وہ دوڑتے ہوئے چوہدری کے ڈیرے کی طرف چلے گئے۔

شوکا اپنی جگہ گم صم بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ نظر آ رہا تھا۔ جب دینو اور بشیر کافی دور چلے گئے تو گوگے نے کن اکھیوں سے شوکے کی طرف دیکھا۔ اسے اپنے جسم میں سردی کی لہر سی دوڑتی محسوس ہوئی۔ اسے چار پانچ دن پہلے کا ایک واقعہ یاد آ گیا تھا۔ میلے سے واپسی کا منظر اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ وہ سب ٹرالی پر بیٹھے تھے۔ نوری اور جھوری بھی تھے۔ ہنسی مذاق میں نوری کے منہ سے ایک بات نکل گئی تھی۔

☆..........☆..........☆

''پروین! تیرے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ تو شادی سے انکار کیوں کرتی ہے؟'' جنت بی بی سر پہ ہاتھ رکھ کے بولی۔

''ماں! بس میں نے کہہ دیا ہے ناں مجھے کوئی شادی وادی نہیں کرنی۔''

''تو نے گھر بیٹھے ایسے ہی بوڑھا ہونا ہے؟''

''ہاں بوڑھی ہو جاؤں گی۔ اس میں کسی کا کیا جاتا ہے؟'' پروین چڑ کر بولی۔

وہ کچھ دنوں سے بڑی چڑ چڑی ہو گئی تھی۔ ہر وقت کسی گہری سوچ میں گم رہتی تھی۔ جنت بی بی نے ہر حربہ آزما لیا تھا۔ ہر طریقے سے پروین کے دل کی بات جاننے کی کوشش کی تھی مگر ہر دفعہ ناکام رہی تھی۔ جنت بی بی نے نبیل کے متعلق بھی پوچھ لیا تھا کہ اس کے دل میں کہیں نبیل کا خیال تو نہیں ہے مگر پروین نے آگے سے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ وہ کسی پر اپنے پیار کا اظہار کرنا گناہ سمجھ چکی تھی۔ پروین کے پیار کو کوئی نہیں سمجھ سکا تھا۔ شاید نبیل بھی نہیں.......... پروین نے صرف مائی سیداں کے سامنے اس کا اظہار کیا تھا۔ مائی سیداں ہی وہ واحد ہستی تھی جو پروین کے دل کا حال جانتی تھی اور اسی مائی سیداں نے کہا تھا محبت تو سب کچھ خود پہ سہنے کا نام ہے۔ سو وہ سب کچھ خود پہ سہہ رہی تھی۔ اسے وعدہ کرنے والے کا انتظار بڑی شدت سے تھا۔ اس نے خط میں لکھا تھا۔ میں بہت جلد گاؤں آنے کا سوچ رہا ہوں۔ سوچتا ہوں گاؤں میں چھوٹی سی زمین خرید لوں اور اس میں ہل چلایا کروں۔ اس کے ان الفاظ میں کتنی محبت اور کتنی مٹھاس چھپی ہوئی تھی۔

''دیکھ پروین پتر! تو ہمیں ایسے امتحان میں مت ڈال کہ ہم اٹھنے جوگے نہ رہیں۔ شوکے میں دس کیا کمی ہے؟ کیا برائی ہے؟ تیرے بھائی راضی ماں پیو راضی تو پھر تجھے کیا مسئلہ ہے میری بیٹی؟''

''ماں! میں نے کب کہا ہے کہ شوکے میں کوئی برائی ہے؟ اس میں کوئی کمی ہے؟ سب کچھ ٹھیک ہے۔ سب بھلا چنگا ہے۔ پر ماں.......... مجھے شادی نہیں کرنی ہے۔ کسی سے بھی شادی نہیں کرنی ہے۔'' پروین بولتے بولتے رو دی۔

''ناں میری سوہنی دھی! روتے نہیں ہیں۔ میرے ربا میری اتنی معصوم سی دھی کو پتہ نہیں کس ٹٹ پینے کی نظر لگ گئی ہے۔'' جنت بی بی اسے خود سے لگا کر بولی۔

''پروین! دیکھ دو چار دنوں میں تیری سہیلی آسو کی بھی شادی ہو جائے گی۔ وہ اپنے گھر کی ہو جائے گی.......... تو سارا سارا دن کیا کرے گی..........؟ یہ زندگی بڑی اوکھی شئے ہے پتر گزارنا چاہو تو گزرنے کا نام نہیں لیتی ہے۔'' جنت بی بی دکھ سے بولی۔

''ماں! میں نے دل میں پکا عہد کر لیا ہے۔ میں گاؤں میں کڑیوں کا سکول بناؤں گی۔ میں یہاں کی معصوم روحوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کروں گی۔ یہ.......... یہ میرا خواب ہے ماں.......... میں نے آج تک زندگی میں کوئی خواہش نہیں کی۔ پر ایک خواہش کی تکمیل تو میرا حق ہے ناماں۔''

''دھی سوہنی! سکول بنانے اور بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے سے تجھے کس سے منع کیا ہے؟ تو شادی کر لے پھر سب کچھ کرتی پھر۔''

''ماں! شادی کے بعد یہ سب نہیں ہو سکے گا۔''

''کیسے نہیں ہو سکے گا؟''

''ماں! تو جس بارے میں نہیں جانتی کیوں بحث کرتی ہے۔'' پروین بے چینی سے پہلو بدل کر بولی۔

جنت بی بی جانتی بھی تو کیسے جانتی کہ پروین کے سینے میں کیسا طوفان موجزن ہے؟ اس کی دھڑکنوں میں کیسا غم کیسا کرب چھپا ہوا ہے؟ ازلوں سے جاری ساری عشق کی جڑیں اس کے اندر بہت دور تک گہری ہو چکی تھیں۔ فراق کے مہیب جہنم نے اس کے چہرے کی ساری سرخی چوس لی تھی۔ اس کے لبوں کی لالی کو بے رنگ کر دیا تھا۔ نبیل کے انتظار کی طوالت پروین کے چہرے سے اس کی مسکراہٹ چھین کر لے گئی تھی۔ جب کوئی خط آتا تھا تو وہ چند گھنٹوں کے لیے خوش ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد پھر فراق کی بے رحم سرد رات شروع ہو جاتی تھی۔ چند گھنٹے کا ''وصال'' اور پھر فراق ہی فراق.......... وہ مختصر وصال اور لمبے فراق کے دوران چکر کاٹ کاٹ کر شل ہو چکی تھی۔ وہ اب ایسا وصال چاہتی تھی جو فراق میں تبدیل نہ ہو۔ ایسا ملن چاہتی تھی جو جدائی سے آشنا نہ ہو۔ ایسی محبت چاہتی تھی جس کے دامن میں کرب کے آنسوؤں کی لڑیاں نہ ہوں۔ یہ تمنا بہت عرصے سے دل کے ساتھ جڑ گئی تھی کہ نبیل تم جو بھی ہو جیسے بھی ہو جس حالت میں بھی ہو میرے نزدیک رہو میرے سامنے رہو۔ میری دھڑکنوں کی زبان پڑھو میرے اندر کی تڑپ کو محسوس کرو۔ میں تمہارے سامنے اپنی محبت کا اظہار نہیں کر سکی اور نہ کبھی کر سکوں گی لیکن تم تو مرد ہو تم تو اظہار کر سکتے ہو۔ تم اظہار کیوں نہیں کرتے ہو؟ اگر تمہارے دل میں کچھ ہے تو پھر بولتے کیوں نہیں؟ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی تم سے تم کو بھی نہیں مانگتی کیونکہ مجھے علم ہے کہ تم آسمان ہو اور میں زمین ہوں۔ مگر زمین آسمان کو اگر چھو نہیں سکتی تو دیکھنے کا اختیار تو رکھتی ہے ناں، یہ اختیار مجھ سے مت چھینو۔ یہی تو میری زندگی ہے اسی کے سہارے تو میں جیتی ہوں۔ ماں کہتی ہے زمین پہ رہتے ہوئے چاند کی خواہش کرنے والوں کو لوگ بے وقوف کہتے ہیں۔ میں ماں کی زبان سمجھتی ہوں۔ مجھے پتا ہے مامی بہت سخت ہیں۔ انہوں نے ماموں کو کبھی گاؤں نہیں آنے دیا تھا۔ تمہیں کیسے آنے دیں گی۔ مگر میں ایک موہوم امید کے سہارے ہی تو جی رہی ہوں۔ چاند کو پانے کی خواہش تو بہت بڑی ہے۔ میں اس خواہش کو تقدیر پہ چھوڑتی ہوں مگر چاند کو دیکھنے کا حق تو میں رکھتی ہوں۔ مگر تم نے وہ حق بھی مجھ سے چھین لیا ہے۔ ایسا ظلم تو مت کرو نبیل میں نے زیادہ کچھ تو نہیں مانگا۔ ترسی آنکھوں کی پیاس کی تسکین مانگی ہے۔ اپنا حق مانگا ہے تم سے۔ پلیز میرا حق دو.......... پلیز گاؤں چلے آؤ.......... مجھے اور مت ستاؤ۔

پروین شادی سے انکار کے زور پہ اپنی محبت کو بچائے بیٹھی تھی۔ وہ اپنی محبت کو پتا نہیں کہاں کہاں چھپائے پھرتی تھی۔ کبھی آنسوؤں میں کبھی خطوں کو چوم کے۔ کبھی گرلز سکول کا نام لے کر۔ کبھی نبیل کی بیٹھی ہوئی جگہوں کو دیکھ کر، انہیں چھو کر، کبھی مائی سیداں کی داستان میں کھو کر کبھی نبیل

کی کہی باتوں کو سوچ کر ان کے مفہوم پر غور کر کے اس نازک اور تھوڑ دلی لڑکی کو محبت نے سخت جان بنا دیا تھا۔ اسے اتنا مضبوط بنا دیا تھا کہ وہ کسی کے سامنے بھی اپنے پیار کا دکھڑا نہیں پھولتی تھی۔ اپنے غموں اپنے آنسوؤں کو اپنے ہی اندر چھپائے پھرتی تھی۔ اس نے سنا تھا محبت سب کچھ خود پہ سہنے کا نام ہے۔ وہ کسی کو اپنے دکھ میں شامل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے ماں کے یہ کہنے پر کہ اس کے دل میں کہیں نبیل کا خیال تو نہیں۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

محبت کی تپش نے اس نازک سی کونپل لڑکی کو شاعری سے روشناس کرا دیا تھا۔ اب اس کا قلم فر فر چلتا تھا۔ روشنائی کو قرطاس پہ بکھیرتا ہوا آگے نکل جاتا تھا۔ اس روشنائی میں پروین کے پیار کی چمک تھی۔ سیداں مائی کے علاوہ بھی پروین کا ایک رازداں پیدا ہو گیا تھا وہ کاغذ قلم اور سیاہی تھے۔ جو پروین کے دکھ درد کی شدت کو جانتے تھے اسے محسوس کرتے تھے۔ جس رات دونوں بھائی اور اماں ابا شو کے سے اس کے رشتے کی باتیں کر رہے تھے۔ وہ ساری رات روتی رہی تھی۔ اس نے روتے ہوئے ایک غزل تحریر کی تھی۔ جس کا عنوان انتظار تھا۔ اس کا مفہوم کچھ یوں تھا کہ لمبی رات بیت گئی تم نہ آئے سارے دن کا تھکا ہارا سورج شام کی سرخی کے پیچھے چھپ گیا مگر تم نہیں آئے۔ چاول بن کے تیار ہو کے کٹ بھی گیا تم نہیں آئے۔ میلہ بیت گیا تم نہیں آئے۔ تم نے کہا تھا جب چاول تیار ہو جائے گا تو میں آؤں گا۔ میلہ شروع ہوا تو میں آؤں گا۔ شادی کے بعد اپنی بیوی کو لے کر آؤں گا مگر تمہارے سب وعدے جھوٹے ہوئے تم نہیں آئے.......... تم نہیں آئے مگر میرا انتظار ختم نہیں ہوا.......... میرا انتظار جاری رہے گا۔ جب تک تم نہیں آؤ گے.......... جب تک میں تمہیں ان آنکھوں سے دیکھ نہ لوں گی میرا انتظار جاری رہے گا.......... میرا انتظار جاری رہے گا۔

''پروین! تو نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا ہے۔'' جنت بی بی روتے ہوئے بولی تو پروین خیالات کی دنیا سے لوٹ آئی۔

''ماں! میں آسو کے ساتھ مدین وال جا رہی ہوں۔''

''کیوں وہاں کیا ہے؟''

''آسو کو وہاں سے شادی کے لئے کچھ چیزیں خریدنی ہیں اور چاچی بھی تو ساتھ جا رہی ہے نا..........''

''واپس کب آؤ گی..........؟'' جنت بی بی تیوری ڈال کر بولی۔

''دو تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔ شاہ بابا کو سلام بھی کر آؤں گی۔''

''شاہ بابا کو سلام کرنے بھی جائے گی..........؟'' جنت بی بی نے کچھ دیر سوچا پھر بولی۔ ''اچھا پھر میری بات سن، وہاں نبیل کے لئے بہت دعا کرنا.......... مجھے لگتا ہے وہ بے چارہ بہت پریشان ہے۔ اس کے دو خط آئے ہیں دونوں میں اس نے لکھا ہے کہ میرے لئے دعا کریں۔ رب خیر کرے.......... تجھے تتی ہوا بھی نہ چھوئے میرے بیٹے۔'' جنت بی بی نے ہاتھ اٹھا کر کہا تو پروین کے دل میں صدا گونجی۔ آمین۔

آسو اس کی ماں اور پروین جب مدین وال پہنچے تو سورج کا مشرق سے مغرب تک کا سفر ابھی آدھا ہوا تھا۔ کتے کی نرم دھوپ ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ ضروری چیزوں کی خریداری کے بعد تینوں دربار پر سلام کرنے چلی گئیں۔ موقع دیکھ کر آسیہ اور پروین وہاں سے کھسک گئیں۔ شاہ جی تک پہنچتے انہیں تھوڑی دیر ہی لگی۔ شاہ جی بیٹھا سگریٹ کے کش کھینچ رہا تھا۔ دونوں وہاں پہنچی تو شاہ جی بولا۔ ''بیٹھ جاؤ بچہ۔''

''سلام شاہ جی۔'' دونوں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

جواب دینے کی بجائے شاہ جی سر ہلانے لگا۔'' کامیابی ملے گی مگر صبر کرنا پڑے گا۔''

''شاہ جی! میں یہی پوچھنے آئی تھی.......... کب کامیابی ملے گی..........'' پروین ہولے سے بولی۔

''تو جس کامیابی کی بات کرتی ہے وہ کبھی نہیں ملے گی.......... کبھی نہیں.......... اس کامیابی کا انتظار چھوڑ دے۔ کیوں خود کو روگ لگائے بیٹھی ہے۔ تجھے بھی پتا ہے ایسا نہیں ہو سکتا پھر کیوں آنکھوں میں خواب سجائے بیٹھی ہے۔ ہاں.......... البتہ تجھے دوسری کامیابی ضرور مل جائے گی.......... ایسا ہو کے رہے گا۔''

''مگر شاہ جی! اس کامیابی کے بغیر میں ادھوری ہوں۔'' پروین رو دی۔

''قدرت کے آگے کسی کا زور نہیں.......... کسی کا زور نہیں.......... بچہ۔''

''شاہ جی! خدا سے دعا کریں وہ میری مشکلیں آسان کر دے۔'' پروین سسکی۔

''بچہ! ارادہ کی مشکلیں آسان ہو سکتی ہیں۔'' شاہ جی کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''وہ کس طرح! شاہ جی۔'' پروین کی آنکھیں یکدم چمک اٹھیں۔

''تجھے ہر دوسرے دن یہاں حاضری لگوانا پڑے گی۔''

''میں.......... میں آ جایا کروں گی! شاہ جی.......... آپ.......... آپ جیسا کہیں گے میں کروں گی شاہ جی..........''

''یہ لے پھر یہ تنگ لے جا۔'' وہ سبز جھولے میں سے ایک سرخ تنگ نکال کر بولا۔''اس کو سبز ڈوری کے ساتھ بازو پر باندھ لے۔ تیرے مقصود کی طرف تیرا سفر شروع ہو جائے گا۔ اور ہاں حاضری لگوانا کسی دن نہ بھولنا۔''

''جی.......... جی اچھا جی..........'' پروین سر جھکاتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔

''پروین! میرا خیال ہے تیری پہلی کامیابی شاہ جی سکول کے بننے کو کہہ رہے تھے جبکہ دوسری کامیابی شوکے سے شادی ہے۔ پہلی کامیابی مشکل ہے جبکہ دوسری کامیابی مل جائے گی۔ اس کا مطلب ہے شوکے کے تیری شادی پکی ہے۔'' آسیہ نیچی بیریوں سے گذرتے ہوئے بولی۔

پروین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے اندر ایک خوفناک سی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔

اس کے من میں ایک سوچ پروان چڑھ رہی تھی وہ بھائی فضل دین کو خط لکھ کر شہر سے واپس بلائے اور جتنی جلدی ہو سکے سکول کی بنیاد رکھ دی جائے۔ فضل دین جاتے ہوئے کہہ کر گیا تھا کہ جب اگلی دفعہ آئے گا تو سکول بنوا کر ہی واپس جائے گا۔

پروین کو نظر آ رہا تھا کہ اس کا انتظار شاید مزید طوالت اختیار کر جائے گا۔ شاہ جی نے کہا تھا تیرے مقصود کی طرف تیرا سفر شروع ہو جائے گا۔ وہ سفر پتا نہیں کتنا لمبا کتنا صبر آزما تھا مگر اسے طے تو کرنا تھا۔ سکول بننا اس کا پرانا خواب بھی تھا اور پھر انتظار وقت کاٹنے کا ذریعہ بھی بن جاتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مصروف کر لینا چاہتی تھی۔ فارغ ہوتی تھی تو نبیل کی یادیں اسے ڈستی تھیں۔ اسے رلاتی تھیں۔ اکثر زیادہ سوچنے والے انسان کو ماہر

نفسیات ہمیشہ مصروف رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

پروین جب گھر پہنچی تو سورج اپنی کرنیں سمیٹنے میں مصروف تھا۔ دم توڑتے سورج کی سرخی مٹی سے پوتے کچے گھروں کے در و دیوار پہ چھپ سی گئی تھی۔ فضا میں بھی نارنجی سی روشنی رقص کر رہی تھی۔ منجی کی فصل کٹ کر اس میں سے چاول نکالا جا چکا تھا اور جن لوگوں نے منجی دیر سے لگائی تھی ان کی فصلیں ابھی کھڑی تھیں۔ مگر ان کی تعداد بہت کم تھی۔ بہت سے زمیندار گندم لگانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہل جوتا جا چکا تھا زمین تیار ہو چکی تھی۔ ادھر کماد کی فصل بھی تیار ہو چکی تھی۔ دیسی میٹھا گنا اپنی پوری جوانی پہ تھا۔ گڑ اور شکر بنانے والے بیلنوں کے پاس ہی کڑاہے رکھے مصروف عمل تھے۔ بیلنے کو چلانے کے لئے دو بیل جوتے جاتے تھے اور جہاں بیل میسر نہ ہو وہاں ایک اونٹ کافی ہوتا ہے۔

پروین گھر پہنچی تو جنت بی بی بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ پروین کے دل کو بہت تکلیف پہنچی وہ تیزی سے ماں کی طرف لپکی۔

''ماں! تو رو کیوں رہی ہے؟''

''میں کہاں روتی ہوں میرے نصیب روتے ہیں۔'' جنت بی بی بلک پڑی۔ ماں کا یہ انداز پروین کیلئے نیا بھی تھا اور تکلیف دہ بھی۔

''چھوٹی تھی تو ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔'' جنت بی بی نے کہنا شروع کیا۔ ''چاچا حیات اور گاؤں کے لوگوں نے مل کر ہمیں پالا۔ ایک طرف شادی کی خوشی تھی تو دوسری طرف بھائی جدا ہو گیا۔ وہی بھائی جس کو اپنے کھلونے دے کر میں بہلایا کرتی تھی۔ خود بھوکی سو جاتی تھی اسے پیٹ بھر کر کھانا کھلاتی تھی۔ خود راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتی تھی مگر اس کی آنکھوں سے کبھی آنسو نہیں گرنے دیا کرتی تھی۔ پروین! جن کا بچپن میں ہی اپنا کوئی نہ رہے ان کی حالت کا تم اندازہ نہیں لگا سکتی۔ پرائے چاہے اپنوں سے بڑھ کر پیار کریں۔ مگر اپنے برابر یاد آتے ہیں۔ ان کی یاد تو کوئی نہیں روک سکتا۔

''اپنا ایک بھائی ہی بھائی تھا ایک دن نمانہ وہ بھی دنیا سے رخصت ہو گیا۔ میں اس سے کتنا پیار کرتی تھی تو نہیں جانتی۔ ماں بن کر پالا تھا میں نے اس کو۔ شہر سے گاؤں آتا تھا تو میں باؤلی ہو جاتی تھی۔ دنیا کی ہر شئے جھومنے لگتی تھی۔ کتنا دکھ ہوتا تھا اس کی آنکھوں میں کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔ میں اس دکھ کو جانتی تھی۔ وہ واپس گاؤں آنے کے ترلے مارتا تھا مگر نبیل کے پیار کی وجہ سے نہیں آ سکتا تھا۔'' نبیل کے نام پہ پروین کے دل میں کسی نے میٹھی سی چٹکی لی۔ ''میں اس کی اپنی تھی میں اس کے دکھ کو جانتی تھی۔ میں یہاں موتیوں کے ہار پروتی تھی وہ وہاں بیٹھا آنسو بہاتا تھا۔ مائی زلیخا کے گھر میں کھوہ کے پاس بیٹھ کر ہم دونوں نے وعدہ کیا تھا ایک دوسرے سے کہ ہمیشہ ساتھ ساتھ رہیں گے یہ تعلق رنگلی ڈوری جیسا مضبوط بنائیں گے جو توڑنے سے نہیں ٹوٹتی......... مگر تعلق جڑنے کا وقت ہی نہیں آیا۔ میں شادی کے بعد اپنے گھر کی کیا ہوئی حسا بس شہر کا ہی ہو کر رہ گیا۔ اس نے ایک طرح سے بہن کا فرض پورا کر دیا تھا۔ وہ شہر سے میرے لئے بڑے بڑے تحفے بھیجا کرتا تھا مگر وہ بڑا بھولا تھا۔ بھلا بہن کو یہ سب تو نہیں چاہئے تھا۔ وہ تو دن رات اس کی راہیں تکتی رہتی تھی مگر اس بے درد کو کبھی خیال ہی نہ آیا۔ پھر جب اس نے دنیا سے ہی منہ موڑ لیا تو رستہ سونا ہو گیا۔ رستہ اداس ہو گیا۔ دھول اڑتے رستے پہ غم کی ایک لمبی لکیر کھینچ گیا تیرا ماما.........

''پھر......... پھر ایک دن ایسا ہوا.........'' جنت بی بی جیسے ٹرانس میں بول رہی تھی۔ ''اس اداس رستے پہ بہاروں کی حکمرانی ہوئی بھائی

نہ آیا بھائی کا خون اس کا بیٹا چلا آیا۔ سوہنا نبیل چلا آیا۔ میں اپنے پرانے سب غم بھلا بیٹھی۔ رب سے شکوے شکائتوں کا دفتر بند کر دیا۔ نبیل میں مجھے حسنا جیتا جاگتا نظر آتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں عجیب سی روشنی دیکھی تھی۔ گاؤں سے بے انتہاء محبت کی روشنی۔ مجھے یقین تھا نبیل جہاں بھی جائے واپس ادھر ہی آئے گا۔

''ہاں ماں! وہ ضرور آئے گا۔'' پروین برگد کی طرف دیکھ کر بولی۔

جنت بی بی نے یکدم اس کی طرف دیکھا۔ ''نہیں پتر! مجھے لگتا ہے وہ کبھی نہیں آئے گا۔ انوری بیگم بڑی سخت عورت ہے۔ جو عورت بندے کو قابو کرنا جانتی ہو اس کے لئے اولاد کو قابو کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔''

''ماں! اولاد خود سر بھی تو ہو جاتی ہے۔'' پروین نے ہولے سے کہا۔

''نہیں پروین پتر! نبیل کبھی گاؤں نہیں آئے گا.......... تجھے پتا ہے ولایت کی زندگی بڑی تیز رفتار ہے۔ وہاں کسی کو کسی کے لئے سوچنے کا وقت کہاں ہے۔ میں سمجھی تھی نبیل کی صورت میرے غموں کا مداوہ ہو جائے گا۔ مگر مجھے لگتا ہے میں غلطی پر ہی تھی۔ نبیل بھی بے ایمان نکلا جھوٹا نکلا وہ بھی.......... اپنے باپ کی طرح.........'' جنت بی بی گھٹنوں میں سر دے کر اونچی آواز میں رونے لگی۔ پروین کے لئے یہ سب بہت تکلیف دہ تھا۔ آج سے پہلے کبھی بھی اس نے ماں کو اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔

''ماں! ماں۔ خدا کے لئے نہ رو.......... میرا دل ڈوبتا جا رہا ہے۔''

''نہیں چاہئے مجھے تیری ہمدردی..........'' جنت بی بی پروین کا بازو جھٹک کر بولی تو پروین کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ''ماں! تو مجھ سے خفا ہے۔'' پروین ڈوبتے لہجے میں بولی۔

''اپنی تقدیر سے خفا ہوں میں.......... اپنی تقدیر سے۔'' جنت بی بی اور زور سے رو دی۔

''ماں! یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ پروین بے حد پریشانی سے بولی۔''

''تجھے ساری کہانی سنانے کا مقصد یہ تھا کہ تجھے پتا چلے میں کتنی دکھی اور پریشان ہوں۔''

''ہاں ماں! میں جانتی ہوں۔'' پروین نے مختصر جواب دیا۔

''نہیں جانتی.......... تو کچھ نہیں جانتی اسی لئے تو میری جان کی دشمن بنی ہوئی ہے۔''

''ماں! یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟ تیرے لئے تو میں اپنی جان دے سکتی ہوں۔''

''جتنا تو نے مجھے ستایا ہے اتنا کسی نے بھی نہیں ستایا۔ آج تک مجھے کانٹوں پر گھسیٹ رہی ہے تو۔''

پروین بھی رونے لگی۔ ''ماں! تجھے کیا ہوا ہے؟''

''دیکھ پروین! نہ تو شادی کے لئے ہاں کرتی ہے۔ نہ ہی تو اس انکار کے بارے میں بتاتی ہے۔ میں جاؤں تو کدھر جاؤں۔ تجھے کوئی اور پسند ہے.......... تو شوکے سے شادی نہیں کرنا چاہتی کہیں اور کرنا چاہتی ہے۔ کچھ تو بتا کچھ تو بول۔''

''ماں! میں شادی نہیں کرنا چاہتی ہوں۔ لڑکیوں کا سکول چلانا چاہتی ہوں۔''

''تیری انہی باتوں نے میرا جینا عذاب بنا رکھا ہے۔ ایسا کر.........تو ایسا کر اپنے ہاتھ سے مجھے زہر دے کر مار ڈال'' جنت بی بی اٹھ کھڑی ہوئی اور واویلہ کرنے لگی۔

''ماں.........ماں.........اِدھر آ.........اِدھر میری بات سن۔'' پروین ماں کو کندھوں سے تھام کر اندر لے جانے لگی۔

''چھوڑ دے مجھے تُو میری کچھ نہیں لگتی.........'' جنت بی بی نے پروین کا ہاتھ ایک بار پھر سے جھٹک دیا۔ ''آج کے بعد مجھے ماں مت کہنا.........سمجھ تیری ماں تیرے لئے۔''

پروین نے یکدم ماں کے منہ پہ ہاتھ دھر دیا اور ہچکیاں لینے لگی.........''ماں! اندر چل میں تجھے سب بتاتی ہوں۔ تو ایک دفعہ اندر چل.........'' وہ ماں کو اندر والے کمرے کی طرف کھینچ کر بولی۔ اندر داخل ہو کر اس نے کنڈا چڑھایا اور ماں کو لے کر منجی پر بیٹھ گئی۔ ''ماں اِدھر دیکھ میری طرف۔'' وہ ماں کے آنسو اپنی چنری سے صاف کر کے بولی جبکہ اس کے آنسو گالوں پہ ڈھلکے جا رہے تھے۔ جنت بی بی پروین کی طرف دیکھنے لگی۔ چند لمحے بوجھل خاموشی کے گزر گئے۔ جنت بی بی پروین کے بولنے کی منتظر تھی۔ مگر پروین کے حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا لگ گیا تھا۔ دونوں طرف خاموشی میں آنسو ہی زبان بنے ہوئے تھے۔ جنت بی بی کے آنسو جیسے پوچھ رہے تھے۔ ''بتا نا بیٹی.........کیا ہے تجھے کیا ہے.........کیا روگ ہے جو تو چھپائے پھرتی ہے۔'' جبکہ پروین کے آنسو بول رہے تھے۔

''ماں! رہنے دے مت پوچھ پردہ ہے پردہ ہی رہنے دے۔''

پھر یکدم پروین کی آواز کسی گہرے کنوئیں سے برآمد ہوئی۔ ''ماں! میں نبیل سے پیار کرتی ہوں۔ میں.........اس کے بغیر نہیں رہ سکتی.........'' لاکھوں کروڑوں قمقموں والا فانوس تھا جو آسمان سے گرا تھا اور سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا تھا۔ اس کی آواز خلا میں سینکڑوں میل تک دائرے بناتے ہوئے پھیل گئی تھی۔

ایک منٹ کے لئے جیسے فضا بھی ششدر رہ گئی تھی۔ جنت بی بی کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے مگر آواز ناپید تھی۔ پھر یکدم ٹھٹھری ہوئی آواز برآمد ہوئی۔ ''پتری! یہ.........یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟''

''ماں! میں وہی کہہ رہی ہوں جو تُو نے سن لیا ہے۔'' پروین رو دی۔

جنت بی بی نے جھپٹ کر پروین کو زمین سے اٹھایا اور اپنے پاس منجی پر بٹھالیا۔ ''دیکھ پروین! تُو نے کسی سے بات تو نہیں کی۔''

''ماں! تیرے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔'' پروین نے مختصر جواب دیا۔

''پروین! نبیل کا خیال دل سے نکال دے۔ جو کچھ نہیں ہو سکتا اس کے لئے تمنا کیسی خواہش کیسی۔''

پروین پھیکی سی ہنسی ہنسنے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے نئے آنسو پھوٹ پڑے۔

ماں! کیسی بات کرتی ہے۔ اچھا تُو ایک کام کر، یہ لے یہ ٹوکا پکڑ۔'' وہ انگیٹھی پہ پڑے ہوئے ٹوکے کو ماں کے ہاتھ میں دے کر بولی۔

''اور اس ٹوکے سے میرا سر میرے جسم سے جدا کر دے۔''

''یہ تو کیا بکواس کر رہی ہے؟'' جنت بی بی ٹوکے کو پرے رکھ کر بولی۔

''ماں! تو ٹوکے سے میرا سر جسم سے جدا نہیں کر سکتی تو نبیل کو مجھ سے جدا کرنے کی باتیں کیوں کرتی ہے؟ ماں! میں تجھے آج سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں۔ میں اس کے پیار میں بہت دور نکل چکی ہوں۔ اب واپسی ناممکن ہے ماں۔ میں جیتے جی مر جاؤں گی کسی اور کی دلہن نہیں بنوں گی۔''

''اور اگر وہ تجھے نہ ملا؟'' جنت بی بی جیسے خیالوں میں بولی۔

''تو میں زندگی بھر شادی ہی نہیں کروں گی ماں۔'' پروین کی لمبی آنکھوں کے کٹورے لبالب بھر گئے۔

''نہ.........نہ پُتر! ایسی بات نہیں کرتے۔'' جنت بی بی خوفزدہ ہو کر بولی۔

''ماں! میں اس کے بغیر مر جاؤں گی.........'' پروین کے منہ سے چیخ کی صورت نکلا اور وہ ماں کے گلے لگ کر دھاڑیں مارنے لگی۔ وہ بہت دیر یوں ہی ماں سے لگی روتی رہی پھر جب من کچھ ہلکا ہوا تو جنت بی بی نے بڑی آہستگی کے ساتھ اسے خود سے جدا کیا۔

جنت بی بی کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں۔

''پروین! کیا نبیل بھی تجھ کو چاہتا ہے؟'' جنت بی بی نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

پروین کے سینے میں جیسے بھونچال سا آ گیا۔ اس سے پہلے تو یہ خیال اس کے دل میں گزرا ہی نہیں تھا۔ اس نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ جس دیوانگی سے وہ نبیل کو چاہتی ہے۔ کیا نبیل بھی اسے اس طرح چاہتا ہے۔ مگر نہیں اس نے تو کہا تھا کہ وہ اپنی ہونے والی بیوی سے بہت پیار کرتا ہے اور اس کی ہونے والی بیوی اس کے ماموں کی لڑکی تھی۔

یہ سوچ کے آتے ہی کوئی تیز دھار چیز اس کے سینے کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ ''ہاں.........ہاں ماں.........وہ بھی.........'' پروین کو الفاظ ادا کرنے مشکل ہو رہے تھے۔ ''وہ بھی.........پیار کرتا ہے۔'' جنت بی بی عجیب سی نظروں سے پروین کی طرف دیکھنے لگی۔ ''پروین! مجھے شک تو بڑی دیر سے تھا کہ تو اسے چاہنے لگی ہے مگر میں موقع کے انتظار میں رہی کہ تجھ سے پوچھوں گی۔ مگر جب میں نے تجھ سے پوچھا تو تُو نے سرے سے انکار ہی کر دیا۔ مگر ایک بات بتا! پتری تو نے میرے کلیجے میں ٹھنڈک اتار دی ہے۔ تو نہیں جانتی وعدے، عہد، ارادے کیا ہوتے ہیں۔ جب ہم دونوں کی شادی نہیں ہوئی تھی تو میں نے اور حسنے نے ایک عہد کیا تھا۔'' جنت بی بی اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی اور دور کہیں دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ جیسے روٹھا بچہ کھلونوں کے ملنے پر آنسو پونچھ لیتا ہے اور اس کی آنکھوں میں چمک اتر آتی ہے۔ ایسی ہی چمک اس لمحے اس کی آنکھوں میں تھی۔ ''یہ بات آج سے پہلے میں نے کسی کو نہیں بتائی صرف تمہیں بتا رہی ہوں۔ ہم دونوں نے قسم کھائی تھی کہ اگر حسنے کی بیٹی ہو گی تو میں بیٹا اس کے ساتھ بیاہوں گی اور اگر میری بیٹی ہوئی تو حسنا بیٹا ادھر بیاہے گا۔''

پروین کا جسم خوشی سے دھیرے دھیرے لرزنے لگا جیسے اسے سب کچھ مل گیا تھا۔

''ہم ناسمجھ تھے بے عقل تھے جو ایسی قسم کھا بیٹھے تھے۔ مگر اب یوں لگتا ہے جیسے قدرت وہ قسم پوری کرنا چاہتی ہے۔ ہمارا مان رکھنا چاہتی

ہے۔'' جنت بی بی خیالوں میں بولی۔

پھر جنت بی بی پروین سے خطوں کے بارے میں پوچھنے لگی اور پروین جھجک جھجک کر اسے بتانے لگی۔ پروین نے ماں کو یہ بھی بتایا کہ اس نے انگلینڈ میں جو خط بھیجا تھا۔ اس کا جواب ابھی تک نہیں آیا۔ جنت بی بی ایک دم سے جیسے چاک و چوبند ہوگئی تھی۔ اس کے چہرے پہ بے نام سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

''پروین! تیرے ابا نے کہا ہے کہ اگلے سال کے آخر میں تیری شادی کر دیں گے۔ تیرے بھائی بھی اس پر راضی ہیں۔ ان کا کہنا ہے اس وقت تک جہیز بھی پورا تیار ہو جائے گا۔ پر.......... پر میں انہیں کسی نہ کسی طرح ٹال لوں گی۔ تو ایسا کر..........''

''ماں! ایک بات کا خیال رکھنا یہ بات کسی کو بھی پتا نہ چلے۔'' پروین بات کاٹ کر روہانسی ہو کر بولی۔

''میری پتری! تو فکر مت کر..........'' جنت بی بی افسردہ سی ہو کر بولی۔ ''تو ایسا کر میری طرف سے آج ہی نبیل کو خط لکھ.......... دیکھ وہ کیسے یہاں اڑتا ہوا آتا ہے۔''

''سچ ماں۔'' پروین کی گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔

''تو دربار سے نبیل مانگنے گئی تھی ناں..........'' جنت بی بی نے پروین کی طرف ترچھی نظریں کر کے دیکھا۔ پروین کھلکھلا کر ہنس دی۔ وہ پلکیں جھکا کر کچی زمین پہ ناخن رگڑنے لگی تھی۔

''پھر جب جائے گی تو میں بھی تیرے ساتھ جاؤں گی..........'' جنت بی بی نے مسکرا کر کہا تو پروین نے آگے بڑھ کر ماں کو گلے لگا لیا۔ اس کے شفاف چہرے پہ یکدم سے آنسو پھیلنے لگے تھے۔ وہ آنسو نہ جانے کیسے تھے خوشی کے تھے یا غم کے تھے۔ بس قطار اندر قطار بہتے چلے آ رہے تھے۔ وہ ان آنسوؤں کو روکنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے بہت غم سہے تھے۔ اب سکون و طمانیت کی لمبی چادر نے اس کے وجود کا احاطہ کر لیا تھا اور وہ نہال ہوئی جا رہی تھی۔

''ماں! وہاں دربار پہ ایک درویش صفت بزرگ بھی بیٹھے ہیں۔ شاہ جی کہتے ہیں وہ لوگ ان کو۔ آسو مجھے وہاں لے کر گئی تھی۔ کہتی تھی بڑے باکمال اللہ والے ہیں۔''

''وہ جو بیریوں سے پرے بیٹھتے ہیں؟'' جنت بی بی نے پوچھا۔

''ہاں ماں! میں تجھے وہاں لے کر جاؤں گی۔''

''ہاں کل ہی ہم وہاں جائیں گے۔ پہلے تو ایسے کر، کاغذ اور قلم لا اور ابھی یہاں میرے پاس بیٹھ کر خط لکھ۔''

''اچھا ماں! میں ابھی آئی۔'' پروین کو جیسے پر لگ گئے تھے اور وہ اڑی پھرتی تھی۔ جنت بی بی پروین کو سیڑھیاں چڑھتی دیکھ رہی تھی۔ کتنی خوش تھی پروین کتنا اطمینان تھا اس کے چہرے پہ۔

☆..........☆..........☆

دائرے پہ آج بڑا رش تھا۔ بڑے بوڑھے سارے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ گرلز سکول کے لئے رائے شماری کی جا رہی تھی۔ تیس پینتیس فیصد لوگ سکول کے حق میں تھے جب کہ باقی لوگ سکول کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سکول کھلنے سے بے حیائی پھیلے گی۔ بچیاں گھر بیٹھی ہی اچھی لگتی ہیں۔

''یار سجنو تے مترو!'' چاچا حیات نے کہنا شروع کیا۔ ''تعلیم بڑی اچھی شے ہے اب تو شہروں میں جو لڑکی پڑھی لکھی نہ ہو اسے رشتہ ہی نہیں ملتا۔ شہروں میں ہر طرف کڑیوں کے سکول ہی سکول کھل رہے ہیں۔ یہ بچیاں بالڑیاں پڑھ لکھ کے سیانی اور سمجھدار ہو جائیں گی۔ یہی بچیاں ہی تو ہیں جنہوں نے کل کو نئی نسل کی رکھوالی کرنی ہے۔''

''رہنے دے چاچا! پڑھ لکھ کر تو دماغ ہی کھراب ہوگا کڑیوں کا۔ ایک دوسرے کو خط پتر بھیجے جائیں گے۔ اس پڑھائی لکھائی میں بڑی کھرابیاں ہیں۔'' دینو موچی بولا۔

''ارے نہیں اوے مورکھا! تو غلط پاسے کیوں جاتا ہے یہ کیوں نہیں دیکھتا وہ چھوٹے بچوں کو پڑھائیں گی۔ تیرا کوئی خط آئے گا اسے پڑھیں گی تجھے کسی کو پیغام کوئی سدا دینا ہوگا تو تُو ان سے لکھوائے گا۔ اخبار پڑھ کے سنائیں گی۔ سرکار کا کوئی کام ہوگا اس میں مدد کریں گی۔''

''یار پڑھائی میں بڑی برکتیں ہیں۔'' صدیق ٹینڈ بھی بولا۔

یہ بحث رات دس بجے تک جاری رہی مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ سکول سے انکار کرنے والے اکثر لوگ تو نیم رضا مند ہو گئے مگر سب سے بڑا سوال یہ کھڑا ہوا کہ سیالکوٹ جا کر کاغذات کون تیار کرائے گا۔ پیسہ کون منظور کرائے گا۔ چوہدری بہشت علی ابھی شہر سے نہیں لوٹا تھا۔ اگر وہ یہاں ہوتا تو اس منصوبے میں پوری پوری ٹانگ اڑاتا اب جبکہ گاؤں کے سب لوگ نیم متفق ہو گئے تھے اس لئے چوہدری بہشت علی کو اپنی بات منوانے میں خاصی دقت پیش آنی تھی۔

آخر کار یہ میٹنگ اس بات پر اختتام پذیر ہوگئی کہ اگر گورنمنٹ کی طرف سے رقم منظور ہو جائے تو سکول بننے میں کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے اور اگر ایسا نہ ہو تو سکول کے معاملے میں خاموشی ہی اختیار کر لی جائے۔ پروین کو جب رات کو یہ خبر دین محمد کے ذریعے پہنچی تو وہ بڑی دل گرفتہ ہوئی۔ اس کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ کوئی ایسا بندہ نہیں تھا جو سیالکوٹ جا کر یہ کام کر سکتا کسی کو کیا مصیبت پڑی تھی سیالکوٹ کے روز روز چکر لگانے کی منظوری کے بغیر سکول بننا بھی ناممکن نظر آیا تھا۔ اسی پریشانی میں کئی دن گزر گئے۔ ایک دن جب پروین پریشانی کے عالم میں آم کے رکھوں سے ہوتی ہوئی قبرستان کی طرف چلی جا رہی تھی۔ وہ ابھی قبرستان سے چند منٹوں کی دوری پہ تھی کہ اس کا ٹاکرا شوکے سے ہو گیا۔ پروین نے جلدی سے چنری سر پہ درست کی، سینے پہ پھیلائی۔ پروین کو دیکھ کر شوکے نے نگاہیں نیچی کر لی تھیں۔

''پروین! تو کدھر جا رہی ہے۔'' سلام کے بعد شوکا آہستہ سے بولا۔

''بب.........بس آم کے رکھوں کی طرف گئی تھی اب گھر جا رہی ہوں۔'' پروین نے نظریں جھکا کر کہا۔

''میں ڈوبو مٹی کی طرف گیا تھا ابھی ادھر سے ہی آ رہا ہوں۔''

پروین کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ''سنا ہے اُدھر تو کوئی نہیں جاتا۔'' نا چاہتے ہوئے بھی پروین کے منہ سے نکل گیا۔

''کیوں اُدھر کیا ہے؟''

''بڑوں سے یہی سنا ہے جو اُدھر گیا واپس نہیں آیا۔''

''پھر دیکھ لو، میں تو آ گیا ہوں۔ تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔'' شوکا چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ''بس ایسے ہی لوگوں نے باتیں بنا رکھی ہیں۔'' وہ رائفل دائیں کندھے سے اتار کر بائیں کرتے ہوئے بولا۔ ''میں خرگوش کا شکار کھیلنے گیا تھا۔ قابو ہی نہیں آیا۔''

''آپ اتنے چھوٹے سے جانور کو مارتے ہیں ترس نہیں آتا؟''

''پروین بی بی! جب ہمیں بھگاتے بھگاتے اسے ترس نہیں آتا تو ہمیں کیوں ترس آئے اس پر۔''

''بڑے ظالم ہیں آپ۔'' پروین نے دکھ سے کہا۔

''لو اس میں ظلم والی کونسی بات ہوئی۔ حلال جانور ہے۔ شکار کر کے پکایا جاتا ہے اسے۔ بڑا لذیذ گوشت ہوتا ہے اس کا۔'' شوکا مونچھوں پہ ہاتھ پھیر کے بولا۔ پروین جانے لگی تو شوکا بولا۔ ''پروین سنا ہے تو لڑکیوں کا سکول کھولنا چاہتی ہے۔''

''ہاں مگر کوئی بات ہی نہیں بن رہی۔'' پروین ڈھلکی چنری کو پھر سے سر پہ درست کر کے بولی اس طرح اس کی کلائیوں میں پڑی چوڑیاں بول اٹھیں۔

''کیا مطلب بات نہیں بن رہی؟''

''سیالکوٹ شہر سے جا کر سکول کی منظوری لینی پڑے گی اور اس کے لئے کچھ امداد بھی سرکار سے چاہئے۔ یہ کام تبھی ہو سکتے ہیں۔ جب کوئی بار بار سیالکوٹ کے چکر لگائے اور یہ کام کروالے۔ مجھے ایسا لگتا ہے یہ بھی ممکن نہیں ہو سکے گا۔'' پروین اداسی سے بولی۔

''کیوں نہیں ہو سکے گا۔'' شوکا سینہ پھیلا کر بولا۔

''کیا مطلب.........؟'' پروین بے اختیار بولی۔

''میں جاؤں گا سیالکوٹ.......... میں یہ کام کراؤں گا..........'' شوکا سینے پر ہاتھ مار کے بولا تو جیسے پروین کی آنکھوں میں یکدم سے سینکڑوں دیئے ٹمٹمانے لگے۔

''آپ.......... سچ کہہ رہے ہو نا..........'' پروین شہادت کی انگلی کو ایک اینگل پہ رکھ کر بولی۔

''لو بھلا اس میں جھوٹ والی کون سی بات ہے۔ میں کل صبح ہی جیپ لے آؤں گا۔ پھر تم میرے ساتھ چلنا تین چار گھنٹوں میں ہماری واپسی ہو جائے گی۔

''پر.......... میں.......... مَیں کیسے جاؤں گی..........؟'' پروین نگاہیں نیچی کر کے بولی۔

''تو پریشان کیوں ہوتی ہے۔ میں تیرے ابے سے اجازت لے لوں گا۔ اور تو اکیلی تھوڑا جائے گی میرے ساتھ۔ تیری سہیلی آسو کو بھی

لے چلیں گے۔''

شوکے کی یہ بات پروین کی سمجھ میں آ گئی اوراس کے چہرے پہ اک مسکراہٹ چھا گئی۔

''اچھا میں ابھی آسو سے بات کرلوں۔''

''ہاں ہاں.........اسے بتا دو کہ صبح نو بجے تیار رہے۔ میں بھٹے سے جیپ لے آؤں گا۔تم دونوں ڈیرے پہ ہی پہنچ جانا۔ اچھا رب راکھا۔'' شوکا پروین کی طرف دیکھے بغیر بولا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔ پروین خوشی خوشی آسیہ کے گھر کی طرف ہولی۔

شوکا جب بھٹے پہ پہنچا تو تین ساڑھے تین کا وقت ہو رہا تھا۔ کام کرنے والے مزدور مرد اور عورتیں اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ گوگا جیسے انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک رہا تھا۔

''اوئے اپنی ماں کے کھسمو تیز ٹرو۔ کھاتے اتنا اتنا ہو تمہاری ٹانگوں میں جان نہیں ہے کیا؟ اوئے چھوٹی! تیرے اندر کس کا تخم ہے جو یوں منک منک کر چلتی ہے۔'' شوکے کو اپنی طرف آتا دیکھ کر گوگے کی گالیوں میں شدت آ گئی تھی۔ ''اوئے سور کے ہڈ! یہ اینٹوں کی پال سورج ڈوبنے تک پوری نہ ہوئی تو تم سب کی چمڑی اتروا دوں گا۔ اوئے ماٹھو! تو.....تو یہاں بیٹھا کیا کرتا ہے۔ ہر وقت جورو کے ساتھ جڑا رہتا ہے۔ کام کرتے موت کیوں پڑی ہے تجھے۔'' وہ یونہی سب کو ننگی گالیاں دیا کرتا تھا۔

''اوئے چھڈ گوگے! ادھر آ میری بات سن۔'' شوکا گرجدار آواز میں بولا۔

''ہاں......ہاں جی صاحب جی! فرماؤ۔''

''جیپ کا کیا حال ہے ٹھیک ٹھاک ہے نا؟''

''ہاں جی! اسے کیا ہونا ہے۔''

''وہ تھوڑے دن پہلے اس کا ریڈی ایٹر لیک تھا ناں......وہ اب ٹھیک ہے؟''

''ہاں صاحب جی! وہ تو میں نے اگلے دن ہی پھجے چھڑ وال سے ٹھیک کرا لیا تھا۔''

''صبح سیالکوٹ جانا ہے اس پر۔ اس کو چیک شیک کر لے۔''

''خیر ہے ناں! چھوٹے صاحب۔''

''خیر ہی تو نہیں ہے گوگے......'' شوکا پرسوچ انداز میں مسکرایا۔ ''ادھر آ میرے پاس بیٹھ منجی پہ تجھے بتاؤں۔'' شوکا اسے اپنے پاس بٹھا کر کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ''گوگے! تجھے پتا ہے ناں، میں تجھ سے ہر بات کر لیتا ہوں۔''

''آپ کی خاص عنایت ہے جی مجھ پر......نہیں تو بندہ کس قابل ہے۔''

''عنایت کے گھوڑے سن میری بات۔'' شوکا برا منہ بنا کر بولا۔ ''تجھے پتا ہے ناں میری ماں بچپن میں مجھے اکیلا چھوڑ کے چلی گئی تھی۔ پتا نہیں کدھر گئی۔ چل چھوڑ اسے......میں جو بات تجھے بتانے لگا تھا وہ یہ ہے کہ میں نے آج تک کسی سے ہار قبول نہیں کی۔ اپنی من موج کی زندگی

گزاری ہے میں نے جو چیز چاہی حاصل کر لی جس شئے کی طرف ہاتھ بڑھایا وہ میرے قدموں میں ڈھیر ہوگئی۔ انکار میری رگوں میں آگ لگا دیتا ہے۔ نہیں کا لفظ میری زندگی میں ہے ہی نہیں۔''

''میں آپ کی بات سمجھا نہیں جی۔''

''کتے کے بچے! صبر کر میری بات پہلے غور سے سن۔'' شوکے کا لہجہ بڑا خوفناک ہو گیا تھا۔

گوگے کو یکدم جیسے چپ لگ گئی۔

''پہلے پہلے تو پروین کا ذکر کیا کرتا تھا اور میں خاموشی سے سن لیا کرتا تھا۔ اپنے نے ایک دن مجھ سے بات کی کہ پروین سے اچھی کڑی پورے پنڈ میں نہیں ہے۔ بلکہ آس پاس کے پنڈوں میں بھی نہیں ہے۔ اس نے میری شادی پروین کے ساتھ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں بھلا کیا کہتا میں نے ''ہاں'' کر دی۔ ہاں کرتے ہوئے مجھے ذرا بھی دیر نہیں لگی کیونکہ یہ کوئی ایسا پھل تو نہیں جو میں نے پہلے کبھی نہ کھایا ہو۔ ایسا فروٹ تو نہیں جس کا ذائقہ میں نے نہ چکھا ہو۔''

''جی..........جی بالکل صاحب جی۔'' گوگا دانت نکال کر بولا۔

''ہاں تو میں نے ہاں کر دی پر تجھے کیا پتا کہ کبوتری بڑی تیز ہے۔ ہاتھ نہ آنے والی کبوتری ہے۔ آسو نے مجھے پوری رپورٹ لا کر دی کہ پروین میرے ہاتھ آنے والی نہیں ہے۔

''اس کی کیا مجال ہے جی کہ آپ کے ہاتھ نہ آئے۔'' گوگا غصے سے بولا۔

''اوئے مورکھا! میری بات سن پہلے مجھے پروین میں اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ شادی بھی تو ایک جنجال ہی ہوتا ہے ناں۔ جب بغیر شادی کے ہی موج میلہ ہے تو شادی کا پھاہ پانے کی کیا ضرورت ہے۔''

''ہاں جی پھر شادی کا پھاہ پانے کی کیا ضرورت۔'' گوگا تنک کر بولا۔

''پر اب یہ پھاہ پانا ہی پانا ہے۔ جو چیز میری پہنچ میں نہ آئے وہ میرے لئے ضد بن جاتی ہے اور میں اپنی ضد پوری کر کے رہتا ہوں۔ پروین نے مجھ سے شادی سے انکار کیا ہے۔ اب پروین میری مجبوری بن گئی ہے۔ پروین اب صرف اور صرف میری ہوگی۔ اور کوئی اس کا کھسم نہیں بنے گا میرے سوا۔''

''پر چھوٹے سائیں اگر گستاخی معاف ہو تو ایک بات کہوں۔''

''ہاں بول۔''

''پروین! ایسی کڑی نہیں ہے جو دھمکیوں یا کسی اور طریقے سے مان جائے۔ وہ پیار سے ماننے والی کڑی ہے۔ میں نے بڑے قریب سے دیکھا بھالا ہے جی اسے۔''

''دھمکیوں یا ڈراوے سے ہی منانا ہوتا تو کب کی مان گئی ہوتی۔ مگر یہ سب میری شان کے خلاف ہے۔ میں اسے محبت کے زور پہ حاصل

کروں گا دیکھ لینا تم۔''

''چھوٹے سائیں! آپ ایسے ہی پریشان ہو رہے ہیں۔ یہ تو پکا ہوا پھل ہے جو آپو آپ ہی آپ کے قدموں میں آ گرے گا۔ آپ سے اچھا اور خوبصورت لڑکا اسے اور کہاں سے ملے گا۔''

شوکا رعونت سے بھٹے سے پرے پھیلی پیلیوں کی طرف دیکھنے لگا۔''تو ٹھیک کہتا ہے گوگے وہ پکا پکایا پھل ہے۔''

وہ بڑا روشن دن تھا۔ شوکا کلف لگا سفید سوٹ پہن کر جیپ میں بیٹھا دائرے پہ پروین اور آسو کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پروین اور آسیہ گاؤں کی طرف سے چلی آ رہی تھیں۔ شوکے نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا اور سیدھا ہو کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''بھا شوکے! ہمیں زیادہ دیر تو نہیں لگی۔'' آسو جیپ کی پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئی بولی۔

''نہیں میں بھی ابھی آیا تھا۔ بس کچھ تیار شیار ہونے میں دیر لگ گئی تھی۔'' شوکا جیپ کو چلاتے ہوئے بولا۔

''بھا! ایک بات تو بتا اتنا تیار شیار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟'' آسیہ نے شوکے کو چھیڑا۔

''سرکار کے لوگوں سے ملنا ہو تو ایسے ہی جانا پڑتا ہے۔ بندے کی پوزیشن کمزور ہو تو اگلے زیادہ توجہ نہیں دیتے، بات نہیں سنتے۔'' شوکا بیک مرر پروین پے سیٹ کر کے بولا۔ پروین کو شوکے کی یہ بات بڑی بھلی لگی۔

''شوکا ٹھیک کہتا ہے آسو۔ آج کل بندے کے ظاہر کو دیکھا جاتا ہے اس نے کپڑے کیسے پہنے ہیں۔ جوتا کیسا پہنا ہے۔ حتیٰ کہ سر کے بال بھی ٹھیک طرح سے سر پہ نا جمائے ہوں تو اسے شخصیت کی کمی میں گنا جاتا ہے۔''

شوکا دل ہی دل میں پروین کی بات پہ بہت خوش ہوا۔''سیالکوٹ میں میرا ایک پرانا ملنے والا ہے۔ ہم پہلے اس کے پاس جائیں گے اس کی ڈی سی سے واقفیت ہے۔ مجھے بڑا یقین ہے کہ ہمارا کام پورا ہو جائے گا۔ پورا نہ بھی ہوا تو پیش رفت ضرور ہو گی۔''

''بھا! ویسے پروین کو بڑی مشکل سے اجازت ملی ہے سیالکوٹ جانے کی۔'' آسیہ نے کہا۔''پروین کا ابا کہتا تھا کیا ضرورت ہے شہر میں جا کر دھکے کھانے کی۔ وہاں کوئی کسی کی بات نہیں سنتا۔ شہر جا کر ایویں خراب ہونے والی بات ہے۔ پر پروین چاچے کے سامنے ڈٹ گئی۔ اس نے کہا۔''ابا! جب تک ہم کوشش نہیں کریں گے تو کوئی نتیجہ بھی تو نہیں نکلے گا۔ ہم شہر جائیں گے وہاں بات چیت کریں گے۔ گاؤں کے بڑوں بوڑھوں کے انگوٹھوں والا ورقہ انہیں دکھائیں گے۔ تبھی کچھ پتا چلے گا نا۔ جب پروین نے بہت اصرار کیا تو پھر چاچے نے اجازت دی ہے جانے کی۔''

''ہمت والے لوگوں کے قدموں میں ہی کامیابیاں ڈھیر ہوتی ہیں۔'' شوکے نے بڑے ملائم لہجے میں کہا تو پروین نے بڑی تیز نظروں سے شوکے کی طرف دیکھا۔

''بھا! اجازت تو مجھے بھی بڑی مشکل سے ملی ہے۔'' آسیہ ایک بار پھر بولی۔

''تیری تو اور بات ہے۔'' شوکا دھیما سا ہنسا۔

جیپ کچے اور پکے رستوں سے سفر کرتی ہوئی منزل کی طرف رواں تھی۔ پیلیاں دور دور تک خالی ہو چکی تھیں۔ منجی کی کٹائی ہو چکی تھی اور

اب گندم کی تیاری ہورہی تھی۔اس لئے زیادہ زمین خالی پڑی تھی۔جبکہ کہیں کہیں کماد کے کھیت بالکل تیار کھڑے تھے۔اور مکئی بھی تیار ہو چکی تھی۔کہیں شالا لگا ہوا تھا تو کہیں جوار باجرے کی کٹائی ہورہی تھی۔تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد وہ لوگ سیالکوٹ شہر پہنچ گئے۔شوکے نے اندرون شہر سے اپنے ایک دوست کو ساتھ لیا اور پھر بڑی جلدی میں وہ لوگ ڈی سی آفس پہنچے کیونکہ اس کے دوست نے بتایا تھا کہ ڈی سی صاحب بارہ بجے تک اپنے آفس میں بیٹھتے ہیں۔جب وہ لوگ وہاں پہنچے تو ڈی سی صاحب موجود ہی تھے۔ڈی سی صاحب پتا نہیں کیسے خوشگوار موڈ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے دس منٹ کے اندر سکول کی منظوری دے دی یا شاید یہ حکومت کی طرف سے فروغ تعلیم کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ انہیں بہت جلد فارغ کر دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ ایک ہفتے بعد انسپکشن ٹیم گاؤں کا دورہ کرے گی موقع دیکھے گی اور دو مہینے کے اندر اندر کام شروع کرا دیا جائے گا۔جب وہ لوگ آفس سے نکلے تو پروین کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔بہت سہانا بہت پیارا خواب،جس میں چھوٹی بڑی بچیاں کتابیں لئے سکول کی طرف رواں دواں ہیں۔جیپ کے پاس پہنچ کر پروین نے آسیہ کو گلے لگا لیا تھا۔اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔وہ تشکر آمیز نظروں سے شوکے کی طرف بھی دیکھ رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں شوکے کے لئے احترام ہی احترام تھا۔شوکے نے وہاں سے اپنے دوست کو اس کی دکان پہ چھوڑا اور سیالکوٹ سے وقتِ رخصت اس نے کچھ پھل لے لیا۔

''بھئی تم لوگوں کو کھانا کھلانا تو اچھا نہیں لگتا۔گاؤں پہنچنے تک ان پھلوں پر ہی گذارہ کرو۔''شوکے نے جیسے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

''بھا!پیسے بچانے کے لئے اچھا بہانا ہے۔''آسیہ پروین کو آنکھ مار کے بولی۔

''بھئی!میں تو تمہاری وجہ سے کہہ رہا تھا کہ''شوکا کہنا چاہتا تھا کہ پروین نے اس کی بات کاٹ دی۔''

آ......آپ جیپ گاؤں کی طرف موڑیں اسے تو باتیں بنانے کی عادت ہے۔''پروین آسیہ کو زور سے چٹکی کاٹ کے بولی۔پروین پہلے ہی شوکے کے احسان تلے دبی ہوئی تھی کہ جب کسی نے ساتھ نہ دیا تھا تو شوکے نے آگے بڑھ کر اس کا کام آسان کیا تھا۔جیپ پھر سے گاؤں کی طرف فراٹے بھرنے لگی تھی۔سیدھے جاتے یک دم شوکے نے جیپ کا رخ بائیں طرف موڑ دیا تھا۔''مجھے لگتا ہے ڈیزل کچھ کم ہے۔اس طرف پیٹرول پمپ ہے وہاں سے ڈلوا لیتے ہیں۔''شوکے نے کہا دونوں لڑکیاں خاموش رہیں وہ بھلا کیا کہتیں۔

وہ بڑی ویران اور بے آباد سڑک تھی۔دور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ابھی دس منٹ کا رستہ ہی طے ہوا تھا کہ یکدم تین گھوڑ سوار گھنے درختوں میں سے اچانک برآمد ہوئے۔ان تینوں کے ہاتھوں میں خودکار ہتھیار تھے۔انہوں نے اپنے چہرے نسواری رنگ کے کپڑے سے لپیٹ رکھے تھے۔انہوں نے رائفلوں کا رخ شوکے کی طرف کر دیا تھا۔شوکے نے جیپ روک دی تھی۔دونوں لڑکیاں خوف کے مارے زرد ہوئی پڑی تھیں۔حملہ آوروں نے شوکے کو جیپ سے نیچے اتار لیا تھا اور رقم کا مطالبہ کر رہے تھے۔جبکہ شوکا مسلسل انکار کر رہا تھا۔پھر ان تینوں میں سے ایک کڑک دار آواز میں بولا۔''دونوں لڑکیاں اٹھا لو۔''اس کے کہنے کی دیر تھی دونوں ہذیانی انداز میں چیخنے چلانے لگی تھیں۔

شوکے نے ہاتھ کھڑا کر کے انکو رکنے کا اشارہ کیا۔''خدا کا خوف کرو......ان لڑکیوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔''شوکا گھمبیر آواز میں بولا۔

''بگاڑا تو تُو نے بھی نہیں کچھ ہمارا......''ایک نے قہقہہ لگایا۔

''اس سے کچھ بھی برآمد نہیں ہونے والا۔ ایسا کرو اس والی لڑکی کو اٹھالو اور نکلو یہاں سے۔'' ان میں سے ایک پروین کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

''خبردار! خبردار جو کسی نے اس کی طرف ہاتھ اٹھایا۔'' شوکا دھاڑا۔

''تو اس کا ماما لگتا ہے......'' ایک زہریلے لہجے میں بولا۔

''تمہیں رقم چاہئے ناں......'' شوکا بولا۔

''ہاں اگر ہماری منہ مانگی رقم دو گے تو تم سب کو چھوڑ دیں گے ہم جھوٹے لوگ ہیں۔ پر اب سچا وعدہ کرتے ہیں تم سے...... خدا سے بہت ڈر لگتا ہے ہمیں۔'' رائفل لہراتے ہوئے ایک بولا۔

''کتنی رقم چاہئے تمہیں بولو......'' شوکا بولا۔

''ایک لاکھ روپیہ...... صرف ایک لاکھ روپیہ۔''

''میرے پاس صرف پچاس ہزار روپیہ ہے اس وقت۔'' شوکا بولا۔

تینوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مشورہ کیا اور پچاس ہزار لینے پر راضی ہوگئے۔ شاید وہ نئے نئے وارداتیے تھے۔ لڑکیوں کو اٹھانے کا بھی صرف ڈراوا ہی دیا تھا انہوں نے، جس میں وہ سو فیصد کامیاب رہے تھے۔ شوکے نے سیٹ کے نیچے بنے خفیہ بکس سے پچاس ہزار نکال کر ڈاکوؤں کے حوالے کر دیئے اور وہ سیکنڈوں میں وہاں سے غائب ہوگئے۔

شوکے نے بوجھل انداز میں جیپ کا رخ واپسی کے لئے موڑا اور بڑی تیز رفتاری سے گاؤں کی طرف ہولیا۔ دس پندرہ منٹ تو وہ تینوں کوئی بات ہی نہ کر سکے۔ پھر شوکے نے دھیمے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ''اسے میں زندگی کا خوفناک حادثہ ہی سمجھ سکتا ہوں۔ بہرحال میں مطمئن ہوں کہ کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ روپیہ پیسہ آنی جانی شے ہے۔ آج میرے پاس کل اس کے پاس...... مجھے پیسے جانے کا قطعی افسوس نہیں ہے۔ بس ایک بات بری طرح میرے دل میں کھٹک رہی ہے۔''

''وہ کیا؟'' آسیہ سہمی ہرنی کی طرح بولی۔

''تم دونوں میرے ساتھ ایک پکا عہد کرو۔'' شوکا یہ کہہ کر چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ''یہ عہد کرو کہ اس واقعے کو ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ گی۔ تم دونوں کسی سے بھی اس کا ذکر نہیں کرو گی کسی سے بھی۔''

''مگر بھا!'' آسیہ نے کچھ کہنا چاہا۔

''بس میں نے کہہ دیا ہے ناکہ کسی سے ذکر نہیں کرنا۔'' شوکا تھوڑا سختی سے بولا۔ پروین کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ وہ ایک بت کی طرح ساکت بیٹھی ہوئی تھی۔ بولنے کے لئے اس کے پاس کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ اس کی ڈبڈباتی آنکھیں بار بار شوکے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

''اگر تم دونوں میں سے کسی کو کچھ ہو جاتا تو میں کبھی اپنے آپ کو معاف نہ کر پاتا۔'' شوکا بھیگی آواز میں بولا۔ کئی آنسو ایک ساتھ ٹوٹ کر

پروین کی آنکھوں سے گرے۔

☆............☆............☆

دونوں اپنے کمرے میں گم صم سے بیٹھے تھے۔ رومی کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ وہ جب سے ایفل ٹاور سے لوٹے تھے اسی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نبیل کے دماغ میں جیسے کسی نے گرم سلاخ گھسیڑ دی تھی جب جب وہ منظر اس کی نگاہوں میں تازہ ہوتا تھا۔ اس کے دماغ میں ٹیسیں اٹھنے لگتی تھیں۔ جب رومی اپنے بوائے فرینڈ کا ہاتھ تھامے ایفل ٹاور کے فلور میں چلی جا رہی تھی۔ اس نے نبیل کے سامنے کئی توجیہیں بیان کی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ ''سمتھ'' یہاں گھومنے آیا ہوا تھا اتفاقیہ ملاقات ہوگئی اور پھر سمتھ زبردستی میرا ہاتھ پکڑ کر دکان میں لے گیا۔ وہ شاپنگ کرنے آیا ہوا تھا۔ نبیل نے رومی کی تمام باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ خاموشی سے ایفل ٹاور سے نیچے چلا آیا تھا۔ رومی بھی بھاگتی بھاگتی اس کے ساتھ ہی نیچے پہنچی تھی۔ دونوں ہوٹل میں بھی اکٹھے پہنچے تھے۔ اس دوران ان کی آپس میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر بھی وہ دونوں خاموش تھے۔ نبیل نے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ رومی کو طلاق دے دے گا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ رومی نہیں سدھرے گی۔ آج نہ کل نہ بیس سال بعد، مگر بہت سوچ بچار کے بعد اسے اپنے دل میں فیصلہ بدلنا پڑا تھا۔ بوڑھے ماموں کی شکل اس کی نگاہوں میں گھوم گئی تھی۔ پھر ماں کی کہی ہوئی باتیں اسے یاد آنے لگی تھیں۔ وہ ماں کے مان کی صورت توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے ابھی مزید سوچنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ واش روم میں گیا اچھی طرح سے منہ ہاتھ دھویا۔ ٹاول سے چہرہ خشک کرتے ہوئے جب وہ باہر نکلا تو حیران رہ گیا۔ رومی غش سا کھا کر نبیل کے قدموں میں گری اور زار و زار رونے لگی۔ وہ نبیل کے پاؤں سے اپنا سر ٹکرا رہی تھی اور چیخ رہی تھی۔ ''نبیل! خدا کے لئے............ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ میں ایسی نہیں ہوں جیسی تم سمجھ رہے ہو۔ میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں تم سے بے حد پیار کرتی ہوں۔ نبیل تم مجھے جو سزا بھی دو گے مجھے منظور ہوگی۔ مگر پلیز مجھ سے ناراض نہیں ہونا۔ تمہاری خاموشی میری جان لے لے گی۔ میرا............ میرا دم گھٹا جا رہا ہے نبیل............'' بات کرتے کرتے رومی کی آنکھیں جیسے الٹ گئیں تھیں۔ نبیل نے جھپٹ کر اسے خود سے لگا لیا۔ شاید آج سے پہلے نبیل کو اندازہ نہیں تھا کہ رومی اس سے کتنا پیار کرتی ہے۔

رومی بے ہوشی میں جیسے بولے جا رہی تھی۔ نبیل اسے کندھے کے ساتھ لگا کر بیڈ تک لے آیا۔ اسے لٹا کر ساتھ بیٹھ گیا۔ ''رومی............! رومی آنکھیں کھولو............ ادھر دیکھو............ ادھر............''

رومی آدھی آنکھیں کھولے آدھی بند کئے نبیل کی طرف دیکھنے لگی۔ '' نبیل............! نبیل............ تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہوناں............ مجھ سے خفا تو نہیں ہوناں۔ میں............ میں اب تمہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی............ کبھی ایسی حرکت نہیں کروں گی جس سے تمہیں تکلیف پہنچے۔''

''اِس............ اِس............ او کے رومی۔'' نبیل اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیر کے بولا۔

وہ لوگ مزید پندرہ دن پیرس میں رہے۔ اس دوران رومی کسی لونڈی کی طرح نبیل کے آگے پیچھے پھرتی رہی۔ اس کی ضرورت اس کی خوشی کا خیال رکھتی رہی۔ اس کے آگے بچھ بچھ جاتی رہی۔ نبیل آفس سے لوٹتا تو اس کے استقبال کے لئے کھڑی ہوتی۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے بوٹ اتارتی، کوٹ اتارتی، ٹائی ڈھیلی کرتی۔ اس کے سامنے جھکی جھکی رہتی۔ ادھر نبیل کی زبان سے کوئی فرمائش ادا ہوتی ادھر وہ فوراً حکم کی بجا آوری کرتی۔ رومی کی یہ تبدیلی نبیل کے لئے بڑی خوش آئند تھی۔ وہ اس کی طرف سے بہت مطمئن ہو گیا تھا۔ نبیل کو رومی کی یہ سب نئی باتیں بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ اس پر فدا ہو ہو جاتا تھا۔ مگر یہ سب باتیں اپنی جگہ، ایک عجیب سی الجھن نے بھی نبیل کو مسلسل گھیر رکھا تھا۔ وہ بیٹھا بیٹھا اکثر خیالات میں کھو جاتا تھا۔ وہ گاؤں کی یاد میں کھو جاتا تھا۔ پروین بیٹھے بٹھائے اس کے ذہن پہ چھا جاتی تھی۔ وہ جتنا اس یاد کو جھٹکنا چاہتا تھا اتنی ہی یہ یاد اس کے دل و دماغ میں راسخ ہوتی چلی جاتی تھی۔ وہ اس انہونے جذبے کو کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔ کبھی کبھار سوتے میں بھی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا تھا۔ اور کتنی دیر بستر پر بیٹھا بے مقصد دیواروں کو گھورتا رہتا تھا۔ جیسے یہ دیواریں اس کے لئے قید خانہ ہوں اور اس قید خانے کے باہر اس کے لئے ہنستی مسکراتی زندگی کب سے منتظر کھڑی ہو۔ اس کو بستر پہ بیٹھے گھٹن ہونے لگتی اس کا دل چاہتا وہ دروازہ کھول کر باہر نکل جائے اور ایک سمت کو دوڑتا چلا جائے بلند و بالا بلڈنگیں ختم ہو جائیں راستے میں آنے والے سمندر اور صحرا پیچھے رہ جائیں اور پھر ٹاہلی کے لہلہاتے ہوئے بوٹے اس کا استقبال کریں۔ وہ ٹاہلی کے درختوں کا حال پوچھتا ہوا گاؤں کی کھلی اور وسیع زمین میں داخل ہو جائے۔ سرسوں کے کھیتوں میں بھاگا پھرے۔ منجی کی فصل کو بوسہ دے۔ جوار اور باجرے کی پریوں کو آنکھوں سے لگائے۔ چمکیلی دھوپ کو آنکھوں میں جذب کر کے ٹیوب ویل کے جھاگ اڑاتے پانی میں کود جائے۔ سورج مکھی کے وسیع کھیتوں میں پروین کے پیچھے بھاگا پھرے۔ پروین کا گلابی آنچل ہوا میں لہراتا ہوا اس کے چہرے پہ چھا جائے۔ پروین کے بدن سے اٹھنے والی خوشبو اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر دے۔ وہی مانوس خوشبو جس نے نبیل کو تب دیوانہ بنا دیا تھا جب گاؤں میں لائٹ گئی ہوئی تھی نبیل سویا ہوا تھا اور پروین اس کی منجی کے بالکل پاس کھڑی اسے ہاتھ سے پنکھا جھل رہی تھی۔ اس کے بدن کی مسحور کن خوشبو نبیل کے دل میں محبتوں کے مہکتے گلاب کھلا رہی تھی۔

نبیل اب سوتے جاگتے ایسے ہی خواب دیکھا کرتا تھا۔ وہ بہت کوشش کرتا کہ ان خوابوں سے چھٹکارا حاصل کر لے مگر یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ خوابوں، خیالوں پر انسان کا اختیار بھلا کب ہوا ہے۔ یہ تو آپو آپ آتے ہیں۔ بغیر پوچھے بغیر اجازت لئے۔ بغیر دستک دیئے۔ نبیل اپنے خیالات کو دیگر مصروفیات میں الجھانے کی کوشش کرتا، اپنے ذہن کو نئی نہج پہ ڈالنے کی کوشش کرتا۔ مگر وہ دل ہی کیا جو مان جائے۔ نبیل اپنے دل کو سو توجیہیں، سو تاویلیں پیش کرتا مگر سب بے سود سب بے کار وہ دن بدن اس بھنور میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ کئی دفعہ رومی اس بات کی اشارتاً ناراضگی ظاہر کرتی۔ نبیل ایک دو دن خود سے لڑ کر اس پر قابو پاتا مگر پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا۔

سوچوں اور یادوں کا سلسلہ ایک دفعہ سے پھر شروع ہو جاتا۔

بیس پچیس دن گزار کر جب سب لوگ گھر پہنچے تو ان کا خوب استقبال ہوا۔ استقبال کرنے والوں میں سیٹھ افضل، نغمانہ بیگم، انوری بیگم اور عینی شامل تھے۔ ٹونی تو سفر کی روئیداد سناتے تھکتا نہیں تھا۔ اس نے اول تا آخر سارا سفر نامہ قسطوں میں باری باری سب کو سنا دیا تھا۔ رومی اور نبیل کو

ایسے خوش دیکھ کر سیٹھ افضل کی آنکھوں کی چمک کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ وہ دل ہی دل میں رب کا بے حد شکر ادا کر رہے تھے۔ ان کی دونوں بیٹیوں کے گھر بس گئے تھے۔ گھر میں ایک دفعہ پھر سے رونق لگ گئی تھی۔ سب سے زیادہ انوری بیگم خوش تھی۔ وہ دونوں بیٹوں اور بیٹیوں کو دیکھ کر واری واری جاتی تھی۔ اپنے گھر جاتے ہی نبیل ماں کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس وقت کمرے میں انوری بیگم اور نبیل کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔

''ماں! میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں۔'' وہ انوری بیگم کے زانو پہ سر رکھ کر بولا۔

''کس بات کی شکر گزاری کی جا رہی ہے۔'' انوری بیگم لاڈ سے بولی۔

''آپ نے جو میری رہنمائی کی...........''

''کیسی رہنمائی...........'' وہ نبیل کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

''شادی کے بارے میں، واقعی ماں باپ سے زیادہ کوئی اولاد کا ہمدرد نہیں ہوتا، خیر خواہ نہیں ہوتا۔ وہ ماں کے ہاتھ پہ بوسہ دے کر بولا۔

''روبی تیرے ساتھ خوش ہے ناں...........؟'' انوری بیگم کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

''ہاں ماں خوش ہے بہت خوش ہے۔ بلکہ........... بلکہ میں اس کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ اتنی اچھی بہو لانے پر میں آپ کو سلیوٹ کرتا ہوں۔'' لیٹے لیٹے ہی نبیل نے ہاتھ اٹھا کر سلیوٹ کیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا اس کا ہاتھ ماتھے پہ ہی اٹک کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں یکدم اداسی اتر گئی۔ چمکتے منظر میں ایک حسین نازنین تھی جو دور کھیتوں سے پرے چلی جا رہی تھی اس نے مڑ کر نبیل کی طرف دیکھا تھا یہ منظر نبیل کو بہت خوبصورت بہت ہی پیارا لگا تھا۔ اتنی دور سے بھی اس کا چہرہ کندن کی طرح دمکتا نظر آ رہا تھا۔ بالکل چاند کی طرح روشن اور چاندنی بکھیرتا...........''

''نبیل! کیا ہوا کدھر کھو گئے۔'' انوری بیگم اس کا چہرہ اپنی طرف کر کے بولی۔

''کہیں نہیں.......... کہیں بھی نہیں۔'' نبیل شرمندہ سا ہو کر نفی میں سر ہلانے لگا۔ وہ یکدم اٹھا، آنکھیں پھیلا کر امڈتے ہوئے آنسوؤں کو آنکھوں کے اندر ہی دفن کیا اور مسکرا کر بولا۔

''مام! میں آپ کے لئے بہت ہی پیارا گفٹ لایا ہوں۔''

''اچھا!'' انوری بیگم نے مسکرا کر کہا۔

''ہاں مام! ایک آپ ہی آپ تو ہیں جن کے دم سے ہم چلتے پھرتے ہیں۔''

تشکر کے آنسو ایک دم سے انوری بیگم کی آنکھوں میں کہیں سے پھوٹے تھے اور اسے نہال کر گئے تھے۔ زندگی ایک دفعہ پھر سے رواں دواں ہو گئی تھی۔ جاب اور گھر کی مصروفیات کے دو پاٹوں میں زندگی پستی رہی۔ دین کی طرف نبیل کا رجحان دن بدن بڑھ رہا تھا۔ گاؤں سے آیا ہوا پہلا خط پڑھنے سے تو نبیل قاصر رہا تھا۔ مگر جب دوسرا خط گاؤں سے آیا تو اس نے نبیل کی زندگی میں ایک دم سے ہلچل مچا دی۔ خط پھوپھو کی طرف سے تھا۔ اس میں گاؤں آنے کے بارے میں لکھا ہوا تھا۔ نبیل کے بچپن کی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ نبیل کے والد حسنے کا ذکر تھا۔ خط پڑھنے کے بعد نبیل نے فوراً جوابی خط لکھا اور یہ بتایا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ ضرور گاؤں کا چکر لگائے گا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ یہ خط پڑھنے والوں کے لئے کتنا دھماکا خیز ثابت ہوا ہے اور یہ خط پروین کے لئے تو قیامت کا پیغام ہی لے کر آیا تھا۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد پروین دو دن تک مسلسل روتی رہی تھی۔ اس دوران نہ اس نے کھانا کھایا نہ کسی سے بات کی۔ پھر ایک ہفتہ وہ بخار میں پھنکتی رہی۔ کڑھتی رہی اپنے من کو جلاتی رہی۔ گذرے وقت گذری باتوں کو یاد کر کے روتی رہی۔ اس کا رونا دھونا ایک دو دن یا ایک دو سالوں کا نہیں تھا۔ وہ نازک لڑکی تھی مگر پیار نے اسے بہادر اور سخت جان بنا دیا تھا۔ اس نے قدرت کے فیصلے کو قبول کر لیا تھا۔ اس کی محبت مشروط نہیں تھی۔ اس نے صرف پیار کیا تھا اور پیار کبھی مشروط نہیں ہوتا اور اگر مشروط ہو تو وہ پیار نہیں ہوتا۔ خود سے دھوکا ہوتا ہے۔ فریب ہوتا ہے۔ خود پسندی ہوتی ہے۔ پروین کی زندگی کی اب سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ جیتے جی نبیل کو دیکھ لے۔ اس کی دید کے پانی سے آنکھوں کی پیاس بجھا لے۔

وہ اپنے حصے کا پیار کر چکی تھی۔ اس نے اپنے دل میں شادی نہ کرنے کا عہد کر لیا تھا۔ تین چار دن کی رفاقت نے اس کی زندگی ہی بدل کے رکھ دی تھی۔ وہ حسین منظر ابھی بھی پروین کی نظروں کے سامنے تھا۔ وہی پہلا منظر پہلی نظر جب وہ انجانے میں باورچی خانے میں داخل ہوئی تھی اور سامنے نبیل بیٹھا چکی گھما رہا تھا۔ نظروں کی ہلکی سی گستاخی کی اتنی بڑی سزا ملی تھی پروین کو۔ نبیل کو وہاں نہیں بیٹھا ہونا چاہئے تھا اور اگر بیٹھا بھی تھا تو اسے بھولپن اور قدرے گھبراہٹ سے پروین کو جواب نہیں دینا چاہئے تھا کہ پھوپھو دوسرے کمرے میں گندم لینے گئی ہیں۔ اس ایک جملے نے پروین کی کلیوں سی مسکراہٹ چھین لی تھی۔ وہ مسلسل انتظار کے کرب میں جل رہی تھی۔ پروین کو شادی کی خبر جب خط کے ذریعے ملی تو اس کا انتظار ختم نہیں ہو گیا بلکہ اور زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ وہ نبیل کو اپنے روبرو دیکھنا چاہتی تھی۔

ادھر انگلینڈ میں زندگی اپنی روٹین سے بھاگی جا رہی تھی۔ روبی نبیل کے لئے بظاہر اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی ایک دو باتوں کے علاوہ اس کی دوسری عادتیں نبیل کو بہت اچھی لگتی تھیں۔ بری عادتوں میں ایک کبھی کبھار وہ اپنا چڑچڑا پن ثابت کرتی تھی۔ غصے کے عالم میں تھوڑی دیر اونچی

آواز میں بولتی تھی مگر فوراً بعد میں معافی بھی مانگ لیتی تھی۔ نبیل نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ رومی بری بات سے چڑ جاتی ہے اونچی بول کر اپنا سارا غصہ نکال لیتی ہے۔ پھر ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ ایسے بندے کے دل میں کچھ نہیں ہوتا۔ اس کا دل آئینے کی طرح شفاء ہوتا ہے۔ غصے کی ہلکی سی گرد اسے دھندلا دیتی ہے پھر ندامت کا شفاف پانی اسے دوبارہ چمکا دیتا ہے اور دوسری بری بات یہ تھی کہ وہ ابھی بچے کے حق میں نہیں تھی۔ انوری بیگم کی طرف سے اصرار بڑھ رہا تھا وہ بیٹے کو کہتی تھی اور نبیل پھر اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا تھا مگر وہ ہر بار یہ کہہ کر بات ٹال دیتی کہ تھوڑا عرصہ اور ٹھہر جائیں۔ انسان کے ارادے انسان کے منصوبے اپنی جگہ مگر ایک ذات اور بھی ہے جو سب سے بڑی منصوبہ ساز اور کارساز ہے۔ ایک نئے وجود کا فیصلہ اوپر ہو چکا تھا اور اب تو اس میں جان بھی پڑنے والی تھی۔ کتنی حیرت کی بات تھی کہ ہر کوئی اس بات سے لاعلم تھا اور وہ بھی جس کے وجود میں ننھی روح پل رہی تھی۔ ایسی سینکڑوں مثالیں میڈیکل سائنس میں ملتی ہیں۔

ایک دن اتوار کی چھٹی کی وجہ سے نبیل گھر پر ہی تھا۔ باقی سب لوگ گھومنے گئے ہوئے تھے۔ نبیل کو گھر رہ کر دفتر کا کوئی کام نمٹانا تھا۔ وہ اسٹڈی روم میں کمپیوٹر اور پرنٹر پر جھکا اپنا کام کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ نبیل نے دستک دینے والے کو اندر آنے کی اجازت دی تو وہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ سیٹھ افضل اس کے ماموں تھے۔ ''ماموں آپ! بیٹھیے ناں۔'' وہ سلام کرنے کے بعد جلدی سے کرسی کھینچ کر بولا۔ آج سے پہلے کبھی سیٹھ افضل اس طرح ان کے گھر نہیں آئے تھے۔ جسے بھی ملنا ہوتا تھا وہ ان کے پاس ہی جاتا تھا۔

''ماموں! خیریت ہے ناں۔'' نبیل فکرمندی سے بولا۔

''ہاں.........ہاں بیٹے.........بیٹھو.........تم بیٹھو۔'' وہ ہاتھ سے اشارہ کر کے بولے۔

نبیل جہاں تھا وہیں پر بیٹھ گیا۔ ''ہاں بیٹے! تمہارا کام کیسا چل رہا ہے؟''

سیٹھ افضل نے سوال کیا تو نبیل کو احساس ہو گیا کہ ماموں کوئی اور بات کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سوال بس یونہی کر رہے ہیں۔ ''ماموں! بالکل ٹھیک چل رہا ہے۔'' نبیل خوشدلی سے بولا جب کہ اس کا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔

سیٹھ افضل چند لمحے خاموش رہے اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ نبیل ماموں کے چہرے کی پریشانی پڑھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ نبیل کوئی سوال کرتا سیٹھ افضل بول پڑے۔ ''بیٹے! تم تو جانتے ہی ہو کہ میں نے تم لوگوں کو ہمیشہ اپنی اولاد کی طرح ہی چاہا ہے۔''

''جج۔ جی ہاں ماموں جان! اس میں شک والی کون سی بات ہے۔''

''میری ہمیشہ سے خواہش رہی کہ میری دونوں بیٹیوں کی شادیاں تم دونوں بھائیوں کے ساتھ ہو جائیں۔ خدا نے میری وہ خواہش پوری کر دی۔ شکیل اور سومی کی طرف سے تو میں بہت مطمئن ہوں۔'' نبیل کا دل یکبارگی بہت زور سے دھڑکا۔

''رومی کا فکر مجھے ہر وقت لگا رہتا ہے۔''

نبیل کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ ''ماموں! کیا کوئی بات ہوئی ہے۔'' نبیل ڈر گیا کہ کہیں خیالوں میں کھوئے رہنے والی چوری تو نہیں پکڑی گئی مگر اگلے ہی لمحے اس کا شک دور ہو گیا۔

''بیٹا! ایک بات میں تم سے بہت عرصے سے کرنا چاہ رہا تھا مگر نہیں کر پا رہا تھا آج موقع ملا تو دل چاہتا ہے تم سے کر ہی لوں۔''

''جی بولئے ماموں جان۔''

''بیٹا! تم خدا کو حاضر ناظر جان کر بتاؤ کہ رومی تمہارے ساتھ ٹھیک رہتی ہے ناں۔''

''ماموں! آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ رومی جیسی سمجھدار بیوی خوش قسمت شوہروں کو ملتی ہے۔''

''میرا مطلب ہے کہ کسی قسم کا تنگ تو نہیں کرتی ناں تمہیں؟''

ایک بار نبیل کا خیال رومی کے بوائے فرینڈ سمتھ کی طرف گیا مگر فوراً نبیل نے سب کچھ ذہن سے جھٹک دیا۔ ''ماموں! رومی کا شوہر ہونے پر مجھے فخر ہے۔''

سیٹھ افضل نے اٹھ کر نبیل کو گلے لگالیا۔ ''میرے بیٹے! میں تمہارے منہ سے یہی سننا چاہتا تھا۔ اب میں آسانی سے مرسکوں گا۔''

''پلیز ماموں! ایسی بات تو نہ کریں۔ خدا آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔''

سیٹھ افضل تھوڑی دیر اور بیٹھنے کے بعد وہاں سے رخصت ہوگئے۔ نبیل پھر سے اپنے کام میں منہمک ہوگیا۔ گاؤں اور پروین کی سوچوں کا سلسلہ ابھی تک رکا نہیں تھا۔ وہ خود سے جنگ کر کر کے ہار چکا تھا۔ زندگی اسی طرح اپنی مخصوص روٹین میں چلی جارہی تھی کہ ایک دن ایک عجیب واقعہ ہوا۔ نبیل اور رومی شاپنگ کرنے بازار گئے ہوئے تھے۔ رات کافی گذر چکی تھی وہ گاڑی میں گھر کی طرف رخ کرنے لگے کہ اچانک رومی نے نبیل کو گاڑی ایک نائٹ کلب کے سامنے روکنے کے لئے کہا۔ پہلے تو نبیل کچھ نہ سمجھا جب رومی گاڑی سے نیچے اتری اور یہ کہتی ہوئی کلب میں گھس گئی کہ گاڑی پارک کر کے اندر آجائیں تو نبیل حیران و پریشان رہ گیا۔

اب تیر کمان سے نکل چکا تھا رومی کلب کے اندر جاچکی تھی۔

رومی کو لینے کے لئے نبیل کو بھی اندر جانا پڑنا تھا۔ جب سے سیٹھ افضل نے نبیل سے بات چیت کی تھی۔ اس دن سے نبیل رومی کا بہت خیال کرنے لگ گیا تھا وہ رومی کو ناراض کر کے ماموں کو شاک نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔

وہ گاڑی پارک کر کے تیزی سے کلب میں داخل ہوا۔ نیم اندھیرے میں ہر طرف دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ جوان جسم میوزک پر تھرتھرا رہے تھے۔ بیہودگی کا طوفان بدتمیزی تھا جو وہاں برپا تھا۔ نبیل دامن بچاتا بہت مشکل سے رومی تک پہنچا۔ رومی ایک طرف کھڑی تالیاں پیٹ رہی تھی۔ نبیل کا خون کھول اٹھا ''یہ کیا بدتمیزی ہے۔'' نبیل اس کے پاس پہنچ کر دھاڑا۔

''کیا ہے بھئی! میرا دل چاہ رہا تھا میں یہاں چلی آئی۔''

''بھئی جانے کے لئے اور بھی بہت اچھی اچھی جگہ ہے۔'' نبیل خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''مگر میرا دل یہاں آنے کو کر رہا تھا۔ دیکھو کیسا رومانٹک ماحول ہے۔ پیار کرنے والے کیسے بانہوں میں بانہیں ڈالے ڈانس کر رہے ہیں۔ آؤ ہم بھی پارٹی سپیٹ کریں۔'' رومی نبیل کا بازو کھینچ کر بولی۔

نبیل کو رومی کے ایسے رویے پر حیرانگی ہو رہی تھی۔ ایک دم سے اسے کیا ہوگیا تھا۔ پھر دل میں سوچ آئی شادی سے پہلے دونوں ہی ایسی جگہوں پہ جاتے رہے ہیں چاہے الگ الگ ہی جاتے رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے رومی کے دل میں پرانی یادیں تازہ کرنے کا خیال آیا ہو۔ اس نے سوچا۔ ''مگر بہت بے ہودہ خیال آیا ہے۔'' اس نے پہلی بات کی تردید کی۔

''رومی چلو ہمیں ادھر سے چلنا ہے۔'' نبیل آہستگی سے کان کے قریب بولا۔

''نہیں نبیل! میں ڈانس کیے بنا یہاں سے نہیں جاؤں گی اور اگر تم مجھے لے جانا چاہو گے تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔''

نبیل نے موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے ہتھیار پھینک دیئے اور طوفان بدتمیزی میں وہ بھی شامل ہوگیا۔ رومی بڑی خوش دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ اچھل کود کر رہی تھی۔ نبیل کے لئے یہ سب بہت تکلیف دہ تھا۔ وہ صبر کے گھونٹ پی کر چپ تھا۔

واپسی پہ گاڑی کے اندر سارا راستہ پھر ان کے درمیان لڑائی ہوتی رہی۔ پہلے رومی زبان چلانے کے بعد میں معافی مانگ لیا کرتی تھی۔ آج وہ ضرورت سے زیادہ خود سر ہوگئی تھی۔

وہ گھر جا کر غصے کے عالم میں ہی گاڑی سے باہر نکلی اور اسی طرح اپنے کمرے میں جا کر زور سے دروازہ بند کیا۔ نبیل کے لئے رومی میں یہ تبدیلی بہت حیران کن تھی۔ وہ بھی خاموشی سے جا کر اندر لیٹ گیا۔ کتنی دیر بوجھل خاموشی طاری رہی۔ پھر رومی نے ہی پہل کی، جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہو۔

''نبیل! مجھ سے ناراض ہوناں..........؟'' رومی کی بات کا نبیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''دیکھو میں اس ماحول سے تنگ آ گئی ہوں۔ میں زندگی میں کچھ چینج چاہتی ہوں۔''

''کیا چینج چاہتی ہو تم..........؟'' نبیل غصے سے بولا تو رومی نے فوراً آنکھوں میں آنسو بھر لئے۔

رومی کی طرف دیکھ کر نبیل کا دل نرم پڑ گیا۔ ''دیکھ رومی! میرا مطلب یہ نہیں تھا میں..........''

''اور کیا مطلب تھا تمہارا۔'' رومی بات کاٹ کر بولی۔ ''تنگ آ گئی ہوں میں اس گھٹن والی زندگی سے۔ سینکڑوں دوست ہیں میرے جو میں نے صرف تمہاری وجہ سے چھوڑ دیئے ہیں۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔''

نبیل ہکا بکا رومی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ وہ یہ کیا بکواس کیے چلی جا رہی تھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے رومی کسی غیبی طاقت کے زیر اثر بول رہی ہے۔

''رومی! یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔'' نبیل اونچی آواز میں بولا۔

''ہاں دماغ چل گیا ہے میرا...... پاگل ہوگئی ہوں میں.......... اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو پاگل ہو جاؤں گی میں.....'' وہ سسکیاں بھرنے لگی تھی۔ نبیل نے اسے خود سے لگا لیا تھا۔

''پلیز نبیل.......... پلیز مجھے معاف کر دو۔ مجھے پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے۔ مجھے خود بھی علم نہیں۔ میں منزل کا انتظار کر کے تھک گئی ہوں۔''

''کیسی منزل؟'' نبیل نے سوالیہ انداز میں رومی کی طرف دیکھا۔

''ہے............ ہے ایک منزل..........'' اس نے خود کلامی کی۔

اس واقعے کے بعد نبیل اپنے اندر بہت بڑی تبدیلی لے آیا تھا۔ وہ دن رات رومی کی دل جوئی میں لگ گیا تھا۔ وہ جدھر کہتی وہ اس کے ساتھ جاتا۔ نائٹ کلب بیچ، پارک، گواس نے ایک سمجھوتا سا کرلیا تھا۔ وہ رومی کو ٹھیک دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے خیال میں رومی کی ایسی دماغی حالت اس کی لاپرواہی کی وجہ سے ہوتی تھی۔ اسے اپنی کوتاہیوں کا مداوا کرنا تھا۔ اسی لئے وہ اس رستے پر چلنے کے لئے مجبور ہوا تھا۔ جو رستہ اسے کسی صورت گوارہ نہیں تھا۔

☆............☆............☆

شوکا بڑی تیزی سے پروین کے قریب آیا تھا۔ گوگے کی شادی میں اسے کھل کھیلنے کا موقع ملا تھا۔ شادی والے گھر ہر طرف رش ونفسانفسی تھی۔ پروین نے شادی والے دن سرخ گوٹے والا سوٹ پہنا تھا۔ وہ خوبصورت سی ایک گڑیا لگتی تھی۔ ہر دیکھنے والا مبہوت رہ جاتا تھا۔ آسیہ کے گھر کے صحن میں ''سروحلوائی'' رنگ برنگی مٹھائیاں نکال رہا تھا۔ سارے گھر میں مخصوص سی خوشبو رچی ہوئی تھی جو عام طور پر شادی والے گھروں سے آتی ہے۔ بچے رنگ برنگے اور شوخ کپڑے پہنے ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے۔ شوکے اور پروین کا کئی دفعہ آمنا سامنا ہوا تھا اور پروین نظریں جھکا کر رہ گئی تھی۔ اس وقت شوکا سٹور میں کسی کام سے داخل ہوا تھا۔ پروین جستی صندوق سے کپڑے نکال رہی تھی۔ پروین کو اکیلا دیکھ کر شوکا بولا ''پروین! ایک بات کہوں۔''

''پروین کا جواب نہ پا کر بولا ''تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔'' پروین نے نظریں جھکا لیں۔ ''پروین! میں کبھی سوچ نہیں سکتا تھا کہ ایسا ہو جائے گا.......... میں تم سے پیار کرنے لگ جاؤں گا۔'' شوکے کی بات سن کر پتا نہیں اتنا پانی اس کی آنکھوں میں کہاں سے امڈ آیا تھا۔ وہ آگے سے کچھ بھی تو نہیں بول سکتی تھی۔ وہ بول سکتی بھی نہیں تھی۔ سب کو وہ خوبصورت دکھ رہی تھی گڑیا کی طرح دکھ رہی تھی۔ ہر کوئی اس کے چہرے کی چمک پر جا رہا تھا مگر اس کے اندر کے سناٹے کو کوئی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے اندر کے اندھیروں کی طرف کسی کا دھیان نہیں جا رہا تھا۔ وہ چلتی پھرتی ایک لاش تھی۔ جذبات اور احساسات سے عاری ایک لاش۔ جب سے نبیل کا خط اس نے پڑھا تھا۔ وہ یونہی کھوئی کھوئی پھرتی تھی۔ نبیل کی شادی ماموں کی لڑکی کے ساتھ ہو چکی تھی۔ اس نے سب کچھ سن لیا تھا۔ سمجھ لیا تھا اور سب کچھ سہہ بھی لیا تھا۔ مگر وہ اب بھی شاید کسی معجزے کی منتظر تھی۔ وہ اب بھی کسی کی راہیں دیکھ رہی تھی۔ شاید ان سونے راستوں کو کوئی آباد کرنے آئے گا۔ پروین کو کسی مسیحا کا انتظار تھا۔ اس نے قدرت کے فیصلے پہ صبر شکر کرلیا تھا۔ مگر دید کی تڑپ پروین کو تڑپا رہی تھی۔ وہ اپنے نبیل کو اپنے روبرو دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ کسی اور کا ہے مگر اس کی دید کی تڑپ وہ اپنے اندر سے کھرچ نہیں سکتی تھی۔

انگلینڈ سے خط آ بھی رہے تھے۔ یہاں سے پروین خط لکھ بھی رہی تھی۔ گاؤں سے خط نبیل کے آفس کے پتے پر جاتے تھے۔ اس لئے

رومی کی پہنچ سے دور تھے۔ ان خطوں کا مقصد نبیل کو یہ باور کروانا ہوتا تھا کہ اسے اپنا وعدہ نبھانا ہے۔ اسے گاؤں آنا ہے۔ پروین نبیل سے اتنی شدید محبت کرتی تھی مگر آج تک اس کا اظہار نہ کر سکی تھی۔ اس میں اتنی ہمت ہی نہ تھی کہ وہ اظہار کرے۔ لاشعوری طور پہ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ صنف مخالف کا اظہار کرنا اچھا لگتا ہے۔ وہ لڑکی ہو کر اظہار نہیں کر سکتی تھی مشرقی عورت ہزار اقرار سینے میں چھپا لیتی ہے مگر زبان پر نہیں لاتی۔ پھر............ انتظار انتظار اور بس انتظار اس کا مقدر ٹھہرتا ہے۔ پروین بھی انتظار کر رہی تھی' وفا کا بھرم رکھ رہی تھی۔ وہ اکثر مائی سیداں کے پاس چلی جاتی تھی۔ کئی کئی گھنٹے اس کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔ اپنے دکھ سکھ پھولنے کے لئے ایک ہی سہارا تھا پروین کے پاس، جس کا نام مائی سیداں تھا۔ وہ مائی سیداں سے قصے کہانیاں سنتی رہتی اور پھر ان کہانیوں کو رات رات بھر بیٹھ کر سوچتی رہتی۔

☆............☆............☆

نبیل بری طرح پھنس چکا تھا۔ اس سے زندگی کی بہت بڑی بھول ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا تھا وہ ماں کے کہنے پر رومی سے شادی کر لے گا تو اپنا ماضی بھول جائے گا۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ مگر کچھ بھی تو ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ پروین کی یاد اس کی زندگی کا روگ بن گئی تھی۔ پہلے پہل تو ہلکا پھلکا اثر رہا تھا۔ اب یہ حال ہو گیا تھا کہ کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا تھا جس میں پروین کی یاد اسے نہ ستاتی ہو۔ وہ بیٹھے بٹھائے گہری سوچ میں غرق ہو جاتا تھا۔ وہ رومی کے کہنے پہ ہر جگہ آنے جانے لگا تھا لیکن رومی کو اب نبیل کے بیٹھے بٹھائے کھو جانے والی عادت سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ وہ اکثر اس سے جھگڑ پڑتی تھی۔ ''نبیل! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تمہارے ساتھ کیا پریشانی ہے، مجھے یوں لگتا ہے کہ تم میرے پاس ہوتے ہوئے بھی میرے نہیں ہوتے۔''

''نن............نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں؟'' وہ اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے کہتا۔

''نبیل! میں بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ ہم کسی کلب میں جائیں کسی پارٹی میں جائیں تو تم ایک دم سے کہیں کھو جاتے ہو۔ تم سے میں پوچھوں کچھ، تم جواب اور کچھ دیتے ہو۔ نبیل! مجھے تم سیدھی طرح سے بتا دو............ تمہارے دل میں کچھ ہے تو نہیں............ تم کسی سے پیار تو نہیں کرتے؟''

''میں............ میں بھلا تمہارے علاوہ کس سے پیار کروں گا۔'' نبیل کہتا۔

''گاؤں والی لڑکی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔'' ایک دن وہ بڑے طنز سے بولی۔

''کون سی گاؤں والی لڑکی؟''

''تمہاری پھوپھو کی بیٹی...... وہ گاؤں جہاں تم تین چار دن روپوش رہے تھے...... سنا ہے گاؤں کے لوگ بڑے تیز طرار ہوتے ہیں۔ منٹوں میں بندے کو پھانس لیتے ہیں۔''

''اٹ از ٹو مچ رومی۔'' نبیل چیخا۔

''حقیقت کا چہرہ دکھایا تو بھڑک اٹھے.........نبیل ڈر و اس وقت سے جب میں نے اپنا آپ دکھایا۔''

''رومی! میری سمجھ میں نہیں آتا تمہیں آج کل کیا ہو گیا ہے۔ تم وہ پہلے والی رومی نہیں رہی ہو۔ تم گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ ہوتی ہو۔''

''ہاں میں پہلے والی رومی نہیں رہی ہوں۔ یہ سب تمہاری لاپرواہی کی وجہ سے ہوا ہے۔''

''میری لاپرواہی کی وجہ سے۔'' نبیل چیخا ''میں جو ہاتھ جوڑ کر تمہارا غلام بنا ہوا ہوں۔ جدھر تم کہتی ہو ادھر چل پڑتا ہوں۔ تمہاری ہر خوشی ہر خواہش کا خیال رکھتا ہوں۔ یہ ہے میری لاپرواہی؟''

''جو تمہارا دھیان ہی میری طرف نہیں ہوتا۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ دھیان تو ادھر رہتا ہے جدھر دل لگا ہوا ہے۔ اس چڑیل پھوپھی کی بیٹی نے تمہارے اوپر جادو کر دیا ہوگا۔''

ایک زناٹے کا تھپڑ رومی کی گال پر پڑا اور وہ ہکا بکا رہ گئی۔ نبیل پیر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔ اس دن اس نے بہت سوچا تھا کہ حقیقت حال ماموں کو بتا دے۔ پھر یہ خیال بھی دل میں آیا کہ رومی بھی الزامات کی بارش اس پر کر دے گی۔ اس لئے نبیل خاموش رہا۔ یہ اس واقعے کے ٹھیک چار دن بعد کی بات ہے جب رومی نبیل کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس اپنا ماہانہ چیک اپ کروانے گئی ہوئی تھی۔ ایک خبر نے اسے جیسے ہوش وحواس سے بے گانہ کر دیا تھا۔ وہ بچے کی ماں بننے والی تھی۔ نبیل تو جیسے خبر سن کر دیوانہ ہی ہو گیا تھا۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اس نے دل ہی دل میں خدا کا بے حد شکر ادا کیا۔ یہ قدرت کی طرف سے اس کے لئے سرپرائز تھا۔ ڈلیوری میں ساڑھے تین چار ماہ تھے۔ نبیل رومی کو بڑی احتیاط سے گاڑی میں بٹھا کر گھر تک لایا خبر سن کر ساروں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے تھے۔

انوری بیگم تو باقاعدہ آنسوؤں سے رونے لگی تھی۔ ''یا اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔'' وہ کبھی رومی کا منہ چومتی تھی کبھی نبیل کا۔ رومی سب کے درمیان یوں بیٹھی تھی جیسے کاٹو تو لہو نہیں۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا کسی بھی جذبے یا تاثر سے عاری۔ رات جب زیادہ بیت چکی تو سب اپنی اپنی خوابگاہوں کی طرف ہو لئے۔ نبیل جب لائٹ بند کر کے رومی کے پاس لیٹنے لگا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے نبیل کے سینے پہ زور سے دھکا دیا۔

''خواہش پوری ہو گئی تمہاری.........کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا تمہارا، تم بچے کی خواہش لئے بیٹھے ہو نا میں تمہاری یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہونے دوں گی۔''

''رومی! تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔'' نبیل غصے سے بولا۔

''ہاں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ میں بچہ ضائع کروا دوں گی۔ نہیں چاہئے مجھے بچہ۔''

''رومی! تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے تم نے.........بہت ہو چکا، بہت بکواس سن لی میں نے آج تک تمہاری، اب مجھ سے برداشت نہیں ہوگا سمجھیں تم.........اگر میرے بچے کو کچھ ہوا تو میں تمہیں ساری زندگی معاف نہیں کروں گا۔''

رومی زور زور سے بیڈ کے ساتھ سر ٹکرانے لگی۔ ''مار ڈالو۔ مجھے مار ڈالو۔ میرے باپ نے بھی یہی کیا ہے، مجھے جانتے بوجھتے دوزخ میں جھونک دیا ہے۔ مجھے جیتے جی مار دیا ہے۔''

نبیل نے آگے سے کوئی جواب نہیں دیا۔ کئی باتوں پہ خاموشی ہی سب سے بڑا جواب ہوتی ہے۔ آنے والے دنوں میں نبیل نے ایک طرح سے اس سے قطع کلامی کرلی تھی۔ ضرورت کی بات پر نبیل اس سے بولتا تھا اس کے علاوہ خاموش رہتا تھا۔

چار ماہ بعد رومی ایک خوبصورت سے بچے کی ماں بن گئی۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ نبیل اکثر خاموش ہی رہتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے رومی کا دماغ کچھ ٹھیک ہی تھا۔ نبیل روٹین سے گاؤں خط لکھ رہا تھا اور پل پل کی کہانی پھوپھو کو سنا رہا تھا۔ پروین اڑنے والی خوبصورت تتلی تھی جس کے پر کسی نے مسل دیئے تھے، وہ لڑکھڑاتی، آٹھ آٹھ آنسو بہاتی نبیل نے کہا تھا کہ وہ فصل تیار ہونے تک آئے گا۔ مگر فصل تیار ہو کر کٹ بھی چکی تھی مگر وہ نہ آیا۔ سردیاں بیت گئیں پھر کھلا موسم آیا اور بیت گیا۔ مگر وہ نہیں آیا اس کے چہرے کا دیدار نہیں ہوسکا۔ پھر میلہ بھی آکر گذر گیا مگر سونے راستے آباد نہ ہوئے۔ وہ انتظار کرتی رہی......اور کرتی رہی۔

پھر ایک دن نبیل کے بیٹے کی خوشخبری خط کے ذریعے ملی تو ماں بیٹی گلے لگ کر خوب روئیں۔ وہ خوشی کے آنسو تھے۔ وہ تشکر کے آنسو تھے۔ نبیل بچے کا باپ بن گیا تھا۔ ایک طرف بے حد خوشی تھی تو دوسری طرف دکھ کی شدید لہر پروین کے کلیجے کو چیر گئی تھی۔ پتا نہیں ایسا کیوں ہوا تھا۔

☆..........☆..........☆

نبیل نے بیٹے کا نام حسن رکھا تھا۔ بیٹے کی پیدائش پر نبیل کو خوش ہونا چاہئے تھا۔ مگر وہ اندر سے ٹوٹ چکا تھا۔ رومی کی من مانیاں زوروں پر تھیں۔ بیٹے کی پیدائش کے بعد نبیل نے رومی کو کلبوں میں لے جانا بند کر دیا تھا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ رومی نے اکیلے ہی جانا شروع کر دیا۔ وہ یہ سب دیکھ کر دن رات کڑھتا مگر کسی سے بات نہیں کرتا۔ اپنے اندر مختلف محاذوں پہ جنگ لڑلڑ کر نبیل نڈھال ہو چکا تھا۔ وہ سخت ذہنی اذیت میں مبتلا تھا۔

ایک طرف خود سر رومی تھی ایک طرف پھول سا پیارا بیٹا حسن تھا اور ایک طرف پروین کی یادیں تھیں۔ جن سے پیچھا چھڑانا اس کے لئے ناممکن ہو چکا تھا۔ وہ انہونے عذاب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ حالات نے اسے توڑ پھوڑ دیا۔ اس نے پہلے سگریٹ شروع کی پھر آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے ابتر حالات میں شراب نوشی بھی شروع کر دی۔ ہاں وہ پھر سے شراب پینے لگ گیا تھا۔ اس کی مذہبیت نجانے کیسے ایکدم کہیں دور پس منظر میں چلی گئی تھی۔ پہلے وہ شوق سے پیتا تھا اب خود کو جلانا چاہتا تھا۔ سب کچھ بھلانا چاہتا تھا۔ وہ دن رات اس نشے میں ڈوبتا چلا گیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی صحت دن بدن کمزور ہونے لگی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے۔ کپڑے بے ترتیب اور بال پراگندہ رہنے لگے۔ وہی نبیل جو نفاست کی وجہ سے مشہور تھا۔ اب عجیب حالت میں پھرتا تھا۔ اس تبدیلی کی سب سے پہلے فکر انوری بیگم کو ہوئی۔ آخر وہ ماں تھی۔

"نبیل بیٹا! یہ تو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ میں نے کئی دفعہ سوچا تجھ سے بات کروں مگر پھر میں رومی کی وجہ سے خاموش ہو گئی کہ وہ غلط نہ سمجھ بیٹھے۔ بیٹے تُو ٹھیک تو ہے ناں۔"

نبیل کے سینے میں ٹیس سی اٹھی اور اس کا دل چاہا ماں سے کہہ دے کہ "ماں! تو نے جس جہنم میں مجھے دھکیلا ہے وہاں میں بہت خوش ہوں.........بہت خوش۔" مگر دل کی بات زبان پر نہ آسکی اور وہ بہت آہستہ سے بولا۔ "ماں! میں بالکل ٹھیک ہوں..........بالکل.........."

''نہیں بیٹے! ادھر میری طرف دیکھ تو جھوٹ بول رہا ہے۔ تو مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔''

''نہیں ماں! میں بھلا تجھ سے کیا چھپاؤں گا۔'' نبیل آنکھیں میچ کے بولا۔

''رومی! کہاں جاب کرنے جاتی ہے؟''

''کسی آفس میں جاتی ہے۔''

''میرے بیٹے............تو............تو اس سے خوش تو ہے ناں............ تیری مرضی سے اس نے جاب کی ہے ناں۔'' انوری بیگم پریشانی سے بولی۔

''ہاں ماں! میری مرضی سے کی ہے............ اور............ اور میں اس سے خوش بھی بہت ہوں۔'' کئی آنسو جیسے نبیل کے حلق میں گرے۔ وہ کہیں جاب نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اپنی سہیلیوں اور یاروں کے ساتھ گھومتی موج میلہ کرتی رہتی تھی۔ اس نے حسن کی پیدائش سے پہلے نبیل سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ کبھی اسے کسی چیز سے منع نہیں کرے گا۔ اس کے بدلے میں وہ بچہ ضائع نہ کرانے پر رضامند ہوئی تھی۔ یہی بات سب سے زیادہ نبیل کو دکھ دیتی تھی۔ وہ شادی سے لے کر اب تک اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلتی آئی تھی۔ نبیل نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ پل میں تولہ پل میں ماشہ ہوتی تھی اور جب بچے کی زندگی کے بدلے اس نے اپنی آزادی مانگی تھی تب سے یہ عورت نبیل کے دل سے اتر گئی تھی۔ حسن ایک سال کا ہونے کو آیا تھا مگر رومی اسے کوئی توجہ نہ دیتی تھی۔ کیا مائیں ایسی بھی ہوتی ہیں؟ وہ سوچتا............ حسن اپنی دادی کے پاس ہی پلا تھا۔ وہ دادی کو ہی ماں کہتا تھا۔ نبیل کے ساتھ بھی اس کا بے حد پیار تھا۔ ایک دن نبیل نے ذہن کو فارغ کر کے بہت دیر تک سوچا کہ رومی کس طرح سیدھے رستے پر آ سکتی تھی۔ اس شام وہ جلد گھر لوٹ آیا۔ رومی نہا کر واش روم سے نکلی تھی اور ڈرائیر سے بال خشک کر رہی تھی۔ نبیل کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر اس نے منہ شیشے کی طرف پھیر لیا۔ نبیل بیڈ پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔

''کہیں جا رہی ہو؟'' نبیل کافی دن بعد اس سے ہمکلام ہوا تھا اس نے شیشے میں غور سے نبیل کو دیکھا اور خاموش ہو گئی۔ ''میں نے عرض کیا تھا کہیں جا رہی ہیں۔'' نبیل جو کچھ دفتر سے سوچ کر آیا تھا اس کے مطابق بولا۔

''ہاں دیکھ لو نظر نہیں آ رہا۔'' وہ بالوں میں برش کرتے ہوئے بولی۔

''نبیل ننگے پاؤں تیزی سے اس کے پاس پہنچا'' رومی! تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔''

رومی کے چہرے پر زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''رومی! رومی دیکھو آج میں نے آفس میں بہت دیر بیٹھ کے سوچا ہے۔ ہم نے ہمیشہ ایک ساتھ رہنا ہے۔ زندگی بھر کا ساتھ ہے پھر یہ کیا ہے جو ہم کر رہے ہیں؟''

''زندگی بھر کا ساتھ؟'' رومی طنزیہ انداز میں مسکرائی۔

''رومی! دیکھو ہماری زندگی ہے ہمارا ایک پیارا سا بچہ ہے۔ خدا نے ہمیں ہر نعمت سے نوازا ہے پھر بھی زندگی میں سکون نہیں ہے۔''

''اس کی وجہ تم ہو..........''

''میں..........''

''ہاں ہاں تم..........تم نے میری زندگی برباد کر رکھی ہے..........اپنا منحوس چہرہ میرے سامنے سے دور کیوں نہیں کر لیتے..........''

ایک دم سے رومی پٹڑی سے اتر گئی۔

نبیل بھی غصے میں آ گیا۔''تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو کتیا..........میں تو..........میں تو..........تم پر تھوکتا بھی نہیں ہوں۔ میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر۔ میری ماں نے مجھے جانتے بوجھتے کنویں میں پھینک دیا۔ میں..........میں..........''

''پلیز نبیل! خدا کے لئے میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے معاف کر دو..........میں..........میں اپنی اوقات بھول گئی تھی۔ میں بہت کمینی بہت ذلیل ہوں۔ مجھے معاف کر دو......پلیز......پلیز۔'' وہ حیران و پریشان نبیل کے آگے ہاتھ جوڑ کے بولی

۔نبیل کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھا کے رومی کو سینے سے لگالیا۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔ رومی بے تحاشہ روئے جا رہی تھی۔ نبیل کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کی سوچ کے مطابق رومی کو کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا۔ وہ ایک دم سے ٹھیک ہو جاتی تھی دوسرے ہی لمحے بگڑ جاتی تھی۔ اس بار رومی نے قسم کھا کر کہا تھا کہ آج کے بعد اس سے اس طرح ناراض نہیں ہوگی۔ وہ اپنے آپ کو بالکل بدل لے گی۔ ٹھیک کر لے گی۔ رومی کی اتنی سی یقین دہانی سے ہی نبیل کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ وہ خود کو ہلکا ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ یہ سب کچھ عارضی ہے۔ وہ دونوں اس رات بڑی دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ شکوے شکایتیں دور کرتے رہے۔ صبح جب نبیل دفتر جا رہا تھا تو بہت مطمئن تھا۔ رومی نے کہا تھا کہ وہ اب اپنے آپ کو حتی الامکان بدلنے کی کوشش کرے گی۔ ادھر نبیل نے اپنے دل میں پکا عہد کر لیا تھا کہ وہ گاؤں خط نہیں لکھے گا اور نہ ہی وہاں سے آنے والا خط پڑھے گا۔ کیونکہ ساری خرابی شاید اسی وجہ سے تھی۔ خط کی وجہ سے ہی شاید پروین کا خیال زیادہ ذہن میں آتا تھا۔ نہ خط ہوگا نہ یاد آئے گی اور یہ بات بھی وہ اپنے ذہن میں بار بار تازہ کر رہا تھا کہ وہ ماں سے وعدہ کر چکا ہے کہ گاؤں کبھی نہیں جائے گا۔

جب گاؤں نہیں جانا تھا تو پھر یادیں کیسی؟ اور سوچیں کیسی؟ گاؤں سے منسلک ہر بات وہ ذہن سے کھرچ کر نکال دینا چاہتا تھا۔ وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوا تھا۔ مگر..........قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ آسمان پر کوئی اور فیصلہ ہو چکا تھا۔ ایک دن بڑی خاموشی سے ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے نبیل کی زندگی کو تہہ و بالا کر دیا۔ یہ واقعہ نہیں تھا ایک بھیانک سانحہ تھا۔ رومی گھر سے گئی تھی اور واپس نہیں لوٹی تھی۔ ایک دن دو دن اور پھر ایک ہفتہ گزر گیا۔ رومی کی کہیں سے اطلاع نہیں ملی۔ نبیل دیوانوں جیسا ہو گیا۔ رومی کی اچانک گمشدگی اس پر بجلی بن کر گری تھی۔

پھر ایسی ہی ایک اور بجلی ایک دن دوبارہ گری اور سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ نبیل کو دفتر کے پتے پر ایک خط آیا تھا۔ وہ رومی کا خط تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

''نبیل! میں اس وقت سوئٹزر لینڈ میں اسمتھ کے ساتھ ہوں۔ تمہیں یہ سن کر یقیناً دھچکا لگے گا کہ میں کبھی بھی تمہاری نہیں تھی۔ میں آج تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہتی ہوں، اور حقیقت یہ ہے نبیل کہ میرا اور تمہارا بندھن صرف اور صرف ڈیڈی کی بے جا ضد کا نتیجہ تھا۔ ڈیڈی نے میرے

سامنے ایک ناروا شرط رکھی تھی اور وہ شرط یہ تھی کہ مجھے جائیداد میں سے اپنا حصہ صرف اسی صورت میں ملے گا کہ میں اسمتھ کی بجائے تم سے شادی کروں گی.......... دوسرے لفظوں میں وہ چاہتے تھے کہ میں ساری زندگی تمہاری انگلی پکڑ کر چلتی رہوں۔ وہ اندر سے بھی دیسی ہیں۔ وہ اتنی سی بات نہ سمجھ سکے کہ ان کی بیٹی انگلینڈ میں پلی بڑھی ہے۔ وہ اپنا نفع نقصان سوچ سکتی ہے، اپنے فیصلے خود کر سکتی ہے، وہ کسی کی انگلی نہیں پکڑ سکتی۔

ڈیڈی کا کہنا تھا کہ تمہارے ساتھ گھر بساؤں، ہنسی خوشی رہوں اور تمہارے بچے پیدا کروں، وہ جب مناسب موقع دیکھیں گے میرا حصہ میرے سپرد کر دیں گے۔ دوسری صورت میں مجھے ان کی دولت و جائیداد سے کچھ نہیں ملے گا۔ حقیقت کڑوی ہوتی ہے اور یہ حقیقت ہے نبیل! کہ ڈیڈی کی ضد کے سبب مجھے مجبوراً تمہارے ساتھ رہنا پڑا اور تمہارا بچہ پیدا کرنا پڑا.......... ہاں نبیل! وہ میرا نہیں صرف تمہارا بچہ ہے، میں نے تو اس کے لئے وہی کام کیا ہے جو چوزہ پیدا کرنے والی مشین کرتی ہے۔ وہ نو ماہ میرے وجود میں پلتا رہا ہے، لیکن میرے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں سچ کہتی ہوں میں نے کبھی اسے اپنا بچہ تسلیم نہیں کیا.......... وہ تمہارا بچہ تھا اور تمہارا بچہ تمہیں مبارک ہو۔ چند ہفتے پہلے ڈیڈی کی طرف سے میرے حصے کی پراپرٹی مجھے مل چکی ہے۔ میں نے ڈیڈی سے کہا تھا کہ میں یہ سب کچھ خاموشی سے کرنا چاہتی ہوں کیونکہ میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتی ہوں اور یہ سرپرائز میں نے آج تمہیں دے دیا ہے۔ میں اسمتھ کے ساتھ سوئٹزرلینڈ میں ہوں.......... اور ہم بہت خوش ہیں۔ میں جانتی ہوں تم بڑے سخت دل ہو، تم تھوڑے ہی عرصے میں خود کو سنبھال لو گے۔ کہا سنا معاف۔''

خط پڑھنے کے بعد نبیل کا وجود طوفان میں گھرے ہوئے کسی تنکے کی مانند لرزنے لگا۔ کبھی اتنا بڑا دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص اتنی سنگدلی سے ایسے قریبی تعلقات کو توڑ سکتا ہے۔

☆..........☆..........☆
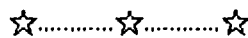
انسان اس حد تک بھی جا سکتا ہے۔ نبیل کو رومی کا گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا اب یاد آ رہا تھا اسے سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ وہ کیوں بیٹھے بٹھائے بگڑ جاتی تھی اور پھر ایکدم سے معافیوں پر اتر آتی تھی۔ وہ بگڑتی اس وجہ سے تھی کہ باپ سے رقم لینے میں دیر ہو رہی تھی اور معافی تلافی پہ اس لئے اتر آتی تھی کہ کہیں باپ دولت دینے سے ہی انکار نہ کر دے۔ سیٹھ افضل رومی اور اسمتھ کے معاشقے سے باخبر ہو چکا تھا۔ اس بے چارے نے تو یہ ترکیب سوچی تھی کہ بیٹی کی شادی نبیل کے ساتھ ہو جائے گی تو وہ بدل جائے گی۔ وہ اسمتھ کو بھول جائے گی۔ مگر کہنے والے سچ کہتے ہیں۔ عورت کا دل پاتال سے بھی زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ اس کے دل میں کیا ہے کوئی نہیں جان سکتا۔ وہ بڑی سے بڑی بات کو بھی اس احتیاط سے دل کی تہہ میں چھپا لیتی ہے کہ چہرے پر اس کا ہلکا سا بھی اثر نہیں دکھتا۔

نبیل کے ذہن میں آندھیوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ اس رات وہ مسٹر ولیم کے بار میں گیا اور خوب شراب پی۔ اسلامی تعلیمات، اسلام کے زریں اصول پابندیاں وہ سب کچھ بھلا بیٹھا تھا۔ وہ ایک آگ اپنے اندر انڈیل رہا تھا۔ اس نے اس کثرت سے مے نوشی کی کہ ہوش و حواس جاتے رہے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور پرل سٹریٹ کی طرف ہو لیا۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ سردی اپنے پورے جوبن پر تھی۔ خنک ہوا

سیٹیاں بجاتی محو رقص تھی۔ نبیل بمشکل ایک پارک کے بنچ پر بیٹھا اور پھر وہیں لڑھک گیا۔ اس کی ٹانگیں بنچ پر جبکہ بالائی جسم گھاس پر پڑا تھا۔ اس نے کوئی گرم کپڑا نہیں پہن رکھا تھا۔ لیدر جیکٹ وہ مسٹر ولیم کے بار میں چھوڑ آیا تھا۔ الٹا گرنے کی وجہ سے شرٹ اس حد تک اوپر ہوگئی تھی کہ سینہ برہنہ ہوگیا تھا۔ نبیل جب بہت رات تک گھر نہیں آیا تو انوری بیگم کو فکر لاحق ہوئی۔ اس نے دفتر فون کیا، نبیل کے سارے دوستوں کو فون کیا۔ شیدے کو بھی انوری بیگم کا فون پہنچا تو وہ فکر مند ہوگیا۔ وہ اٹھ کر سیدھا مسٹر ولیم کی بار کی طرف ہولیا۔ انوری بیگم نے شکیل کو بھی اٹھا دیا تھا۔ شیدا ڈھونڈتا ہوا جب نبیل تک پہنچا تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ نبیل بے سدھ گھاس پر اکڑا پڑا تھا۔ شیدے نے تیزی سے آگے بڑھ کے اسے اٹھایا سڑک پر آ کر ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا۔ نبیل کو ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پہ لٹایا اور گاڑی ہسپتال کی طرف بڑھ گئی۔ شیدا روتا جا رہا تھا اور نبیل کے چہرے پہ ہاتھ پھیرتا جا رہا تھا۔ یکدم نبیل کی پلکوں میں جنبش ہوئی اور نبیل کو ہوش آ گیا۔

خوشی سے شیدے کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ ”شیدے کی جان میرے یار! کیا ہوگیا تھا تجھ کو۔“

”کچھ نہیں.........کچھ بھی نہیں۔“ نبیل اٹھ کے بیٹھا تو اس کی چیخ نکل گئی۔

”اوئے! کیا ہوا ہے تجھے۔“ شیدا فکرمندی سے بولا۔

”کچھ نہیں یار۔“ درد کی وجہ سے نبیل کا لہجہ لڑکھڑا گیا۔

”میں تجھے ہسپتال لے کر جا رہا ہوں۔“

”نہیں یار اس کی ضرورت نہیں تھی گھر چل۔“

شیدا اصرار کر رہا تھا مگر نبیل نے اسے گھر چلنے کا کہا۔ گھر پہنچے تو انوری بیگم کی حالت بڑی خراب ہو رہی تھی۔ شیدا نبیل کو سہارا دے کر اندر لا رہا تھا۔ انوری بیگم نے نبیل کے منہ پر تھپڑ مارنے شروع کر دیئے۔ ”تو مجھے مار کر ہی دم لے گا.........کدھر چلا گیا تھا تو بغیر بتائے بغیر پوچھے۔ تجھے پتا ہے پتا ہے تجھے، میری کیا حالت ہوگئی تھی۔“

”ماں جی! نہ ماریں اسے، اس کی طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں ہے۔“ شیدا نبیل کو بچاتے ہوئے بولا۔

نبیل بیڈ پہ لیٹا تو انوری بیگم پھر شروع ہوگئی۔ ”میں پوچھتی ہوں کدھر گیا تھا تو.........؟“

نبیل نے کوئی جواب نہ دیا جیب سے خط نکال کر ماں کے سامنے کر دیا۔ انوری بیگم خط پڑھتی جا رہی تھی اور اس کے چہرے پہ زلزلے کے آثار نمودار ہوتے جا رہے تھے۔ پورا خط پڑھ لینے کے بعد انوری بیگم ایک چیخ مار کر نبیل کے ساتھ لپٹ گئی۔ ”میرے بیٹے! یہ کیا ہوگیا.........یہ کیا ہوگیا نبیل؟“

”ماں! اس بات کا کسی کو پتا نہیں چلنا چاہئے۔ اپنی ہی بدنامی ہے۔“ نبیل نے آہستہ سے ماں کے کان میں کہا تھا جبکہ شیدا قریب ہی بیٹھا تھا۔ اسے بھنک پڑ گئی تھی۔

”یار شیدے تیرا بہت بہت شکریہ.........تو نے مجھے گھر پہنچا دیا ہے۔“ نبیل نے کراہتے ہوئے کہا۔

''یاڑ! ایک دن تو نے بھی تو مجھے ایسے اور ایسی ہی حالت میں گھر پہنچایا تھا۔ اب یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ اس کا بدلہ اتاڑا ہے میں نے۔''

''اوئے ٹمیں اوئے یار.......... میں نہیں سمجھتا۔'' نبیل پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولا۔

شیدا چلا گیا تو انوری بیگم نبیل کے سرہانے بیٹھ گئی۔

''بیٹا! یہ تو بہت برا ہوا ہے۔ اوگاڈ میرے بیٹے کی زندگی تباہ ہوگئی۔ میں رومی کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔''

''ماں! بھول جائیں سب کچھ...... وہ میری زندگی سے نکل گئی ہے ہمیشہ کے لئے...... میں اسے آپ کے سامنے طلاق دیتا ہوں۔''

''بیٹا! تو اتنا عرصہ سولی پہ لٹکا رہا اور تو نے مجھے بتایا تک نہیں۔''

''ماں! میں نے کہا ناں.......... اس کی بات مت کرو.......... میں.......... میں وہ سب کچھ بھلا دینا چاہتا ہوں۔''

نبیل نے بمشکل بات کی اور اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ انوری بیگم کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ اتنے میں شکیل باہر آ چکا تھا۔ انوری بیگم نے شکیل کو باہر سے بلایا۔ شکیل بھاگا ہوا اندر آیا۔ انوری بیگم کے کہنے پر اس نے نبیل کو گاڑی میں بٹھایا انوری بیگم بھی ساتھ ہی بیٹھ گئی اور یہ لوگ ہسپتال پہنچ گئے۔ نبیل کو فوری داخل کر لیا گیا۔ ابتدائی ٹیسٹ لئے گئے تو پتا چلا کہ شدید نمونیا ہے۔ سردی میں گھاس کے اوپر پڑے رہنے سے اس پر نمونیے کا حملہ ہو چکا تھا۔ دو تین دن گزر گئے مگر نبیل کی حالت سنبھلی نہیں......... ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ لانے میں دیر کی گئی ہے۔ نمونیہ بگڑ چکا ہے۔ ٹھیک ہونے میں وقت لگے گا۔ جب کافی دن گزر گئے کچھ زیادہ فرق نہ پڑا تو نبیل کے دوبارہ ٹیسٹ کئے گئے۔ چیسٹ ایکسرے کئے گئے تو یہ روح فرسا حقیقت کھلی کہ نبیل کو Plunel effusion نامی بیماری لاحق ہوگئی ہے۔ جس میں پھیپھڑوں کے کسی خاص حصے میں پانی بھر جاتا ہے۔ نبیل کا علاج کرنے والا ایک مسلمان ڈاکٹر تھا۔ وہ ایک نیک دل انسان تھا اس کا نام نسیم اشرف تھا۔ اس نے انوری بیگم سے کہا تھا کہ یہ بیماری اتنی خطرناک نہیں ہے۔ بس احتیاط کی ضرورت ہے اور مناسب خوراک سے نبیل بہت جلد صحت یاب ہو جائے گا۔

☆..........☆..........☆

نبیل کا علاج شروع ہو گیا۔ اسے روزانہ خصوصی ٹریٹ منٹ دی جاتی، کیونکہ ہسپتال میں سیٹھ افضل کا ایک ڈاکٹر واقف کار تھا اور سیٹھ افضل نے اس سے التجا کی تھی کہ میرا بیٹا جلد از جلد ٹھیک ہونا چاہئے۔ حقیقت حال سب گھر والوں پر کھل چکی تھی۔ ہر کوئی رومی کے کردار کے بارے میں جان گیا تھا۔ سب نے جیسے چپ سادھ لی تھی۔ ایک دن نغمانہ نے رومی کی بات کرنا چاہی تو سیٹھ افضل نے اسے بُری طرح جھاڑ دیا۔ ''خبردار آج کے بعد کسی نے رومی کا نام بھی اس گھر میں لیا۔ وہ ہمارے لئے مر چکی ہے۔ میری صرف ایک بیٹی اور ایک بیٹا ہے۔''

''مگر رومی بھی تو ہماری بیٹی تھی.........'' نغمانہ بیگم روتے ہوئے بولی۔

''تھی......... کبھی تھی......... مگر اب نہیں ہے......... سنو آج کے بعد اس کا ذکر میرے سامنے مت کرنا۔''

سیٹھ افضل بہت غصے سے بولا تھا۔ اس دن کے بعد نغمانہ نے بھی چپ سادھ لی تھی۔

جس طرح نبیل کا علاج معالجہ ہو رہا تھا اسے تو بہت جلد صحت یاب ہو جانا چاہئے تھا۔ مگر صحت مند ہونے کی بجائے دن بدن اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ وہ خطرناک حد تک کمزور ہو گیا تھا۔ گالوں سے اوپر ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ آنکھیں اندر کو دھنسی معلوم ہوتی تھیں۔ وہی گال جن پر کچھ عرصہ پہلے شباب کی سرخی تھی اب زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ اس کا جسم نحیف اور لاغر ہو گیا تھا۔ انوری بیگم بیٹے کی حالت دیکھ دیکھ کر خون کے آنسو بہاتی تھی۔ گھر بھر میں موت کا سا سناٹا چھا گیا تھا۔ ہر کوئی رومی کو دل ہی دل میں لعن طعن کر رہا تھا۔ وہ اپنے آٹھ نو ماہ کے بچے کو چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔

نبیل کے ٹھیک نہ ہونے کی وجہ یہی تھی کہ رومی کی طرف سے بہت بڑا شاک لگا تھا اور جسے دیکھ دیکھ کر وہ سب سے زیادہ کڑھتا تھا وہ حسن تھا جو ماں کے زندہ ہوتے ہوئے بھی ماں کی ممتا سے محروم ہو گیا تھا۔ گو کہ انوری بیگم نے دادی ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔ مگر وہ ماں تو نہیں تھی۔ نبیل کو بسترِ علالت پہ آٹھ ماہ کا طویل عرصہ گزر گیا۔ نبیل کے معالج تندہی سے نبیل کا علاج کر رہے تھے۔ وہ موت سے زندگی کی بازی تو جیت گیا تھا مگر موت کے منہ سے بچ کر جو زندگی لوٹی تھی وہ قابلِ رحم تھی۔ وہ پہلے والا نبیل نہیں رہا تھا جس کسی نے ایک سال پہلے نبیل کو دیکھا تھا۔ وہ اب اسے نہیں پہچان سکتا تھا۔

پھر ایک دن نبیل کو اسپتال سے چھٹکارا مل گیا۔ ڈاکٹر نسیم اشرف بھی نبیل کو رخصت کرتے وقت آبدیدہ ہو گیا تھا۔ وہ نبیل سے مانوس ہو چکا تھا۔ اس نے نبیل کو انوری بیگم کے سامنے ہدایت دیتے ہوئے کہا تھا کہ اسے مکمل آرام، سکون اور تبدیلی آب و ہوا کی ضرورت ہے۔ وقت تو لگے گا خدا نے چاہا تو اس کی قوت بحال ہونا شروع ہو جائے گی۔ شیدا بہت اچھا دوست ثابت ہوا تھا۔ جب سے نبیل بیمار چلا آ رہا تھا وہ اس کا سایہ بنا ہوا تھا۔ اب جب کہ نبیل گھر آ گیا تھا۔ اس نے بھی گھر ڈیرہ جما لیا تھا۔ وہ دن رات نبیل کی دل جوئی میں لگا رہتا تھا۔

گھر آ کر انوری بیگم نے نبیل کی نگہداشت میں رات دن ایک کر دیا تھا ہر کوئی نبیل کی دیکھ بھال میں لگا ہوا تھا مگر نبیل گم صم سا کھویا کھویا تھا۔ نہ کسی سے بات کرتا تھا نہ ہنستا تھا۔ بس چت لیٹا رہتا تھا۔ ایک دن جب انوری بیگم حسن کو سلا چکی تو وہ نبیل کے پاس آئی اور اس کے پاس بیٹھ کر بڑے پیار سے اس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔

''نبیل بیٹے! ماضی کو بھول جاؤ۔ خوش رہا کرو۔ دکھوں کو ختم کرنے کے لئے انسان کو خود باہمت ہونا پڑتا ہے۔ اس کام میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا۔ ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر سب کچھ بھول جاؤ۔ تم جلد سے جلد صحت مند ہو جاؤ پھر دیکھنا میں کیسی چاند سی پیاری دلہن اپنے گھر میں لاتی ہوں۔''

نبیل عجیب سے انداز میں ہنس دیا۔ ''ماں! اب میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔''

''نہیں بیٹے ایسی بات نہیں کرتے۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے اور زندگی کا سفر کسی ساتھی کے بغیر کیسے کٹ سکتا ہے؟''

''کٹ سکتا ہے ماں۔ کٹ سکتا ہے۔'' نبیل چھت کو گھورتے ہوئے بولا۔

''اس کا جواب میں تمہیں آنے والے وقت میں دوں گی۔'' رومی کی گم گشتہ آواز نبیل کے کانوں میں گونجی۔

''کیا کرو گی تم............''

''تمہیں سچ مچ کا ذہنی مریض بنا کر چھوڑوں گی۔'' رومی کا کہا ہوا فقرہ نبیل کے کانوں میں گونجا۔ نبیل گزرے وقت کی بات یاد کر کے مسکرا دیا۔

''اور آخر جو اس نے کہا تھا وہ کر دکھایا۔'' نبیل زیرِ لب بڑبڑایا............۔

''کیا کہا بیٹا!'' انوری بیگم بولی۔

''کچھ نہیں ماں بس میں نے عہد کر لیا ہے۔ چاہے جو بھی ہو شادی نہیں کروں گا۔'' پھر یکدم نبیل آنسوؤں سے رونے لگا۔

''میرے بیٹے! کیوں روتا ہے تو..........'' انوری بیگم کی آنکھیں بھی چھلک پڑیں۔

''کچھ نہیں ماں.........'' جیسے وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

''نہیں بتا مجھے تُو مجھ سے کچھ چھپا رہا ہے۔''

''نہیں.........ایسے ہی ماں..........''

''اپنی ماں سے چھپائے گا.........ہاں.........بول.........''

''اچھا.........مجھے نیند آ رہی ہے۔ صبح بات کریں گے۔'' نبیل نے ماں کو ٹالا۔ اس کے دل میں یہ ڈر بیٹھا تھا کہ کہیں ماں قطعی انکار نہ کر دے۔

''مجھے ساری رات نیند نہیں آئے گی۔ جو تُو اپنے دل کی بات نہیں بتائے گا۔''

''ماں.........ایک ماں.........اپنے بچے سے کتنا پیار کرتی ہے؟''

''اتنا.........جتنا کسی پیمانے سے ناپا نہیں جا سکتا۔''

''اسے اپنی اولاد کی خوشی بھی عزیز ہوتی ہے نا؟''

''اس سے بڑھ کر کوئی چیز عزیز نہیں ہوتی۔''

نبیل کی خاموشی طویل ہو گئی تو انوری بیگم بولی۔ ''بیٹا! خاموش کیوں ہو گیا بول نا۔''

وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔ ''ماں! دیکھ ایک دن تو نے کہا تھا اور میں نے مان لیا تھا.........میں نے.........اپنی خوشی پر تیری خوشی مقدم رکھی تھی۔''

''کھل کر بتا بیٹا! تو کیا کہنا چاہتا ہے۔''

''میں تجھے ناراض نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لئے تیرے ہر حکم پر سرِ تسلیم خم کرتا گیا۔ رومی مجھے روندتی ہوئی گزر گئی لیکن میں نے اُف تک نہ کی ماں۔ کل تیری خوشی کے لئے میں نے تیرا حکم مانا تھا.........آج اپنے بچے کی ایک چھوٹی سی خواہش پوری کر دے۔ ایک اجازت دے کر اس کو زندہ درگور ہونے سے بچا لے۔'' وہ بلک پڑا تھا۔

''میرے بچے! ماں تجھ پر سو جان سے قربان تو خواہش تو بتا۔'' انوری بیگم تڑپ کر رو دی اور نبیل کے سر پر بوسے دینے لگی۔

اس نے فریادی نظروں سے ماں کو دیکھا۔ ''ماں.......... مجھے گاؤں جانے کی اجازت دے دے۔'' نبیل کی آواز نہایت نحیف تھی، اس کی آنکھوں میں آنسو بھر ارہے تھے۔ یہ آنسو بھی جیسے ماں کے منفی جواب کے خوف سے ڈر رہے تھے۔

لمحوں میں جیسے صدیاں بیت گئیں۔ انوری بیگم کی پیشانی پر لکیروں کا جال تھا۔ ماضی کی چوٹیوں پر زمانوں سے جمی ہوئی انا پرستی اور خود پسندی کی برف تمنا کی دھوپ سے پگھلنا شروع ہوگئی تھی۔ کچھ بھی تھا آخر کو انوری بیگم ایک ماں تھی.......... اور اس کا بچہ زندگی سے دور اور موت سے قریب نظر آ رہا تھا۔ آخر انوری بیگم کے ہونٹوں سے ایک لرزاں آواز ابھری۔ ''میری جان تجھے اجازت ہے۔ تو جدھر چاہے جا سکتا ہے۔ میں تیری خوشی اور سلامتی کے لئے آج تجھے ہر وعدے سے آزاد کرتی ہوں۔''

''ماں!'' نبیل نے بچے کی طرح بلک کر کہا اور ماں سے لپٹ گیا۔ ماں نے بھی اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔

بے آب و گیاہ صحرا کی تپتی دوپہر میں اچانک ہی جیسے بادلوں نے چھاؤں کر دی تھی گھنگھور گھٹائیں چھا گئی تھیں اور موسلا دھار بارش نے سماں باندھ دیا تھا۔ صحرا کے ایک حصے سے ایک دم نخلستان وجود میں آیا تھا اور ہر طرف ہریالی پھیل گئی تھی۔ ایک سال کے بعد آج پہلی بار نبیل اشک بار آنکھوں کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔

☆..........☆..........☆

اس واقعہ کے ٹھیک سات دن بعد نحیف و نزار نبیل شیدے کے ساتھ جہاز میں سوار ہو رہا تھا۔ یہی وہ ایئر پورٹ تھا جہاں کافی عرصہ پہلے نبیل پاکستان سے آنے والے جہاز سے اترا تھا۔

اس کے دل میں اپنی مٹی سے جدائی کا انمٹ دکھ تھا۔ اس وقت وہ کتنا غمگین تھا۔ مگر آج سب مختلف تھا۔ جونہی جہاز نے انگلینڈ کی سرزمین کو چھوڑا نبیل کا دل خوشی و شادمانی سے بھر گیا۔ اس کے سامنے گاؤں کی کھلی فضائیں آ گئیں۔ بکریوں اور بھینسوں کے ریوڑ لہلہاتی فصلیں شور مچاتے ٹیوب ویل، دور سے کوئی سُر اٹھ رہا تھا پھیل رہا تھا مگر اب آواز ناپید نہ رہی تھی۔ اس آواز میں چاندنی تھی۔ سنہری دھوپ میں نہائے سورج مکھی کے پھول تھے۔ سخت سرد راتوں میں اپلوں میں مچلتی آگ کی پھڑ پھڑاہٹ تھی۔ تندور پہ روٹیاں لگاتی دوشیزاؤں کی کلائیوں سے مچلتی چوڑیوں کی کھنکناہٹ تھی۔

''شیدے! میں تیرا یہ احسان کبھی نہ بھلا سکوں گا۔'' نبیل نے کھڑکی سے باہر دیکھتے شیدے سے کہا۔

''باؤ! اگر ایسی باتیں کرے گا تو چلتے جہاز سے اتر جاؤں گا۔''

''شیدے! یہ تیری لکشمی کی ۹ نمبر یا بھاٹی کی ۳ نمبر ویگن نہیں ہے جو تو اتر جائے گا۔ تیس ہزار فٹ کی بلندی پہ اڑتا ہوا جہاز ہے۔''

شیدے نے زور سے کپکپی لی۔ ''اچھا پھر میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ مگر ایک بات غور سے سن لو۔ دوبارہ احسان جتانے کی کوشش نہ

کرنا۔'' وہ نبیل کا کندھا دبا کر بولا۔تشکر کے بوجھ سے نبیل کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔نبیل جانتا تھا شیدا صرف اور صرف اس کے پیار کی وجہ سے اس کے ساتھ پاکستان جا رہا ہے۔وہ اپنے یار کو خوش دیکھنا چاہتا تھا۔اس کی زندگی میں پھر سے خوشیاں لانا چاہتا ہے۔جہاز نے کراچی میں لینڈ کیا۔ پھر کراچی سے بھی وہ لوگ جہاز کے ذریعے لاہور پہنچے۔لاہور میں شیدے کا استقبال کرنے کے لئے اس کے عزیز و اقارب کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔شیدا باری باری سب سے گلے ملتا رہا، اور ساتھ ساتھ اونچی آواز میں نا جانے کیا بولتا رہا۔شیدے نے انگلینڈ سے ہی فون کر دیا تھا۔دونوں کے اگلے سفر کے لئے گاڑی باہر موجود تھی۔سب لوگ شیدے کو ایک رات روکنا چاہتے تھے مگر شیدے نے کہا تھا کہ وہ دوست کو گاؤں چھوڑ آئے دو چار دنوں تک پہنچ جائے گا۔لگژری مارک نو میں پھر ان دونوں کا سفر شروع ہوا۔شیدا گاڑی چلا رہا تھا۔جبکہ نبیل ساتھ والی سیٹ پہ نیم دراز تھا۔نبیل نے گاؤں میں کسی کو اطلاع نہیں دی تھی کہ وہ پہنچ رہا ہے۔وہ سرپرائز دینا چاہتا تھا۔

وہ نومبر کی ایک چمکیلی صبح تھی۔جی ٹی روڈ پر ٹریفک رواں دواں تھی۔گاڑی کے تمام شیشے اوپر تھے ہلکا ہیٹر گاڑی میں چل رہا تھا۔شہر سے باہر نکلتے ہی دونوں اطراف کھلی زمین شروع ہوگئی تھی۔نبیل کی آنکھوں میں کئی محفلوں کی دھول تھی۔وہ اپنے ماضی کی طرف لوٹ رہا تھا وہ گاؤں کی طرف لوٹ رہا تھا۔وہ اپنے خمیر کی طرف لوٹ رہا تھا۔اس نے اپنی زندگی کی بتیس بہاریں انگلینڈ میں دیکھی تھیں۔وہ وہیں پلا بڑھا تھا۔وہیں اس کی جوانی پروان چڑھی تھی۔مگر بچپن کا ایک مہینہ اس نے گاؤں میں بھی گزارا تھا۔وہ ایک مہینہ اس کی پوری زندگی پر چھا گیا تھا۔اس کی سوچوں کے پاتال میں ہمیشہ سے کچھ نامکمل ناقابل فہم سے مناظر بسیرا کئے رہتے تھے۔اکثر اوقات وہ نامکمل سوچیں ابھر کر اوپر آتیں اور سے بے حال کر دیتی تھیں۔متوقع منظر پردۂ بصارت پر آتے آتے رہ جاتا تھا۔سوچ کی پرچھائیں پردۂ بصارت سے ایک جھلک دکھا کر غائب ہو جاتی تھیں۔وہ تڑپ کے رہ جاتا تھا۔ اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ پورا ایک ماہ اس کا باپ احسن نذیر کس طرح اسے انگلی پکڑ کر گاؤں کی گلیوں میں گھماتا رہا تھا۔ایک ایک جگہ اسے ذہن نشین کراتا رہا تھا۔شاید وہ جانتا تھا کہ اس کے بعد وہ خود بھی گاؤں نہ آسکے گا۔اس نے اسی دن اپنی ہر پیاری چیز سے ناطہ توڑ کے نبیل کا ناطہ جوڑ دیا تھا۔احسن نذیر بچپن میں چاچے حیات سے چابی والے کھلونے کیلئے ضد کرتا تھا۔چابی والے کھلونے میں جیسے اس کی جان اٹکی تھی۔پھر نبیل کی آنکھوں میں چابی والے کھلونے کی شبیہہ کیوں لہراتی تھی۔کیا اس نے بچپن میں چابی والا کھلونا دیکھا تھا۔گاؤں میں اس سے کھیلا تھا وہ.........بستر مرگ سے لیٹا حسنا کیوں بار بار نبیل کو گاؤں جانے کا مشورہ دیتا تھا؟

شاید حسنے کی لازوال خواہش نبیل میں سرایت کر گئی تھی۔وہ خود گاؤں نہیں جا سکتا تھا اپنی جنم بھومی نہیں جا سکتا تھا۔نبیل تو وہاں جا سکتا تھا وہ اسے تو وہاں بھیج سکتا تھا۔

گاڑی نے جی ٹی روڈ سے دائیں طرف موڑ کاٹا اور دیہاتوں کے گورکھ دھندے چھچھر والی نہر کی طرف ہو لی۔سویر پور وہاں سے ستر کلو میٹر دور رہ گیا تھا۔سویر پور جہاں نبیل کا سب کچھ تھا۔چھچھر والی کی نہر کی پلیوں کے ساتھ ساتھ فروٹ مٹھائی، سائیکل ورکس وغیرہ کی دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ایک طرف ایک کیم شیم آدمی تازہ رہو مچھلی زمین پر ہی لگائے بیٹھا تھا۔خستہ حال ویگنیں مسافروں سے بھری ہوئی تھیں۔

بہت سے مسافر سٹاپ پر ویگن کا انتظار کر رہے تھے۔سادہ لوح دیہاتی عورتوں نے بچوں کے ہاتھ بہت مضبوطی سے تھام رکھے تھے۔یہ

زندگی کتنی سادہ، خوبصورت اور سچی تھی۔ مادی آلائشوں سے قطعی پاک۔ نبیل سوچنے لگا۔

"یار نبیل باؤ! سیب کھائے گا یا کیلے؟"

"کچھ بھی نہیں..........دل نہیں چاہ رہا.........."

"پہلوانوں کے ساتھ چلا ہے تو بہانے نہیں چلیں گے باؤ۔" شیدے نے کہا اور گاڑی ایک سائیڈ پہ لگا دی۔

☆..........☆..........☆

سکول شروع ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے۔ پروین نے من کی مراد پالی تھی۔ جب صبح صبح سویر پور اور ساتھ کے چند دیہات کی بچیاں سکول پڑھنے کے لئے بستے لٹکائے آتی تھیں تو پروین کا دل انجانی خوشی سے بھر جاتا تھا۔ وہ ان معصوم چہروں پر بکھری چاندنی دیکھ کر نہال ہوئی جاتی تھی۔ پہلے پہل وہ تمام بچیوں کو خود پڑھاتی تھی۔ مگر جب بچیوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو ساتھ کے گاؤں کی دو استانیوں کو بھرتی کرنا پڑا۔

پروین نے اپنے سارے غم سارے دکھ سکول کی چار دیواری میں قید کر لئے تھے۔ وہ جب تک سکول میں رہتی ہر غم بھولا رہتا۔ جونہی گھر کے آنگن میں اترتی..........لٹی محفلوں کی دھول اس کے دل میں بھرنے لگتی۔ اوپر والے کمرے سے آم کے جڑواں درخت کی طرف دیکھتی تو دل بھر آتا۔ ایک تڑپ ہوتی جو اعصاب جھنجھوڑ دیتی جسے دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر چاہا تھا۔ اب اسے دیکھنے کا حق بھی نہیں رہا تھا۔ کیا یہ حق بھی قدرت نے اس سے چھین لیا تھا۔ وہ اکثر سوچتی کہ وہ کوئی پرندہ ہوتی جو اڑتی ہوئی اس سرزمین تک پہنچ جاتی جہاں وہ رہتا تھا۔ وہ..........جس سا کوئی نہیں تھا جو سب سے جدا تھا۔

پہلے پہل تو جنت بی بی نے نبیل کے بارے میں بہت جوش دکھایا تھا۔ مگر جب سے اس کی شادی ہوئی وہ جان گئی تھی کہ اب سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ اس نے پروین کو سمجھانا شروع کر دیا۔ اس نے اسے بتایا تھا کہ وہ جس کے پیچھے بھاگ رہی ہے، وہ سراب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اب اس کے ہاتھ کچھ نہیں آنے والا، وہ اسے ادھوری داستان سمجھ کر بھول جائے۔ مگر پروین بھلا ایسا کیسے کر سکتی تھی۔ وہ داستان تو اس کی رگ و جان کے ساتھ نتھی تھی۔

پروین پڑھی لکھی اور حقیقت پسند لڑکی تھی۔ مگر پیار بڑے بڑے حقیقت پسندوں کو غیر حقیقت پسند بنا دیتا ہے۔ وہ تخیل کے زور پہ نئے جہاں آشکار کراتا ہے جہاں من مرضی کے منظر ہوتے ہیں۔ اس کی ان کہی میٹھی باتیں اس کی پیار بھری شرارتیں دل میں کھد بد کرتی ہیں۔ پھر حقیقت کی دنیا میں بھونچال آ جاتا ہے۔ انسان قرار سے بے قراری کا سفر بڑی تیزی سے کرتا ہے۔ ادھر تخیل میں وصال کی رنگین دنیا آنکھوں سے اوجھل ہوتی ہے۔ ادھر حقیقت کی دنیا کا زہرناک فراق شروع ہو جاتا ہے۔

پروین اکثر جب صبح نماز کے لئے اٹھتی تو اس کی آنکھیں متورم ہوتیں۔ وہ ہینڈ پمپ کے یخ بستہ پانی کے چھینٹے آنکھوں پر ہولے ہولے سے مارتی اور دل ہی دل میں روتی۔ جنت بی بی پروین کو سمجھا سمجھا کر تھک چکی تھی۔ مگر اب اس نے بھی کہنا چھوڑ دیا تھا۔ ماں کو دیکھ کر بھائیوں نے بھی

چپ سادھ لی تھی۔ شوکا کام کے سلسلے میں کافی عرصے سے شہر گیا ہوا تھا۔ وہ آج ہی شہر سے لوٹا تھا۔ وہ شہر سے نئی سوزوکی جیپ لے کر آیا تھا۔ اس نے جیپ عین سکول کے سامنے کھڑی کی اور اندر چلا گیا۔ شہر میں رہنے کی وجہ سے اس کے چہرے کی سرخی مزید گہری ہوگئی تھی۔ وہ کچھ بھاری ہوگیا تھا۔ پروین اس وقت بچیوں کو پڑھا کر فارغ ہوئی تھی اور کیکر کے درخت کے ساتھ ہی بیٹھی دھوپ سینک رہی تھی۔ پہلی شفٹ میں مقامی بچیاں پڑھتی تھیں جبکہ دوسری شفٹ میں آس پاس کے دیہات کی بچیاں پڑھنے کے لئے آتی تھیں۔ سب ہی پروین سے کہتے تھے کہ وہ اتنا کام اپنے سر پر سوار نہ کرے مگر وہ کسی کی سنتی ہی کب تھی۔ اب وہ کرسی پر آنکھیں موندے بیٹھی بچیوں کا انتظار کر رہی تھی۔ شوکا آہستگی سے آکر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پروین کی آنکھوں میں سایہ سا لہرایا اور اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ ''آ..........آپ..........''

''ہاں..........میں..........'' شوکا بھویں اچکا کر بولا۔

''السلام علیکم..........'' پروین سر پہ چنری درست کر کے بولی۔

''وعلیکم السلام..........ایک بچی کو داخل کرانا ہے بس جی..........اگر آپ کی اجازت ہو تو پھر..........''

پروین شوکے کے مذاق پر مسکرا دی۔ ''آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں، یہ سارا سکول آپ کا ہی تو ہے..........'' وہ نگاہیں جھکا کر بولی۔

''اور سکول کے لوگ..........'' شوکا معنی خیز انداز میں بولا اور جب پروین آگے سے کچھ نہ بولی تو بات کا رخ موڑتے ہوئے بولا ''آج ہی شہر سے واپس آیا ہوں۔ ایک دوست کی شادی تھی۔ پھر کاروباری مصروفیت اتنی رہی کہ گاؤں نہ آسکا۔''

''چائے بنواؤں آپ کے لئے؟'' پروین بولی۔

''نہیں..........چائے تو میں نہیں پیوں گا..........البتہ آج ایک ضروری بات تم سے کرنی ہے۔ بہت عرصہ ہوا سوچتا تھا کہ تم سے کروں یا نہ کروں..........مگر لگتا ہے..........آج میرے منہ سے وہ بات نکلنا چاہتی ہے..........'' پروین سیدھی ہو کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''دیکھو پروین! میں ایک سیدھا سادھا بندہ ہوں۔ دل فریب مجھ میں نہیں ہے۔ یہ باتیں بڑوں کے کرنے والی ہیں۔ مگر بڑوں کے ذریعے جب بات آگے نہ بڑھ رہی ہو تو پھر خود ہی کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آسیہ کی شادی پہ تمہارا میرا ٹاکرا ہوتا رہا تھا اور اس دوران میں نے اپنی محبت کا اظہار تم پر کر دیا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ مجھے اپنی بات دوبارہ دہرانا پڑے گی۔'' پروین کا جھکا ہوا سر مزید جھک گیا تھا۔

''میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں! پروین..........تمہارے علاوہ آج تک دل میں بسی ہی کوئی نہیں۔ اگر تم ہاں کر دو تو اسے میں اپنے لئے رب کا کرم سمجھوں گا۔ اور اگر انکار کرو گی تو پھر بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں..........مگر اتنا یاد رکھنا ایک آس بھرا دل چکنا چور ہو جائے گا۔''

پروین کی سماعت پر کوئی زور زور سے ہتھوڑے کی ضربیں لگا رہا تھا۔ آسمانی جھولا بڑی تیز رفتاری سے گھوم رہا تھا اور آسیہ کی باتوں کی بازگشت اسے سنائی دے رہی تھی۔ ''خوش قسمتی روز روز دروازے پہ آکر دستک نہیں دیتی۔ عمر کچھ زیادہ ہو جائے تو رشتہ دیکھنے والے سو نقص نکالتے ہیں۔ تم کب تک اپنے ماں باپ پر بوجھ بنے رہنا چاہتی ہو۔ بولو..........جواب دو..........'' پروین نے اپنے کانوں پر ہتھیلیاں جما دیں۔ اس کی چوڑیاں کلائی سے ایک ایک کر کے نیچے گرنے لگیں۔ یہاں تک کہ سفید دودھیا کلائی برہنہ ہوگئی۔

''پروین! میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔''

''مجھے سوچنے کے لئے وقت چاہئے۔'' پروین کی آواز بہت نیچی تھی۔

''میں تو قیامت تک تمہارا انتظار کرسکتا ہوں'' شوکا پھیکی ہنسی ہنسا اور وہاں سے اٹھ بیٹھا ''پروین خاموش اور غمگین رہنا چھوڑ دو۔ ایسے بندے سے ہر آدمی کنارہ کش ہو جاتا ہے، ہنستے مسکراتے چہرے ہر کسی کو پیارے لگتے ہیں۔ میٹھا بول ہر کسی کو بھاتا ہے۔ میں.......... میں تمہارے چہرے پر خوشی دیکھنا چاہتا ہوں پروین۔'' شوکے نے ملائم لہجے میں پروین سے کہا تو اس کا دل بھر آیا۔ پروین تشکر بھری نظروں سے شوکے کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ یہ شوکا ہی تھا جس نے مشکل گھڑی میں اس وقت پروین کا ساتھ دیا تھا۔ جب کوئی اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس شخص نے اسے اور آسیہ کو بدمعاشوں کے چنگل سے نکالا تھا اور آج تک اس کا ذکر تک نہیں کیا تھا اور اب یہی شخص رشتے کی شدید خواہش کے ساتھ اس کے پاس آیا تھا اور پروین نے اسے ٹال دیا تھا۔

اس نے کتنے خط گاؤں سے انگلینڈ بھیجے تھے۔ دس ماہ سے وہاں سے ایک بھی جواب نہیں آیا تھا۔ تو کیا نبیل گاؤں کو بالکل بھلا بیٹھا تھا۔ پھر یکدم سوچ بدلنے لگی۔ اس کا گھر مکمل ہو چکا تھا وہ اپنی زندگی گذار رہا تھا۔ اسے کیا ضرورت پڑی تھی گاؤں کی طرف دھیان کرنے کی.......... گاؤں کے لوگوں کے بارے میں سوچنے کی۔

''نبیل! تم بھول جاؤ.......... سب کچھ بھلا دو.......... مگر خدا کی قسم میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گی.......... کبھی نہیں۔ میرے تصور نے وصال کی یادگار راتیں تمہارے ساتھ گزاری ہیں۔ میں نے کڑکتی دوپہروں میں تمہارے سینے پہ سر رکھ کر اپنی نیند پوری کی ہے۔ میں تمہیں بھلا کیسے بھلا سکتی ہوں۔'' نیم دراز پروین کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر کانوں کی لوؤں کو بوسہ دیتے ہوئے پکی زمین میں جذب ہو گئے۔ سکول کے کچے صحن میں نرم دھوپ کا جال بچھا ہوا تھا۔ دھوپ کا بھی ایک اپنا رنگ ہوتا ہے۔ یہ آنکھوں میں جذب ہو کر دماغ کو روشنی سے بھر دیتی ہے۔ پروین نے کلائی میں پہنی ہوئی گھڑی پہ ٹائم دیکھا۔ بچیوں کے آنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ دوپہر کا کھانا پروین کو رفیق ٹینڈ کا چھوٹا بیٹا مانا پہنچا کر جاتا تھا۔ آج اسے کچھ دیر ہو گئی تھی۔ پروین نے وقت دیکھنے کے بعد انگلیوں کی پوروں کے ذریعے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کی نمی صاف کی اور اٹھ بیٹھی۔

''نبیل! واپس آ جاؤ.......... پلیز.......... پلیز.......... اور مت ستاؤ..........'' پروین کے اندر جیسے آواز گونجی۔ ''اب میں اور کچھ نہیں چاہتی.......... مجھے اپنی صورت تو دکھا دو۔ اپنی آواز تو سنا دو..........''

پروین کلاس روم کی طرف جانا چاہتی تھی اسی وقت مانا وہاں آ موجود ہوا۔

''آج اتنی دیر کیوں لگائی آنے میں۔ اور کھانا کیوں نہیں لایا تو..........؟'' پروین مانے کو گھورتے ہوئے بولی۔

''چاچی! کہہ رہی تھی کھانا گھر آ کر ہی کھالیں..........''

پروین کو غصہ تو بہت چڑھا مگر وہ ضبط کر گئی اور گمبھیر آواز میں بولی۔ ''ماں سے جا کر کہہ دینا شام کو آ کر ہی کھالوں گی..........'' بھوک کی وجہ سے پروین کے پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔ وہ صبح ناشتہ بھی نہیں کر کے آئی تھی۔ غصے اور بھوک سے اس کے پیٹ میں بل پڑنے لگے تھے۔

''چل جا اب جاتا کیوں نہیں..........؟'' پروین غصے سے بولی۔

''چاچی کہہ رہی تھی۔نبیل ولیت سے آیا ہے۔کھانا گھر آ کر ہی کھالیں..........'' مانا ڈرتے ہوئے بولا۔

''کک..........کون آیا ہے؟'' پروین کی آنکھیں حیرت سے اسقدر پہلے کبھی نہ کھلی تھیں۔

''چاچی! یہی کہہ رہی تھی..........نبیل ولیت سے آیا ہے۔'' مانا پریشان ہوکر بولا۔

پروین کی آنکھیں ایک دم بھر آ ئیں۔اس نے آگے بڑھ کر مانے کا گندا منہ چوما اور پاگلوں کی طرح پلٹ کر سکول سے باہر نکل گئی۔کتنی دیر تو مانے کو سمجھ ہی نہ آئی کہ یہ سب کیا ہوا ہے۔وہ چکرا کے رہ گیا تھا۔پروین گاؤں کی گلیوں، پگڈنڈیوں، کچے راستوں پر اندھا دھند بھاگی چلی جا رہی تھی۔اس کی جوتی کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔اس کے سفید دودھیا پاؤں مٹی سے اٹ گئے تھے۔ان نازک پاؤں کے نیچے چھوٹے موٹے کنکر آ رہے تھے۔مگر وہ بھاگے چلے جا رہی تھی۔پروین کے چٹے گالوں پہ آنسو آج دل کھول کے برسے تھے۔کچے راستے کے ساتھ ساتھ آگے کیکروں کی ایک لمبی قطار تھی۔کیکروں کے نیچے کانٹے جابجا بکھرے ہوئے تھے۔وہ کانٹوں سے بے پرواہ ان پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔بے انتہا خوشی کا احساس تکلیف کے ہر احساس کو مٹا ڈالتا ہے۔پروین کے نرم پاؤں میں ایک ساتھ کئی کانٹے چبھے تھے۔مگر وہ دل میں چبھے کانٹوں سے زیادہ خطرناک تو نہ تھے۔جہاں کچے مکان شروع ہوئے اس نے پیلیوں میں سے نکلتے ہوئے موٹی چادر سے آنسو صاف کر کے چادر سر پہ درست کر لی تھی۔خوشی کی زیادتی سے اس کا وجود ہولے ہولے لرز رہا تھا۔اس کا چہرہ تمتمار ہا تھا۔اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں۔خوشی اس کے اندر سے سسکیوں کی صورت نکل رہی تھی۔

اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ گھر کے صحن میں قدم رکھا۔آنکھوں میں قرنوں کی پیاس یکدم سے امڈ آئی۔اس کا انتظار لا حاصل نہیں رہا تھا۔اس کی پیاس کو ٹھنڈک سے لبالب بھرا پیالہ میسر آ گیا تھا۔

''نبیل! تم آ گئے؟'' پروین کے اندر جیسے خوشی ناچی۔

اندر جنت بی بی کے کمرے سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔پروین دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔اندر جانے کی ہمت اس میں نہیں ہو پا رہی تھی۔شاید وہ اندر نہ ہی جا پاتی مگر ایک دم جیسے کوئی ریلہ سا آیا اور اسے بہاتا ہوا اندر لے گیا۔ایک لمحے کے لیے جیسے کائنات کی گردش تھم گئی۔دو حسین جھیل کی سی آنکھیں تھیں جو ایک چہرے پہ جم کر رہ گئی تھیں۔پروین پلکیں جھپکنا بھول گئی تھی۔ایسا شاید دو چار سیکنڈ کے لیے ہوا تھا مگر یوں لگتا تھا۔ان دو چار سیکنڈوں میں صدیاں سما گئی ہیں۔پروین کا پورا وجود جیسے چشمہ بن گیا تھا۔یہ نبیل کو کیا ہو گیا تھا جب وہ یہاں سے گیا تو ایسا تو نہ تھا۔اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔گالوں سے اوپر کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔جسم بہت کمزور ہو چکا تھا۔جنت بی بی اس کے سرہانے بیٹھی نمناک آنکھوں سے اس کا بازو دبا رہی تھی اور وہ بار بار جنت بی بی کو منع کر رہا تھا۔

''پروین! کیسی ہو؟'' نبیل پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''ٹھ..........ٹھیک ہوں۔'' بڑے دکھ کے ساتھ پروین بولی اور چار پائی پر بیٹھ گئی۔

نبیل کی ایسی حالت دیکھ کر پروین کا دل رو رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا نبیل کو اپنے وجود میں سمیٹ کر دور کہیں لے جائے۔ دن رات اس کی خدمت کرے اور تب تک واپس نہ لوٹے جب تک وہ پہلے والا نبیل نہ بن جائے۔ پہلے والا ہنستا مسکراتا اور مذاق کرتا نبیل.........

''پھپھو! یہ پروین آگے سے کچھ دبلی نہیں ہوگئی؟ آپ اسے کھانا کم دیتے ہیں؟''

نبیل مسکرا کر بولا تو جنت بی بی مسکرادی اور نبیل کے بالوں میں انگلیاں پھیر کے بولی۔ ''پتر! بس دن رات سکول کے چکر میں رہتی ہے۔''

''تو اچھی بات ہے ناں پھوپھی! اوروں کے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا تو بہت اچھی اور بھلی بات ہے۔'' نبیل نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔

پروین کے اندر خوشی ایک دم سے پھوٹی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک یکدم بڑھ گئی تھی۔ اس کا نبیل اب اس کے سامنے تھا جیتا جاگتا ہنستا مسکراتا نبیل۔ ہاتھ بڑھا کر وہ اسے چھو سکتی تھی۔ یکبارگی پتہ نہیں کیوں سیداں مائی کا چہرہ پروین کی آنکھوں میں لہرا گیا۔ اس کے تن بدن میں چنگاریاں سی پھوٹ گئیں۔ رگ جاں جلنے لگی۔ آنکھوں کی مہین سرخی میں تارے سے ٹمٹمانے لگے۔ اس لمحے ایک بے نام سی بے خودی نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔ اس کا دل مچل رہا تھا کہ وہ تمام شرموں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تڑپ کر نبیل کے سینے لگ جائے اور پھر ایسے میں عمر گزر جائے۔ سسکیاں، آنسو اور گرم سانسیں ہی زبان بن جائیں اور خاموشی کی بھی ایک زبان ہوتی ہے۔

''سلام علیکم باجی جی! میں باؤ نبیل کا یار ہوں۔'' شیدا بولا تو پروین بری طرح چونک گئی۔ جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ پروین نے سلام کا جواب دیا تو پروین کے چونکنے سے سب ہنسنے لگے۔ پھر ان کے دیکھا دیکھی شرمندگی سے پروین بھی ہنسنے لگی۔

''بیٹا! حسن کو ساتھ کیوں نہیں لے کر آئے اور حسن کی والدہ کو۔'' جنت بی بی کا سوال ہتھوڑا بن کر پروین کی سماعت سے ٹکرایا تھا۔ وہ اپنی خوشی اور محبت میں یہ بھلا ہی بیٹھی تھی کہ نبیل کی ایک بیوی بھی ہے ایک بچہ بھی ہے۔ بے چارگی کے کئی کم بخت آنسو قطرہ قطرہ پروین کے حلق میں گرنے لگے۔ وہ ایک دم جیسے ہوش کی دنیا میں آگئی تھی۔

جنت بی بی کے سوال پر شیدا آگے سے کچھ بولنا چاہتا تھا مگر نبیل نے اشارے سے اسے منع کر دیا تھا اور خود بولا کہ ''کچھ مصروفیت کی وجہ سے وہ دونوں نہیں آسکے۔''

جنت بی بی نے جو بات شروع کی تھی اس کا ٹھیک ٹھاک شاک پروین کو پہنچا تھا۔ پاؤں میں چبھے کانٹے بھی اب بے انتہا تکلیف دینے لگے تھے۔ تکلیف کی شدت سے لمبی گہری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں تھیں۔ نبیل پروین کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

''پروین! کیا ہوا تمہیں؟'' نبیل پریشانی سے بولا۔

نبیل کے اتنا کہنے کی دیر تھی۔ پروین زاروزار رونے لگی۔ جنت بی بی تیزی سے اٹھ کر پروین کے پاس آئی تھی۔

پروین نے اپنے دونوں پاؤں نیچے جھک کر تھام لیے تھے۔

''کیا ہوا پتر! کیوں روتی ہے؟'' جنت بی بی نہایت دکھ کے ساتھ بولی۔

وہ جانتی تھی پروین کے رونے کا سبب کیا ہے۔

''ماں! پاؤں میں درد ہو رہی ہے۔'' وہ ایک پاؤں اپنی ران پہ رکھ کر بولی۔ اسے جیسے رونے کا بہانہ میسر آ گیا تھا۔

''ہائے میں مرگئی.......... یہ کانٹے کہاں سے لگے؟'' جنت بی بی نے پاؤں اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

نبیل بھی زور لگا کر بستر سے اٹھ بیٹھا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے وہ ابھی رو دے گا جب سے پروین اس کے سامنے آ کر بیٹھی تھی۔ دنیا اس کی آنکھوں میں ایک دفعہ پھر سے خوبصورت ہوگئی تھی۔ زندگی ایک دفعہ پھر سے متحرک ہوگئی تھی۔ خوبصورتی پھر سے خوبصورت دکھنے لگی تھی۔ نبیل کا دل چاہا کہ جلدی سے اٹھ کر پروین کے پاس بیٹھ جائے اتنا پاس کہ جہاں صرف اور صرف پروین ہو۔ اس کے آس پاس دائیں بائیں کچھ نہ ہو۔ وہ پروین کے بدن کے سارے کانٹے چن لے۔

''پروین! تم تو اتنی بہادر لڑکی ہو۔ پھر بھی رو رہی ہو۔'' نبیل پروین کا حوصلہ بڑھانے کے لیے بولا۔ پروین روتے روتے جیسے ایک دم سے چپ کرگئی۔

''نبیل! میں تو دل میں چبھے کانٹوں کی وجہ سے رو رہی ہوں۔ تمہیں کیسے بتاؤں؟ تم کبھی نہیں سمجھو گے.......... کبھی بھی نہیں جان سکو گے۔ میں نے تمہیں چاہا نہیں تمہاری پوجا کی ہے۔'' وہ دل ہی دل میں بولی۔

''بہادر لوگ تو اوروں کو حوصلہ دیتے ہیں خود تو نہیں روتے۔'' نبیل نے یہ بات طنز کرتے ہوئے کہی تھی مگر پروین کے دل کو یہ بات چھوگئی تھی۔ اسنے اسکا اور ہی مطلب اپنے ذہن میں بٹھالیا۔ بہادر لوگ اوروں کو حوصلہ دیتے ہیں۔ نبیل کو میری مدد کی ضرورت ہے۔ مجھے نبیل کو حوصلہ دینا ہے۔ خود نہیں رونا اسے زندگی کی طرف لانا ہے۔ نبیل اور جنت بی بی کی باتوں سے اسے پتہ چل چکا تھا کہ نبیل کو ٹی بی کی کوئی بیماری لاحق ہوگئی ہے۔

پروین نے دل میں پکا عہد کرلیا تھا کہ وہ اب نہیں روئے گی اور نبیل کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنے کی کوشش کرے گی۔ جنت بی بی سے پروین کے پاؤں سے جتنے کانٹے نکل سکے اس نے نکال دیئے اور پھر اپنا ایک پرانا دوپٹہ اس کے پاؤں پر دونوں طرف لپیٹ دیا۔

جب پروین کو پتہ چلا کہ نبیل یہاں کافی دن رہے گا تو وہ باؤلی سی ہوگئی۔ وہ زخمی پاؤں سے گھر بھر میں بھاگی پھرتی تھی۔ سکول اس نے پیغام بھجوا دیا تھا کہ وہ سکول نہیں آ سکے گی۔ پاؤں زخمی ہونے کا بہانہ بھی بن گیا تھا۔

پروین اپنی ضروری اشیاء نیچے لے آئی تھی۔ پروین والا کمرہ نبیل اور شیدے کے لیے خالی کردیا گیا تھا۔ بار بار تشکر کے آنسو جنت بی بی کی آنکھوں میں چمکنے لگتے تھے۔ وہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر بجالائی تھی۔ نبیل کے آنے کی خبر سن کر دین محمد بھی کھیتوں سے چلا آیا تھا۔ وہ بھی بڑے والہانہ انداز سے اس سے ملا تھا۔ پھر آنے والے دنوں میں دین محمد کے گھر لوگوں کا ایسا تانتا بندھا کہ جنت بی بی بھی چکرا کے رہ گئی۔ بشیر کمہار، دینو موچی، شرفو نائی، دتہ ترکھان، میاں جی، چاچا حیات، صدیق ٹینڈ اور ایسے ہی اور بوڑھے نبیل کا پتہ لینے والوں میں شامل تھے۔ حسنا ایک دفعہ پھر سویر پور کے طول و عرض میں جاگ اٹھا۔ شیدے کی پہلی ملاقات میں ہی صدیق ٹینڈ کے ساتھ یاری بن گئی تھی۔ وہ بڑی یخ بستہ صبح تھی۔ شیدے نے گرم چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ صدیق ٹینڈا اسے گھر سے لینے آیا تھا۔ کل شام ہی اس نے شیدے سے کہا تھا کہ صبح میرے ساتھ چلنا تمہیں گڑ اور شکر بنتی ہوئی دکھاؤں گا۔

اس لیے آج صبح سویرے ہی صدیق آ دھمکا تھا۔

''اوے یار! میں تو سمجھا تھا تجھے پکی نیند سے اٹھانا پڑے گا مگر تو تو جیسے میرے انتظار میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔'' صدیق ٹینڈ شیدے کی پشت پر ہاتھ مار کے بولا۔

''ہم جس کے یار بن جاتے ہیں ناں.........بس پھر یار ہی بن جاتے ہیں۔'' شیدا چادر کی بکل ٹھیک کرتے ہوئے بولا۔

دونوں کچے راستوں اور پیلیوں کے بیچوں بیچ ہوتے ہوئے بیلنے کی طرف ہو لیے۔

کچے راستوں کے اطراف اور پیلیوں کے نزدیک جابجا کوڑا گرا ہوا تھا۔ آسمان ابھی ٹھیک طرح سے صاف نہیں ہوا تھا۔ اندھیرے کا غلاف آہستہ آہستہ مدہم ہونا شروع ہو چکا تھا۔ ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جلد ہی وہ دونوں بیلنے کے پاس پہنچ گئے۔

''یار! یہاں تو بڑا سکون ہے۔'' شیدا جلتی ہوئی آگ کے اوپر رکھے بڑے سے کڑاہے کے پاس بیٹھ کر بولا۔

''تو یہاں بیٹھ میں ابھی آیا۔'' صدیق نے کہا اور دوسری طرف چل دیا۔

☆............☆............☆

پروین کو پتہ تھا کہ شیدا بیلنا دیکھنے گیا ہے۔ دو تین گھنٹے سے پہلے نہیں لوٹے گا۔ وہ بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھی تھی۔ انہی سیڑھیوں کے ایک طرف کھڑی ہو کر وہ چاند دیکھا کرتی تھی اور آنسو بہایا کرتی تھی مگر قدرت نے چاند آج اس کے آنگن میں اتار دیا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہوئے اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ نبیل منہ رضائی میں گھسیڑے سو رہا تھا۔ پروین نے موٹی چادر سے اپنا جسم ڈھانپ رکھا تھا مگر پھر بھی اس کا جسم سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ اس کے مرمریں پاؤں بڑی آہستگی کے ساتھ کچی زمین پر پڑ رہے تھے۔ پروین اس کی چارپائی کے ساتھ ہی رکھی کرسی پر آرام سے بیٹھ گئی اور کتابوں والی شیلف میں سے یوں ہی بے مقصد کتابیں ڈھونڈنے لگی۔ اس کے ہاتھ کتابوں سے کھیل رہے تھے جبکہ نگاہیں رضائی پہ جمی ہوئی تھیں۔ سینے کے زیروبم سے سانس کی تیز روانی کا پتہ چل رہا تھا۔ اس نے رضائی کی طرف ہاتھ بڑھائے اور پھر گھبرا کر واپس کھینچ لیے۔ اسکے سینے میں بڑے زور شور سے اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ کانوں کی لَوویں گرم ہو گئیں تھیں۔ جسم میں سے جیسے سینک نکلنے لگا تھا۔ اس نے دوبارہ ہمت کی اور رضائی میں ہاتھ گھسیڑ دیا۔ نبیل کا منہ ایک طرف کو ڈھلکا ہوا تھا۔ پروین نے اپنا ہاتھ نبیل کے گال اور کندھے کے درمیان دھر دیا۔ کتنے ہی قیامت کے لمحے گزر گئے۔ پروین زاروزار روئے جا رہی تھی۔ بچپن کی زندگی پروین کی نگاہوں میں گھومنے لگی۔ وہ ہر ایک کی آنکھوں کا تارا تھی۔ سارا گاؤں ہلکی سبز آنکھوں والی اس بچی سے پیار کرتا تھا۔ وہ جہاں ماں باپ کی چہیتی تھی وہاں بھائیوں کی جان بھی اس میں اٹکی رہتی تھی۔

وہ ہر وقت ہنسنے مسکرانے پھول اور تتلیوں سے کھیلنے والی لڑکی تھی۔ اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ غم کیا ہوتا ہے؟ تکلیف کس بلا کا نام ہے؟ پھر نبیل محض ایک اتفاق سے گاؤں آیا اور پروین کی پُرسکون زندگی کو سینکڑوں طوفانوں سے آشنا کر کے چلا گیا۔ ایسے طوفان جن سے چھٹکارا پروین کے لیے ناممکن ہو گیا تھا۔ اب بھی وہی طوفان پروین کا گھیراؤ کیے ہوئے تھے۔ وہ اس کے بالکل قریب ہونے کے باوجود اس کا نہیں تھا۔ وہ کسی اور کا تھا۔

اسے تھوڑے دن یہاں رہنا تھا پھر شاید فراق کے مہیب جہنم میں ایک دفعہ پھر اسے دھکیل کر واپس چلے جانا تھا۔ پروین نے ماں کو قسم دی تھی کہ وہ کبھی نبیل کو نہیں بتائے گی کہ وہ اسے چاہتی ہے۔

نبیل نے کروٹ لی تو پروین نے جلدی سے اپنا ہاتھ رضائی سے باہر کھینچ لیا۔ رضائی نبیل کے چہرے سے ہٹ گئی تھی۔ نبیل کا چہرہ پروین کی طرف ہو گیا تھا۔ وہ ابھی تک بے خبر سویا ہوا تھا۔ پتہ نہیں ایک دم پروین کو کیا ہوا۔ وہ بے اختیار سی ہو کر پائنتی کی طرف بڑھی۔ نبیل کا ایک پاؤں رضائی میں سے نکلا ہوا تھا۔ اس نے اپنا سر جھکایا۔ غیر ارادی طور پر اس کے ہونٹ نبیل کے پاؤں کے جلتے ہوئے تلوے سے چھو گئے۔ گرم آنسو اس کے رخساروں پر بہتے چلے جا رہے تھے۔ پھر وہ نمناک آنکھیں لیے نیچے آ گئی اور بھوری بھینس کی چھپر کی طرف ہولی۔ جنت بی بی چکی پر آٹا پیس رہی تھی۔

''پروین پتر! کدھر تھی تُو..........'' جنت بی بی نے کھڑ کا سن کر باورچی خانے سے ہی آواز لگائی۔ پروین گڑبڑا سی گئی۔ ''ادھر ہی تھی ماں..........'' اس نے بہانا بنایا۔ اسے خدشہ تھا کہیں ماں نے اسے نیچے اترتے دیکھ نہ لیا ہو۔

''اِدھر آ پتر! میری بات سن..........'' پروین ڈری ہوئی باورچی خانے پہنچی۔ ''جا اوپر جا..........نبیل کو اٹھا کر وہیں پلنگ پر ہی اس کا منہ ہاتھ دھلا دے۔''

پروین کے دل میں جیسے کوئی چٹکیاں لینے لگا۔ اس نے پانی کا برتن اور پرات اٹھائی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی اوپر چل دی۔ جیسے کہیں ماں اپنے الفاظ واپس ہی نہ لے لے۔ کمرے میں داخل ہو کر پروین نے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔ ہیجان منہ زور گھوڑے کی طرح اس کے دل و دماغ میں سرپٹ دوڑنے لگا۔ وہ پلنگ پر نبیل کے پاس ہی بیٹھ گئی اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ ''نبیل..........! نبیل..........! اٹھو..........اٹھو..........دیکھو آنکھیں کھولو..........میں تمہیں جگانے آئی ہوں۔''

یکبارگی اس کا دل چاہا سیداں مائی کی طرح نبیل کے سینے سے لگ جائے اور اپنا آپ بھول جائے۔ پھر فوراً ہی اس نے اپنے خیال کو جھٹک دیا۔ نبیل کسمسانے لگا تھا۔ پروین بڑی محویت بڑے پیار سے مسکراتے ہوئے نبیل کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ پروین کو یوں اپنے پاس بیٹھے دیکھ کر نبیل بھونچکا رہ گیا تھا۔

''پپ..........پروین! تم..........'' وہ بڑی کمزور اور نحیف آواز میں بولا۔

''آپ کو جگانے آئی تھی۔ ماں نے کہا تھا۔''

''اگر ماں نے نہ کہا ہوتا؟'' نبیل بازوؤں کے سہارے نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔

''تو پھر..........میں نہ آتی۔'' وہ پانی کے ڈول میں انگلی ڈال کر اس کے گرم ہونے کا اندازہ کرنے لگی۔ ''آپ اٹھ کر بیٹھیں میں آپ کا منہ دھلا دوں۔''

''وہ شیدا کدھر گیا ہے؟'' نبیل بولا۔

''وہ صبح ہی صبح بیلنا دیکھنے صدیق کے ساتھ گیا ہے مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''میرا خیال تھا وہ یہاں ہوتا تو مجھے اٹھا کر بٹھاتا۔'' نبیل آہستگی سے بولا۔

پروین کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔''میں.......... میرا خیال ہے میں ماں کو بلاتی ہوں۔'' پروین تیزی سے مڑی مگر نبیل کی آواز نے اس کا رستہ روک لیا۔

''پروین! میں اتنا بھاری بھی نہیں کہ تمہارے سہارے سے نہ اٹھ سکوں۔'' نبیل عجیب نظروں سے پروین کی طرف دیکھ کر بولا۔

پروین واپس مڑ کر آگے بڑھی اور ایک پہلو پہ جھک کر اس نے نبیل کی کمر پہ ہاتھ رکھا۔ نبیل نے ایک ہاتھ سے پروین کا بازو تھام لیا تھا۔ پروین کے پورے جسم پہ چیونٹیاں سی رینگ گئی تھیں۔ بازو کے بال کھڑے ہو گئے تھے۔ پروین نبیل کو اٹھاتے اٹھاتے اس کے بڑے قریب آگئی تھی۔ اس کی لمبی آنکھوں کی گہرائی میں مچلتے پانی کو نبیل بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی آنکھیں تو تھیں جن کے سوا آج تک نبیل نے کچھ چاہا نہیں تھا۔ کچھ سوچا نہیں تھا۔

''پروین! تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟'' نبیل کا سوال اتنا غیر متوقع اور اچانک تھا کہ پروین سٹپٹا کے رہ گئی۔

کتنی دیر تو اسے کچھ سوجھا ہی نہیں کہ کیا کہے۔ پھر کچھ سنبھل کر بولی۔''تم جو نہیں ملے۔'' پروین کا انداز مزاحیہ تھا۔

نبیل فقط ہنس کے رہ گیا۔''پروین! اگر تم بھی مجھے مل جاتی تو میں تم سے شادی کر لیتا...... مگر تم مجھے ملی ہی نہیں۔'' نبیل بھی ہنس کر بولا۔

نبیل نے پروین کے سامنے یہ بات مذاق میں کہی تھی مگر اداسی اس کے بہت اندر تک گھر کر گئی تھی۔ اس کے دل پہ بڑے زور سے جیسے گھونسہ پڑا تھا۔

''نبیل! آپ حسن اور اسکی والدہ کو لے کر آ جاتے تو کتنا اچھا تھا۔'' پروین غیر ارادی طور پر نیچے بیٹھ کر نبیل کے موزے اتارتے ہوئے بولی۔

نبیل حیرت زدہ سا اس نازنین کو موزے اتارتے ہوئے دیکھتا رہا۔''حسن کی ماں کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ ساتھ نہیں آئی۔'' نبیل نے بہانا بنایا۔

رومی کا ذہن میں آتے ہی نبیل کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں تھیں۔ کتنا بڑا فراڈ کیا تھا اس عورت نے نبیل کے ساتھ.......... اسی صدمے کی وجہ سے وہ آج اس حال کو پہنچا تھا۔ وہ پروین کی طرف بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ کیا اچھا ہوتا کہ پروین کی شادی اس کے ساتھ ہو گئی ہوتی۔ وہ اس کے ہونے والے بچے کی ماں ہوتی۔

''ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟'' پروین نبیل کے پاؤں پر پانی ڈال رہی تھی۔

''سوچ رہا ہوں تم لوگ کتنے اچھے ہو۔''

''نبیل! لوگ سبھی اچھے ہوتے ہیں۔ دیکھنے دیکھنے میں فرق ہوتا ہے۔''

''میں سب کی بات تھوڑا ہی کر رہا ہوں۔ میں تو تمہاری بات کر رہا ہوں۔''

''نبیل! یہ جو خواہش ہوتی ہیں ناں.......... بانس کی طرح ہوتی ہیں کہ ہر لمحہ بڑھتی ہی رہتی ہیں۔ ایک خواہشیں پوری ہو تو دوسری کے پورا ہونے کی فکر لگ جاتی ہے۔''

پروین نے بات کے ساتھ ہی اپنا کام بھی ختم کیا اور اداس سی نیچے کو چل دی۔

☆..........☆..........☆

ٹھٹھری ہوئی صبح ہو چکی تھی۔ شیدا صدیق کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ صدیق کڑاہے میں پڑی گنے کی رد کو لکڑی کی مدد سے ہلا رہا تھا۔ بیلنے کے ساتھ دو بیل جتے ہوئے تھے۔ ان کی پھیر کی وجہ سے بیلنا چل رہا تھا۔

بیلنے کے پہیے سے بندھا گھنگھرو چھنا چھن چھنک رہا تھا۔ گنے بیلنے میں ڈالے جا رہے تھے اور رد بیلنے کے نیچے پڑے ٹین کے کنستر میں جمع ہوتی جا رہی تھی۔ کنستر جونہی بھرتا ایک بندہ اسے کڑاہے میں الٹ آتا۔ کڑاہے کے نیچے چھانوں اور خشک کانوں کی مدد سے آگ جلائی گئی تھی۔

''یار صدیق! یہ گڑ کب تیار ہوگا؟'' شیدا منمنایا۔

''میرے یار دیکھتا جا.......... جونہی اس کڑاہے میں پڑی رو میں پٹاکے بجیں گے تو سمجھو گڑ تیار ہونے کے قریب ہے۔'' صدیق سوڈا رو میں پھینکتے ہوئے بولا۔

''یہ تو نے اس میں کیا پھینکا ہے؟'' شیدا بولا۔

''بیلنا! یہ سوڈا ہے اور یہ رنگ کاٹ ہے۔ گڑ اور شکر صاف کرنے کے لیے اب دیکھنا رو کا سارا میل کڑاہے کے اوپر آ جائے گا۔''

دیکھتے ہی دیکھتے رو کا میل اوپر آنے لگا۔ صدیق ٹینڈ ایک کڑچھے کی مدد سے وہ میل اوپر سے اتارنے لگا۔ جب رو کافی گاڑھی ہوگئی تو اسے لکڑی کے بنے ہوئے چوکٹھے میں انڈیل دیا گیا۔ پھر لکڑی کے کھرپے کی مدد سے اسے ہلایا جانے لگا۔ جب وہ ٹھنڈی ہوگئی تو صدیق کھرپے سے اکھیڑ کر ہاتھ کی مدد سے اس کا لڈو سا بنانے لگا۔ پھر کسی کمہار کی طرح ہاتھ کی مدد سے گڑ کی ڈھیلی بنا کر جب صدیق نے شیدے کے سامنے کی تو وہ حیرانگی سے آنکھیں پٹپٹانے لگا۔

''یار! تو نے تو کمال ہی کر دیا ہے۔'' شیدا خوش ہو کر بولا۔

''شیدے اگر شکر بنانی ہو ناں تو پھر لکڑی کا کھرپا مارتے جاتے ہیں۔ ہاتھ نہیں روکتے پھر شکر تیار ہو جاتی ہے۔''

''یار! رو پی پی کر تو میرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے ہیں۔ بھوک بھی بہت لگ رہی ہے۔'' شیدا پیٹ پہ ہاتھ پھیر کے بولا۔

عین جس وقت بیلنے پر یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ شوکے کے ڈیرے پر شوکا پھیل کر چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا اور گوگا اس کے کندھے دبانے میں مصروف تھا۔ شوکے نے ایک نظر بھٹے پر کام کرتے مزدوروں پر ڈالی۔ پھر آنکھیں بند کر کے سگریٹ کے دو تین لمبے کش لیے اور بے قراری کے عالم

میں اپنا ایک پاؤں ہلانے لگا۔

گوگے نے کہا۔ ''چھوٹے صاحب جی! کیا گل ہے؟ آپ کچھ پریشان لگتے ہیں۔''

شوکے نے کہا۔ ''گل ہے بھی پریشانی کی.......... مجھے تو ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں وہ منڈا میرے ہتھوں ضائع ہی نہ ہو جائے۔''

گوگے نے چونک کر کہا۔ ''کہیں آپ حسنے کے پتر نبیل کی بات تو نہیں کر رہے؟''

''ہاں.......... اس لمڈھینگ کی بات کر رہا ہوں۔ تجھ سے میں دل کی بات سچ سچ کہہ دیتا ہوں گوگے.......... اور سچی بات یہی ہے کہ اب میرے اندر برداشت بہت کم ہو گئی ہے۔ میں نہیں سہہ سکتا کہ کسی کا سایہ بھی پروین پر پڑے اور وہ شہری باؤ تو انکے گھر میں ہی رہنا شروع ہو گیا ہے۔''

گوگے نے کہا۔ ''ہاں جی۔ یہ معاملہ تو مجھے بھی کچھ گڑبڑ لگتا ہے۔ بندہ پوچھے اگر وہ بیمار تھا تو ادھر ولایت میں ہی رہتا۔ وہاں بھیڑی سے بھیڑی بیماری کا علاج بھی ہو جاتا ہے۔ یہاں پھوپھو کی کچھ (بغل) میں گھسنے کیوں آ گیا ہے؟ سنا ہے کہ پینو اس کی خدمت میں لگی ہوئی ہے۔ جوان جہان لڑکی والے گھر میں جوان جہان منڈے کا کیا کام؟''

''بس اسی لیے کہہ رہا ہوں نا.......... کہ کہیں یہ منڈا میرے ہتھوں ضائع نہ جائے۔''

گوگے نے بڑی گہری نظروں سے شوکے کی طرف دیکھا اور پھر ذرا جھجکتے ہوئے بولا۔ ''ویسے صاحب جی! ابھی آپ نے میرے بارے میں جو بات کی ہے وہ میرے دل کو کچھ لگی نہیں۔''

''اوئے کون سی بات گھوڑے؟''

''یہی کہ آپ مجھ سے کچھ بھی چھپاتے نہیں ہیں۔''

''کیا چھپایا ہے کس نے تجھ سے؟'' شوکا سگریٹ کا لمبا کش لیتے ہوئے بولا۔ اس کا موڈ گوگے کی بات پر خراب نہیں ہوا تھا۔

اس کے موڈ کو دیکھ کر گوگے نے ہمت کی اور بولا۔ ''کبھی کبھی آپ بات چھپا لیتے ہیں جی۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً دو مثالیں ہیں جی میرے پاس۔''

''اوئے کچھ بکواس بھی کر۔'' شوکے نے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

''میرا دل کہتا ہے جناب کہ فضلو چاچے کے بیٹوں نوری اور جھوری کو پھینٹی آپ نے ہی لگوائی تھی.......... میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔''

شوکے کے ہونٹوں پر ایک مدہم سی زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ وہ گوگے کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ''ہاں دوسری بات کون سی ہے؟''

گوگا بولا۔ ''اور میرا خیال ہے جناب کہ..........''

''ہاں ہاں بول نا۔'' شوکا اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میرا خیال ہے کہ شہر سے واپس آتے ہوئے جن ڈاکوؤں نے آپ کا رستہ روکا تھا۔ وہ بھی آپ کے......... اپنے ہی بندے تھے.........اس طرح سے آپ نے پینو کے دل میں اپنے لیے تھوڑی سی تھاں بنانے کی کوشش کی تھی۔''

شوکے نے گوگے کو گھور کر دیکھا۔ گوگے نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ کرنے کو تو اس نے بات کر دی تھی لیکن اسے پتہ نہیں تھا کہ شوکے کا رویہ کیا ہوگا۔ شوکا کچھ دیر تک تو اسے گھورتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں سے ایک قہقہہ نکلا۔

اسنے گوگے کی گردن دبوچ کر اسے آگے پیچھے جھلایا اور بولا۔ ''ویسے تو ہے بڑا کتے کا تخم۔ کھچر اپن تیرے اندر کٹ کٹ کر بھرا ہوا ہے۔''

اپنی تعریف پر گوگے کا رنگ لال ہو گیا۔ وہ پھر سے شوکے کے کندھے دبانے لگا۔ شوکے نے نیا سگریٹ سلگا کر اس سے کئی گہرے کش لیے اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ماتھے کی موٹی رگ ابھری ہوئی تھی۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا؟

گوگا اچھی طرح جانتا تھا کہ شوکا اندر سے کیا شے ہے؟ اندر سے وہ بڑا زہریلا اور آگ کے بھانبڑ جیسا تھا لیکن اوپر سے اس نے اپنے آپ کو ٹھنڈا رکھا ہوا تھا۔ خاص طور سے پروین کے سامنے تو وہ بالکل ہی ٹھنڈا ٹھار ہو کر رہتا تھا۔ اس کی ضد تھی کہ وہ پروین کو اپنی طاقت سے نہیں، پروین کی مرضی سے جیتے گا۔ اس ضد کی خاطر ہی وہ پروین کے ساتھ نرم لہجے میں بات کرتا تھا اور میٹھا میٹھا رہتا تھا۔ گوگا اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نہ نکلا تو پھر انگلیاں ٹیڑھی کرنے میں بھی شوکا زیادہ دیر نہیں لگائے گا اور جس دن اس نے انگلیاں ٹیڑھی کیں پینو اور اس کے گھر والوں کے لیے وہ بڑی مصیبت کا دن ہوگا۔

☆..........☆..........☆

پروین ان دنوں بالکل دیوانی سی ہو رہی تھی۔ اس کے پاؤں تو جیسے زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ وہ چلتی تھی تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ہوا پر چل رہی ہے۔ اسے اپنے بدن سے ایک مہکار سی آتی تھی اور دل سینے میں لالڑی کی طرح پھڑ پھڑاتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتی بھی تھی، وہ کیوں اس طرح کملی سی ہو رہی ہے؟ نبیل آیا تو ہے مگر اس کے لیے تو نہیں آیا۔ وہ تو اس کا ہے ہی نہیں۔ اس کا ویاہ تو مامے کی دھی سے ہو چکا ہے۔ اب نبیل اور اس کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا بڑی نہر کے دو کناروں کے درمیان۔

مگر دل پاگل تھا، وہ کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ اس دل کے لیے یہی خوشی بہت تھی کہ نبیل اس کے گھر میں ہے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ وہ اس کی آواز سن لیتی ہے۔ اس کی سانسوں کی خوشبو اپنی سانسوں میں اتار لیتی ہے۔ اس کے سوا اسے اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔ ماں کن اکھیوں سے پروین کی حرکات وسکنات دیکھتی تھی۔ وہ پروین کی راز دار تھی۔ اس کے دل کی کیفیت کو سمجھتی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی آنکھیں ہر وقت روئی روئی نظر آتی تھیں۔ اپنی کملی سے بیٹی کی ناتمام آرزوؤں کا خیال اس کے احساس کو کچوکے لگاتا تھا۔

اس روز بھی مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد پروین جلدی جلدی تندور پر روٹیاں لگانے چلی گئی۔ اسے پتہ تھا کہ نبیل کو کھانا جلدی دینا ہے

کیونکہ اس نے آٹھ بجے تک دوا کی تیسری خوراک کھانی ہے۔ روٹیاں لگا کر وہ واپس آئی۔ جلدی جلدی نبیل کے لیے آلو گوشت کا سالن نکالا۔ ساتھ ہی گاجر، شلجم اور ٹماٹر کی سلاد بھی رکھی۔ کاڑنی (بڑی ہانڈی) میں سے نیم گرم دودھ کا بڑا گلاس نکالا۔ اس میں اپنے گورے گورے ہاتھوں سے شکر ملائی اور کھانے کی ٹرے لے کر نبیل کے کمرے میں پہنچ گئی۔ نبیل کو گاؤں میں آئے ابھی صرف سات آٹھ دن ہی ہوئے تھے مگر اتنے دنوں میں ہی اس کی باہر نکلی ہوئی ہڈیوں پر تھوڑا تھوڑا ماس چڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ اب بغیر سہارے کے بیٹھ سکتا تھا اور شیدے یا پروین کے سہارے کمرے کے اندر ہی قدم قدم چل بھی لیتا تھا۔

شیدا اپنے ''یار'' صدیق ٹنڈ کی طرف گیا ہوا تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ ایک دو راتیں صدیق کے گھر مہمان خصوصی بن کے رہے گا۔ پروین نے ٹرے میز پر رکھی۔ بستر پر ہی نبیل کے ہاتھ دھلائے۔ بکرے کی دستی کی بوٹیاں اپنے ہاتھ سے چھوٹی چھوٹی کر کے شوربے میں ملا دیں۔ نبیل چھوٹے چھوٹے لقمے لینے لگا۔ وہ جیسے غیر ارادی طور پر نبیل کے ہاتھ کی حرکات دیکھ رہی تھی۔ وہ دیکھنے میں اتنی مگن تھی کہ جب نبیل نے کھنکورا مار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ چونک سی گئی۔

''کہاں کھو گئی ہو؟'' نبیل نے کمزور آواز میں پوچھا۔

''کہیں نہیں۔ آپ کے پاس ہی تو ہوں۔''

نبیل نے ایک گہری سانس لی اور اداسی سے بولا۔ ''کاش تم میرے پاس ہوتیں۔''

''آ.........آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''کچھ نہیں.........تھوڑا سا پانی گلاس میں ڈالنا۔'' نبیل نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

نبیل کو گلاس تھماتے ہوئے پروین کی انگلیاں نبیل کی انگلیوں سے ٹکرائیں اور ایک بار پھر پروین کے رگ و پے میں ایک برقی لہر سی دوڑی اور یہ کوئی پہلا موقعہ نہیں تھا۔ جب سے نبیل آیا تھا درجنوں مرتبہ ایسا ہو چکا تھا اور یہ کیفیت صرف پروین کی نہیں ہوتی تھی۔ پروین نے اندازہ لگایا تھا کہ نبیل بھی ایسے موقع پر ٹھٹک سا جاتا ہے۔ پھر کوئی شے ایک دم سے اسے نادم کر دیتی تھی۔

نبیل کو اپنے ہاتھوں سے دوا کھلانے کے بعد پروین نیچے چلی گئی۔ جاتے جاتے وہ نبیل کے پاس پانی کا گلاس اور درد کی دوا کی گولیاں رکھنا ہرگز نہیں بھولی تھی۔ نیچے آ کر اس نے جلدی جلدی گھر کے باقی کام نبیڑے، عشاء کی نماز پڑھی، بستر بچھائے، ابے کو چائے بنا کر دی۔ ماں کو کھانسی کی دوا پلائی۔ دروازے بند کیے۔ لالٹینوں کی لو نیچی کی اور تھکی ہاری سی بستر پر لیٹ گئی۔ لیٹ کر بھی اس کا دھیان سیڑھیوں کی طرف ہی رہتا تھا۔ اگر رات کو کسی وقت نبیل ہلکی سی آواز بھی دیتا تھا تو پروین ایک سیکنڈ میں اس کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ آج شیدا بھی نہیں تھا لہٰذا پروین کی آنکھوں میں نیند کوسوں دور تھی۔ ماں کھانسی کی دوا کھا کر سو گئی تھی مگر پروین مسلسل جاگ رہی تھی۔ اسے وہم ہو گیا تھا کہ اس نے نبیل کا لحاف کھول کر اس کی ٹانگوں پر دیا ہے یا بھول گئی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ دوا کھانے کے بعد نبیل کو فوراً نیند آ جاتی ہے۔ اب اگر وہ سو گیا تھا تو پتہ نہیں کب تک لحاف کے بغیر ہی پڑا رہتا۔

کافی دیر تک اپنے وہم سے لڑنے کے بعد وہ لاچار ہو کر اٹھی اور ننگے پاؤں بلی کی چال چلتی نبیل کے کمرے میں پہنچ گئی۔ لالٹین کی مدھم

روشنی میں وہ گہری نیند سو رہا تھا۔اس کے بوجھل سانسوں کی مدہم آواز سنائی دے رہی تھی۔ چند بال اس کی پیشانی پر منتشر تھے۔ ہونٹوں کے درمیان ایک باریک سی درز تھی۔ وہ بہت کمزور ہو چکا تھا۔ پھر بھی اس کے چہرے پر ایک حسین اجالے کا کھوج ملتا تھا۔ پروین اسے دیکھتی رہی اور بس دیکھتی رہی۔اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ پھر پتہ نہیں اسے کیا ہوا۔وہ بڑی آہستگی سے نبیل کے پاؤں کی طرف بیٹھ گئی۔لحاف کھلا ہوا تھا اور اس کی ٹانگوں پر موجود تھا۔تھوڑا سا لحاف اٹھا کر پروین نے اپنے ہونٹ نبیل کے پاؤں سے لگا دیئے۔ وہ اس کے پاؤں چوم رہی تھی، بڑی آہستگی اور بڑی نرمی سے۔اس کے بھیگے رخسار نبیل کے تلوؤں سے مس ہو رہے تھے۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔ پھر اسے لگا کہ وہ اپنی ہچکیاں روک نہیں سکے گی اور نبیل کے جاگنے کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنا منہ دبا کر اٹھی اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔ آنسو لگا تار اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے جا کر بستر پر لیٹ گئی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ ماں جاگ رہی ہے۔ وہ بری طرح ٹھٹک گئی۔

''کہاں گئی تھی؟'' ماں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

''وہ.........وہ نبیل کو دیکھنے۔ مجھے لگا تھا کہ شاید میں نے ان کی رضائی نہیں کھولی ہے۔''

ماں نے کھوئی کھوئی سی آواز میں کہا۔''آج مجھے ایک گل کا پتہ چلا ہے پینو۔''

''کیسی گل ماں؟'' پروین نے چونک کر کہا۔

''نبیل کی اپنی بیوی سے طلاق ہو چکی ہے۔''

یہ ایک ششدر کر دینے والا انکشاف تھا۔ پروین بھونچکی رہ گئی۔''مم.........ماں! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں پینو۔ آج جب تم اسکول گئی تھی۔ میں برآمدے کی صفائی کرنے اوپر گئی تھی۔ میں نے شیدے کو نبیل سے باتیں کرتے سن لیا۔ بس ایک دو باتیں ہی میرے کانوں میں پڑیں۔ پھر میں جلدی سے نیچے آ گئی۔''

ماں کچھ اور بھی بتا رہی تھی.........مگر پروین کے کانوں میں تو جیسے ایک تیز آندھی چل رہی تھی۔ اس آندھی میں غم کی شوکر بھی تھی اور آنسوؤں کا پانی بھی.........اس کا دل عجیب سے انداز سے دھڑک رہا تھا۔

☆.........☆.........☆

بینر

اگلے دو تین ہفتے میں حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہوئے۔ حیران کن طور پر نبیل خود کو توانا اور صحت مند محسوس کر رہا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے یوں لگتا تھا جیسے وہ اسی مٹی اور اسی زمین کا پودا تھا۔ اسے یہاں سے اکھاڑ کر لندن کی پتھریلی زمین میں گاڑ دیا گیا تھا جہاں وہ دن بدن سوکھ رہا تھا۔ مر رہا تھا......... اب وہ پھر سے اپنی جنم بھومی میں آ گیا تھا اور اس کے مردہ تن میں جان دوڑنے لگی تھی۔

اس کی تیزی سے بہتر ہوتی ہوئی صحت میں جہاں صاف آب وہوا اور خالص خوراک کا عمل دخل تھا وہاں پروین کی اور پھپھو کی والہانہ محبت بھی کارفرما تھی اور بات صرف پروین اور پھپھو کی محبت ہی کی نہیں تھی۔ یہ پورا گاؤں ہی اس کے لیے حیات بخش پیار کا سرچشمہ تھا۔ گاؤں کے لوگ جب اس کی طرف دیکھتے تھے تو انہیں نبیل میں حسنے کی شبیہہ نظر آتی تھی اور ان کی آنکھوں میں امڈتا ہوا پیار کچھ اور بھی بیکراں ہو جاتا ہے۔

نبیل نے اب چلنا پھرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر آہستہ آہستہ صحن میں آ جاتا تھا۔ پھوپھو کو دودھ بلوتے دیکھتا تھا۔ چاٹی میں لسی رڑکتے دیکھتا تھا اور پروین کو ہوا کی سی سبک رفتاری سے گھر میں گھومتے پھرتے اور کام کرتے دیکھتا تھا۔ جب اس کی نگاہ پروین پر پڑتی تھی تو کچھ دیر کے لیے جم کر رہ جاتی تھی۔ وہ اپنی تمام تر جسمانی کشش اور دیہاتی معصومیت کے ساتھ اس کی آنکھوں کے راستے اس کے دل میں اتر جاتی تھی۔ مگر پھر اگلے ہی لمحے نبیل خود کو سنبھالتا تھا اور اپنی نظر کھینچ کر پروین کی طرف سے پھیر لیتا تھا۔ اسے اب کوئی حق نہیں تھا پروین کی طرف دیکھنے کا......... اور اس کے بارے میں کچھ بھی سوچنے کا۔ یہ حق اس نے اسی لمحے کھو دیا تھا جب اس نے اپنی ماما کی زندگی بچانے کے لیے رومی سے شادی کی حامی بھری تھی۔ پروین اور وہ اب دو مختلف راستوں کے مسافر تھے۔ پروین ایک کنواری الہڑ دوشیزہ تھی......... وہ ایک بچے کا باپ ایک طلاق یافتہ شخص تھا۔ وہ اب کسی طور بھی پروین کے قابل نہیں رہا تھا۔

اس کی یہی سوچیں تھیں جو پروین کے قریب ہوتے ہوئے بھی اسے پروین سے بہت دور رکھتی تھیں۔ تنہائی میں وہ اکثر پروین سے نظریں چرائے ہی رکھتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ پروین سے مختصر بات کرے۔ اپنی بیوی کو طلاق دینے والی بات اس نے کچھ دن تو پھوپھو، پروین اور پھوپھا سے چھپائے رکھی تھی......... لیکن پھر اس نے انہیں تادیر اندھیرے میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مناسب الفاظ میں اس نے تقریباً سبھی کچھ پھوپھو اور پھوپھا کے گوش گزار کر دیا تھا۔

کسی وقت نبیل کو یوں محسوس ہوتا تھا کہ پروین اب بھی اسے انہی نگاہوں سے دیکھتی ہے جن نگاہوں سے پچھلی ملاقات میں دیکھا کرتی تھی۔ وہ پہلی بار گاؤں آیا تھا اور پروین کی آنکھوں میں اسے اپنے لیے ایک ایسا محبت بھرا خوبصورت پیغام نظر آیا تھا۔ جس سے نگاہیں چرانا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔ نبیل کو یوں لگتا تھا کہ پروین کی آنکھوں میں شاید آج بھی اس کے لیے ویسا ہی پیغام اور ویسا ہی موسم پوشیدہ ہے۔ اس سے بات کرتے ہوئے پروین کی سانس چڑھ سی جاتی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں خفیف لرزش نمودار ہوتی اور پلکیں جھکی رہتیں۔ کسی وقت دونوں کے ہاتھ آپس میں چھوتے تو پروین کے چہرے پر ایک رنگ سا لہرا جاتا۔ نبیل کو یوں محسوس ہوتا جیسے پروین اس سے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں سکتی۔ اسے کچھ محسوس کرانا چاہتی تھی، کچھ جتانا چاہتی تھی، کچھ یاد دلانا چاہتی ہے۔ پھر کسی وقت نبیل سوچتا شاید یہ سب اس کی خام خیالی ہے......... وہم ہے......... ورنہ پروین جیسی سمجھدار اور دانا لڑکی کو کیا ضرورت ہے ایک ٹھکرائے ہوئے شخص کی خاطر خود کو جذبات کے بھنور میں دھکیلنے کی۔

نبیل نے ایک دو بار گھر سے باہر بھی قدم رکھا تھا۔ اپنے پھوپھا دین محمد کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دائرے تک پہنچا تھا۔ پورے گاؤں کی رونق جیسے ایک دم سے دائرے میں جمع ہو گئی تھی۔ ان گنت جانے پہچانے چہرے اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اس کے سر پر اتنے پیار دیے گئے تھے کہ اس کی روح تک سیراب ہو گئی تھی۔ دینو نائی، بشیر کمہار، فضلو چاچا، صدیق ٹنڈ، مستری رمضان اور پتہ نہیں کون کون۔ چاچے حیات کا خون جیسے سیروں بڑھ گیا تھا۔ اس نے نبیل کو اپنے پاس بٹھایا تھا۔ بڑے خلوص کے ساتھ اس کے سر پر سے دو سو روپے وارے تھے اور ٹہری واسوں میں بانٹ دیے تھے۔

آج بھی نبیل کا موڈ ذرا باہر نکلنے کو تھا۔ اس نے شیدے سے کہا۔ ''چل آیار ذرا گھوم کے آئیں۔''

شیدے نے لحاف اور زور سے اپنے گرد لپیٹ لیا اور بولا۔ ''نہ یار! آج مجھ کو تنگ نہ کر، سونے دے۔''

''اوئے باندر! یہ سویرا ہے۔ ساڑھے گیارہ بجے ہوئے ہیں دن کے۔ چل اٹھ یہ نحوستی دور کر۔''

شیدے نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں اور نبیل کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''یار! خدا کے واسطے مجھ کو معاف کر.......... تجھے پتہ ہی ہے کہ رات کو میں کتنی دیر سے سویا تھا۔''

شیدے کی صورت دیکھ کر نبیل کو ترس آ گیا۔ دراصل رات کو اس نے صدیق ٹنڈ کی باتوں میں آ کر دودھ جلیبیاں کھائی تھیں۔ ایک سیر خالص دودھ اس میں تین پاؤ گرما گرم جلیبیاں اوپر سے دو چمچے دیسی گھی کے.......... شیدے کے پیٹ میں شام کو ہی اتھرے گھوڑے دوڑنے لگے تھے۔ رات بارہ بجے تک وہ کوئی بارہ دفعہ لیٹرین میں گیا تھا۔ اب وہ چہرے پر بڑی مسکین سی زردی لیے سو رہا تھا۔ نبیل نے اسے زیادہ تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

سیڑھیاں اتر کر آہستہ آہستہ وہ نیچے صحن میں آیا۔ فجر کی نماز آج پھر چھوٹ گئی تھی۔ وہ پھوپھو اور پروین سے نگاہیں ملاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ وہ ہینڈ پمپ کی طرف بڑھا تو پروین جلدی سے آ کر ہینڈ پمپ چلانے لگی۔ نبیل نے منہ ہاتھ تو دھویا۔ پروین نے کچھ نہیں کہا تھا۔ پھر بھی نبیل نے اپنی صفائی پیش کرنا ضروری سمجھا۔

بولا۔ ''کل سے تم مجھے نماز کے وقت ہر صورت اٹھا دیا کرو۔ تمہیں اجازت ہے اگر میں نہ اٹھوں تو بے شک میری چارپائی الٹ دو۔''

پروین بڑی ادا سے مسکرانے لگی تھی۔ ''ناشتہ لے آؤں؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں بھئی نہیں.......... اب تو دوپہر کا کھانا ہی کھاؤں گا۔''

تھوڑی دیر بعد نبیل نے پھوپھو اور پروین کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھانا کھایا۔ پروین کے ہاتھ کی پکی ہوئی شوربے والی دیسی مرغی اور تندوری روٹی تھی۔ ساتھ میں گڑ والے چاول تھے جن میں سونف اور بادام کی گریاں ملائی گئیں تھیں۔

جس دوران نبیل کھانا کھا رہا تھا۔ جنت بی بی نے دین محمد کے لیے کھانا باندھ دیا تھا۔ مٹی کے کجے میں چاٹی کی نمکین لسی اور مکھن وغیرہ بھی رکھ دیا تھا۔ پروین کھانا لے کر کھیتوں میں جانے کو تیار ہوئی تو نبیل بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔

گاؤں کی سوندھی خوشبو والی گلیوں سے گزرتے ہوئے وہ چھپڑ پر پہنچے اور چھپڑ کے کنارے کنارے چلتے کھیتوں میں آ گئے۔ دین محمد نے دور سے دونوں کو آتے دیکھا تو اس کی جیسے دونوں آنکھیں روشن ہو گئیں............ وہ پسینہ پونچھ کر وہیں ایک وٹ پر بیٹھ گیا اور بڑی محویت سے ان دونوں کو دیکھتا رہا۔ دور تک سرسوں کھلی ہوئی تھی۔ اس سے پرے کماد کے اونچے کھیت تھے اور اس سے آگے لمبے رکھوں کے نیچے چھوٹی نہر بہتی تھی۔

دین محمد کھانا کھاتا رہا اور ساتھ ساتھ نبیل کو فصلوں اور واہی بیجی کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتا رہا۔

کچھ دیر بعد دونوں واپس ہوئے تو سہ پہر ہونے والی تھی۔ نبیل نے نہر کی طرف جانے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ کماد کے کھیتوں کے اندر ایک پگڈنڈی پر چلتے نہر پر پہنچ گئے۔ ہر طرف چمکدار سنہری دھوپ پھیلی تھی جس نے سردی کو بڑی حد تک کم کر دیا تھا۔ دونوں نہر کے کنارے بیٹھ گئے۔ نبیل نے بڑی محویت سے نہر کے چلتے پانی کو دیکھنا شروع کر دیا۔ پروین اس کے قریب بیٹھی تھی لیکن وہ اس سے کہیں بہت دور جا چکا تھا۔ اپنے ہی خیالوں میں مگن ہو گیا تھا۔ پروین گاہے بگاہے کن اکھیوں سے اسے دیکھ لیتی تھی۔

''ہائے میں مرگئی۔'' اچانک پروین کے ہونٹوں سے نکلا۔ ''آپ نے دوپہر والی دوا تو کھائی ہی نہیں۔''

نبیل واقعی بھولا ہوا تھا۔ پروین کی فکرمندی پر وہ مسکرایا۔ اس نے جیب سے گولیوں کا پتا نکالا۔ پروین پاس ہی ایک ہینڈ پمپ سے پانی لے آئی۔ نبیل پتے میں سے گولی نکالنے کی کوشش کر رہا تھا جب اچانک پتا اس کے ہاتھ سے پھسلا اور پانی میں جا گرا۔ نبیل کے ہونٹوں سے ''اوہ'' کی آواز نکل گئی۔

دوائی کا پتا کسی کشتی کی طرح پانی پر بہتا چلا جا رہا تھا۔ پروین نے ایک لمحے کے لیے سوچا پھر بڑے آرام سے پانی میں چلی گئی۔ نبیل کنارے پر بیٹھا اسے روکتا ہی رہ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ دوائی کا پتا پانی میں سے نکال کر لائی تو اس کا لباس شرابور ہو چکا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی اور اپنے کرتے کا دامن نچوڑتی ہوئی اس کے پاس آ بیٹھی۔ نبیل نے پروین کا سراپا دیکھا اور اس کی آنکھوں میں جیسے کوئی شے سلگنے لگی۔ اس کا دل چاہا وہ اسی طرح پروین کو اپنے سامنے بٹھا کر دیکھتا رہے۔ پروین کے ریشمی بالوں سے قطرہ قطرہ پانی گرتا رہے اور اس طرح صدیاں گزر جائیں۔ مگر پھر فوراً ہی اسے اپنی حیثیت اور اپنے مقام کا خیال آیا اور اس نے پروین کی طرف سے نگاہیں پھیر لیں۔

دھوپ بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ دونوں وہاں بیٹھے رہے اور دور کھیتوں میں کام کرتے ہوئے لوگوں کو دیکھتے رہے۔ دل کی بات کہنے کے لیے یہ بڑا اچھا موقع تھا مگر پروین خود سے کیسے کہہ سکتی تھی۔ یہ بات تو نبیل ہی کو کہنی تھی۔ وہ رات دن انتظار کر رہی تھی............ رات دن سلگ رہی تھی۔ اس کے کان ہر گھڑی نبیل ہی کی طرف لگے ہوئے تھے۔ اس وقت نہر کے کنارے بیٹھے ہوئے بھی وہ ہمہ تن سرگوش تھی۔ اس کے کان نبیل سے صرف چند لفظوں کی بھیک مانگ رہے تھے۔ صرف چند لفظ............ مگر وہ لفظ نبیل کے ہونٹوں پر نہیں تھے۔ نبیل کے دل میں شاید ہوں مگر دل کی باتیں کون جانتا ہے؟ دل دریا سمندروں ڈونگے۔

''نبیل کچھ بول دو............ خدا کے لیے کچھ بول دو۔'' وہ اپنے دل میں بڑبڑائی۔

اور پھر سچ مچ نبیل بول پڑا۔ اس نے افسردہ سے لہجے میں کہا۔ ''چلو پروین گھر چلیں۔ شام ہونے والی ہے۔''

ایک طویل سانس لے کر پروین بھی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ جس وقت وہ دونوں نہر سے کھیتوں کی طرف مڑ رہے تھے۔ جنتر کی جھاڑیوں کے پیچھے سے دوشعلہ بار نگاہیں ان دونوں کو گھور رہی تھیں۔ یہ شوکے کی نگاہیں تھیں۔

☆............☆............☆

نبیل کو پاکستان آئے ہوئے اب دو مہینے ہونے کو آئے تھے۔ اس دوران میں وہ باقاعدگی سے خط لکھتا رہا تھا۔ ایک بار اس نے آڈیو کیسٹ میں بھی اپنی آواز ٹیپ کر کے بھیجی تھی۔ بیٹے کی دوری انوری بیگم کو بُری طرح محسوس ہو رہی تھی.........مگر وہ بیٹے کی صحت اور سلامتی کی خاطر یہ ہنس کر برداشت کر رہی تھی۔ نبیل کو خطوں اور پھر اس کی آواز سے انوری بیگم کو اندازہ ہوا تھا کہ نبیل واقعی تیزی سے صحت یاب ہو رہا ہے۔ صحت بخش آب و ہوا اور ذہنی آسودگی اسے بڑی تیزی سے زندگی کی طرف کھینچ رہی تھی۔ ہڈیوں کے ناقابل شناخت ڈھانچے میں سے صحت مند نبیل برآمد ہو گیا تھا اور اب مزید بہتری کی طرف جا رہا تھا۔

انوری بیگم نے دادی ہونے کا حق ادا کیا تھا اور نبیل کے بیٹے کو جان سے لگا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک ماں ہی کی طرح اس کی نگہداشت کر رہی تھی۔ رومی کا آخری خط نبیل ہی کو ملا تھا۔ اس خط کے بعد اس آوارہ مزاج لڑکی نے اپنے اہل خانہ سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ رومی کے والدین اور سومی وغیرہ رو دھو کر خاموش ہو بیٹھے تھے۔ دھیرے دھیرے اب انہیں صبر آنا شروع ہو گیا۔ ویسے بھی جس قسم کا یہ معاشرہ تھا اس میں ایسے سنگین واقعات کی سنگینی بہت گھٹ جاتی ہے۔ بعض اوقات تو یہ سب کچھ ایک روٹین کی طرح لگنے لگتا ہے۔

نبیل کے بعد شکیل ماں کا بہت خیال رکھنے لگا تھا۔ اب وہ مکمل طور پر ایک بدلا ہوا شخص تھا۔ اس کا بھی ایک بچہ ہو چکا تھا۔ یہ ہلکی بادامی آنکھوں والی ایک ننھی سی گڑیا تھی۔ ہر طرح کے سکون آرام کے باوجود کبھی کبھی انوری بیگم ایک دم نبیل کے خیال میں بہت اداس ہو جاتی تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو پاکستان سے اور پاکستان کے اس دور دراز گاؤں سے بہت بچانا چاہا تھا۔ اس حوالے سے اس نے سرتوڑ کوششیں کی تھیں لیکن ہوا وہی جو قدرت نے چاہا تھا۔ انوری بیگم اس حد تک مجبور ہوئی تھی کہ اسے اپنے بیٹے کو خود گاؤں بھیجنا پڑا تھا۔ اب وہ تنہائی میں بیٹھ کر نبیل کے بارے میں سوچتی تو نبیل کی پھوپھو جنت بی بی اور اس کی بیٹی پروین کا خیال بھی انوری بیگم کے ذہن میں در آتا۔

وہ سوچتی کہیں ایسا نہ ہو کہ وہی ہو جائے جس سے وہ ہمیشہ خوف کھاتی رہی ہے۔ کہیں جنتے کی بیٹی اور نبیل.........اس سے آگے ایک دم اس کا دماغ سوچنا بند کر دیتا۔

شروع شروع میں تو یہ سوچ اسے بہت تکلیف پہنچاتی رہی لیکن پھر ہر روز اس تکلیف کی شدت کم ہونے لگی۔ وہ ذرا مختلف انداز سے سوچنے لگی۔ اسے تو بس اپنے بیٹے کی سلامتی اور زندگی درکار تھی چاہے یہ کسی وسیلے سے بھی ملتی.........چاہے.........پروین ہی کے وسیلے سے ملتی۔ اس نے یہاں لندن میں نبیل کو موت کے اس قدر قریب دیکھا تھا کہ اب وہ اس کی سلامتی کی خاطر کڑوے سے کڑوا اور زہریلے سے زہریلا گھونٹ بھرنے کو بھی تیار ہو گئی تھی۔ کچھ بھی تھا آخر تو وہ ایک ماں تھی۔ اس کے دل و دماغ میں جمی ہوئی جو برف نبیل کا باپ ہزار کوششوں کے باوجود نہیں پگھلا

سکا تھا وہ بیٹے کی جان پر آنے والی مصیبت نے پگھلا دی تھی۔

ایک دن انوری بیگم ایسے ہی سوچوں میں گھری گم صم بیٹھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ پالنے میں تھا اور نبیل کے بیٹے حسن کو غیر شعوری انداز میں تھپکتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک شکیل عقب سے آیا اور اس نے ماں کے گلے میں بازو حمائل کر دیے۔

''او ماما! کیوں اتنا فکر مند رہتی ہیں آپ.........نبیل بھائی اب صحت میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دو تین ہفتے تک مجھے بھی چند دن کی چھٹی مل جائے گی۔ میں آپ کو لے کر پاکستان جاؤں گا۔ ہم نبیل بھائی سے مل کر آئیں گے.........اور اگر ان کا ارادہ واپسی کا ہوا تو انہیں واپس لے آئیں گے۔''

''بس تُو ایسے ہی کہتا رہتا ہے۔ پتہ نہیں کب ملنی ہے تجھے چھٹی؟''

''اب تو سب کچھ کنفرم ہے مام۔ اگلے مہینے کی پانچ اور دس کے درمیان چھٹی ہر صورت منظور ہونی ہے۔'' پھر وہ ایک دم چونک کر بولا۔

''ارے ہاں یاد آیا۔ پاکستان سے ایک کیسٹ بھی آئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ شیدے نے بھیجی ہے۔ ابھی سنتے ہیں۔''

پھر وہ زور زور سے سوی کو آوازیں دینے لگا کہ وہ کیسٹ پلیئر لے کر آئے۔ تھوڑی دیر بعد سوی کیسٹ پلیئر لے آئی۔ کیسٹ ڈال کر شکیل نے پلے کا بٹن دبایا اور شیدے کی خالص لاہوری آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ سلام دعا کے بعد شیدے نے اپنے مخصوص انداز میں گاؤں کے حالات بیان کیے۔ وہاں کی خالص خوراکوں اور من میلوں کا ذکر کیا۔ اس کے بعد اس نے خوشگوار لہجے میں بتایا کہ نبیل اب ٹھیک ٹھاک ہے۔ وہ دونوں صبح سویرے نہر کے کنارے سیر کے لیے نکلتے ہیں اور آج تو ان دونوں نے تھوڑی سی دوڑ بھی لگائی۔ اس کے بعد شیدے نے جنت بی بی پروین اور دیگر گھر والوں کا ذکر کیا۔ پروین کا ذکر کرتے ہوئے شیدے کے لہجے میں ہلکی سے الجھن نمودار ہونے لگی۔

وہ بولا۔ ''شکیل باؤ! سچ پوچھو تو میں اس کری پروین سے بڑا متاثر ہوا ہوں۔ اتنی بی بی اتنی پیاڑی اور سمجھدار لڑکی میں نے کم کم ہی دیکھی ہے۔ اس بے چاڑی نے پچھلے دو مہینوں میں نبیل باؤ کی اتنی خدمت کی ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے ایک بات اوڑ بھی خاص طوڑ پر نوٹ کی ہے.........میڑا دل پکی پکی گواہی دیتا ہے کہ لڑکی اپنے نبیل باؤ سے بڑا گہڑا پیاڑ کرتی ہے۔ بس یہ سمجھو کہ اس کے پیچھے کملی سی ہے۔ خوبصوڑت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ پڑھی لکھی بھی ہے اور گل بات میں کسی طرح بھی دیہاتن نظر نہیں آتی.........مجھے یقین ہے کہ اگڑ ہماڑا نبیل باؤ ایک بار اشاڑے سے بھی کہہ دے کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو یہ لڑکی خوشی سے مڑنے والی ہو جائے.........بڑ نبیل یاڑ کی تو بات ہی مت پوچھو۔ اس سے یوں بڑے بڑے رہتا ہے جیسے وہ لڑکی نہ ہو کوئی کن کھجوڑا ہو۔ کبھی کبھی تو اس بے چاڑی کے ساتھ نبیل کا سلوک دیکھ کڑ اس پڑ تڑس آنے لگتا ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے شکیل باؤ! اگڑ یہ لڑکی نبیل باؤ کی زندگی میں آئی ہوتی تو نبیل باؤ کی زندگی سنواڑ دیتی۔''

کیسٹ ختم ہوئی تو شکیل معنی خیز نظروں سے ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ انوری بیگم کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں تھیں اور وہ خاموش نظر آتی تھی۔

☆.........☆.........☆

نبیل کو آئے اب تین مہینے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ اس کا دل گاؤں میں خوب لگا تھا۔ وہ اکثر صبح سویرے کھیتوں میں اپنے پھوپھا دین محمد کے پاس چلا جاتا۔ دوپہر تک وہیں رہتا۔ گھر آ کر کھانا کھاتا اور پھر آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتا۔ سہ پہر کے بعد نبیل اور شیدا عموماً گاؤں سے باہر میدان میں چلے جاتے۔ یہاں گاؤں کے لڑکے بالے اور نوجوان مختلف کھیل کھیلتے تھے۔ گلی ڈنڈا' والی بال' کبڈی وغیرہ۔ نبیل بڑی دلچسپی سے یہ مناظر دیکھتا۔ خاص طور پر سے لڑکوں کی کبڈی اور کشتی میں اسے خاص دلچسپی محسوس ہوتی۔ چاچا حیات جس طرح لڑکوں کی صحت اور تندرستی پر توجہ دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ سب ایک ہی گھرانے کے فرد ہوں اور چاچا حیات اس گھرانے کا سربراہ ہو۔

سردیاں اب آہستہ آہستہ رخصت ہو رہی تھیں۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ گندم کی فصل جوان ہو رہی تھی اور رُکھوں پر نئے پتے آ رہے تھے۔ پچھم کی طرف سے شام کے وقت ایسی ہوا چلتی تھی کہ دل میں آگ سی لگ جاتی تھی۔ یہ دل میں پھول کھلانے والا موسم تھا مگر نبیل کے دل میں آج کل عجیب سی بے کلی اور ہلچل تھی۔ وہ چپکے چپکے اپنے ساتھ ایک جنگ لڑ رہا تھا۔ ایک خاموش لیکن نہایت مہلک جنگ...... وہ جانتا تھا کہ وہ پروین سے محبت کرتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پروین اس سے محبت کرتی ہے مگر عجیب بات تھی کہ اظہار کرنے سے دونوں قاصر تھے۔ پروین اس لیے قاصر تھی کہ وہ ایک لڑکی تھی۔ وہ خاموشی کی زبان میں تو بہت کچھ کہہ چکی تھی اور کہہ بھی رہی تھی مگر زبان سے اظہار کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ دوسری طرف نبیل اس لیے خاموش تھا کہ اب وہ خود کو کسی بھی طرح پروین کے قابل نہیں سمجھ رہا تھا۔ اسے یہی لگتا تھا کہ اگر وہ پروین سے اپنے دل کا حال بیان کرے گا تو اپنی نگاہ میں ہی مطلب پرست بن جائے گا۔ وہ پروین کی پھول اور شبنم جیسی پاک اور معصوم زندگی کو اپنی اجڑی ہوئی کانٹوں بھری دنیا میں گھسیٹنا نہیں چاہتا تھا۔ پروین کو بے حد چاہنے کے باوجود نبیل کے دل سے یہی دعا نکلتی تھی کہ پھوپھو جنت کو کوئی ایسا داماد ملے جو پروین کے جوڑ کا ہو اور جسے پھوپھا اپنے پہلو میں بٹھا کر فخر محسوس کر سکیں۔ روشن آنکھوں' چوڑے سینے والا کوئی سجیلا کنوارہ لڑکا جو پروین کو پُر جوش والہانہ پیار دے سکے۔

نبیل اپنے بارے میں پروین کے احساسات سے بالکل غافل نہیں تھا مگر اس کا خیال یہی تھا کہ پروین کی سوچ جذباتی ہے اور اس سوچ میں شدت صرف اس لیے ہے کہ نبیل اس سے دور ہے۔ جب وہ نزدیک آ گئے تو پھر اس تعلق کی ناہمواری اور بدصورتی بہت جلد پروین کو پچھتانے پر مجبور کر دے گی۔

پچھلے دو تین مہینوں میں کئی واقعات ایسے ہوئے تھے جن سے نبیل کو اندازہ ہوا تھا کہ پروین............ اب بھی نبیل کو اسی نظر سے دیکھ رہی ہے۔ جس نظر سے اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ نبیل کی تمام کوتاہیوں کو معاف کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے اور خواہش بھی۔ چند دن پہلے ہی ایک واقعہ تو

خاصا اہم تھا اور اس کے اثرات ابھی تک نبیل کے ذہن پر موجود تھے۔ پروین پڑھانے کے لیے اسکول گئی ہوئی تھی۔ نبیل یونہی گھومتا ہوا اس الماری کی طرف چلا گیا جس میں پروین نے کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ کتابوں پر ایک نظر ڈالنے سے ہی پروین کے اچھے ذوق کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ ان میں اسلامی ادبی تاریخی ہر طرح کی کتابیں موجود تھیں۔ یہ بات نبیل کو اچھی طرح معلوم تھی کہ پروین پڑھنے کا شوق رکھتی ہے مگر اس روز اسے پتہ چلا کہ وہ لکھنے کا شوق بھی رکھتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کی ایک کتاب نبیل نے کھولی تو اس میں ایک کاغذ تہہ کیا ہوا ملا۔ اس کاغذ پر پروین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک نظم موجود تھی۔ پنجابی میں لکھی ہوئی اس خوبصورت نظم کا مفہوم کچھ اس طرح سے تھا۔

تم نے کہا تھا جب چاول کی فصل پک جائے گی

تو میں آ جاؤں گا

میں نے کھیت کی منڈیر پر بیٹھ کر

چاول کے پودوں کو پور پور بڑھتے دیکھا

میں ان پودوں کو اپنے آنسوؤں کا پانی دیتی رہی

میں سورج کا ایک ایک قدم گنتی رہی

میں ٹھنڈی کالی پہاڑ سی رات کو

اپنے ہاتھوں سے دھکیل دھکیل کر سرکاتی رہی

پھر چاول کی فصل کٹ گئی۔

اور چاول کی دوسری اور تیسری فصل بھی کٹ گئی

مگر میرے انتظار کے درخت پر کوئی پھول نہیں کھلا

اب ایک مدت بعد تم آئے ہو۔

تو بھی یہی لگتا ہے کہ نہیں آئے ہو۔

بہار کا موسم ہے مگر میرے انتظار کی ٹہنیوں پر

اب بھی پت جھڑ ہے۔

.... پروین نے اتنی میٹھی اور پیاری زبان میں یہ شعر لکھے تھے کہ نبیل ان کے اثر میں کھو سا گیا۔ اس نے چند ورق الٹے اور کتاب واپس الماری میں رکھنی چاہی۔ وہ کتاب دوسری کتابوں کے اندر گھسیڑ رہا تھا کہ ایک دم الماری کی شیلف اپنی جگہ چھوڑ گئی اور بہت سی کتابیں فرش پر گر گئیں۔ نبیل نے جلدی جلدی کتابوں کو اکٹھا کیا۔ شیلف کو دوبارہ سے اس کی جگہ پر سیٹ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی نگاہ الماری کے پیچھے ایک چھوٹے سے خلا میں پڑی۔ وہ یہاں ایک رومال کو دیکھ کر چونک گیا۔ یہ اسی کا رومال تھا۔ جن دنوں وہ نیا نیا گاؤں آیا تھا شدید بیمار تھا۔ اسے بار

بارتے ہوتی تھی۔ یہ رومال وہ منہ صاف کرنے کے لئے استعمال کرتا رہا تھا اور پھر اس نے پھینک دیا تھا۔ آج یہ رومال دھلا دھلایا اس الماری کے پیچھے موجود تھا۔ رومال میں کچھ باندھ کر رکھا گیا تھا۔

تجسس سے مجبور ہو کر نبیل نے رومال کی گرہ کھولی۔ وہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس میں نبیل ہی کی کئی چھوٹی چیزیں موجود تھیں۔ قمیض کا ایک ٹوٹا ہوا بٹن' بوٹ کا ایک بوسیدہ تسمہ' استعمال شدہ ریزر' روشنائی سے خالی ہو جانے والا بال پوائنٹ اور اس طرح کی کئی چیزیں۔

پچھلے تین مہینوں میں یہ سب کچھ پروین نے ہی سنبھال سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ ایک دم نبیل کا دھیان رومی کی طرف چلا گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کی بیماری کے دوران رومی کس طرح اس سے کراہت کیا کرتی تھی اور ناک چڑھا چڑھا کر دور بھاگا کرتی تھی۔ شاید زمین اور آسمان جیسا فرق تھا رومی اور پروین میں۔

نبیل بستر پر لیٹا رہا اور اپنے حالات کے بارے میں سوچتا رہا۔ اچانک قدموں کی آواز نے اسے خیالوں سے چونکا دیا۔ اس نے گھڑی دیکھی' رات کے نو بج رہے تھے۔ اس وقت پروین اسے اور شیدے کو دودھ دینے آیا کرتی تھی.......... نبیل نے چادر اپنے سینے تک کھینچ لی۔ تھوڑی دیر بعد پروین کی بجائے پھوپھو جنت اندر آ گئیں۔ ان کے ہاتھ میں ٹرے تھی اور ٹرے میں دودھ سے لبالب بھرے دو گلاس تھے۔

نبیل جلدی سے اٹھتے ہوئے بولا ''پھوپھو! آپ نے کیوں تکلیف کی؟''

''وہ پروین نماز پڑھ رہی تھی۔ میں نے سوچا چلو خود لے جاتی ہوں۔ آج سارا دن تمہاری شکل بھی تو نہیں دیکھی میں نے۔ بابے کرموں کی پوتری کا ویاہ ہے نا۔ ان کے گھر گئی ہوئی تھی۔''

نبیل نے شیدے کی طرف دیکھا۔ وہ خراٹے لے رہا تھا۔ ''یہ دوسرا گلاس تو آپ ایسے ہی لے آئیں۔ یہ سارا دن ننھے چھترے کی طرح منہ مارتا رہتا ہے۔ اس وقت اسے دودھ کی نہیں چورن یا پھکی کی ضرورت ہوتی ہے۔''

جنت بی بی نے سوئے پڑے شیدے کو محبت کی نظر سے دیکھا اور نبیل کو اپنے سامنے دودھ پلا کر اور اس سے چند باتیں کر کے نیچے چلی گئیں..........

دودھ پینے کے فوراً بعد ہی نبیل پر غنودگی سوار ہو جاتی تھی.......... پندرہ بیس منٹ بعد وہ سو گیا۔ دوبارہ اس کی آنکھ اچانک ہی کھلی تھی۔ اسے بالکل یوں لگا جیسے اس کے پاؤں کی طرف کوئی جاندار چیز موجود ہے کوئی نرم سا لمس تھا جو اس کے پاؤں کے آس پاس پایا جاتا تھا۔ پہلے تو نبیل نے اسے اپنا وہم خیال کیا اور بے حس و حرکت پڑا رہا۔ مگر یہ لمس وہم نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ حرکت کر کے اپنی جگہ سے اٹھتا اس نے ایک ہیولا دیکھا۔ بے شک یہ پروین کا ہیولا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے بڑی آہستگی سے اپنی کمر جھکائی۔ نبیل کی چادر چارپائی سے نیچے لٹک رہی تھی۔ پروین نے چادر سمیٹ کر اوپر کی اور پھر نبیل کی جانب دیکھتے ہوئے خاموشی سے واپس چلی گئی۔ نبیل اپنی آنکھوں میں تھوڑی سی درز پیدا کئے خاموش پڑا رہا تھا۔

اس کے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اسے اپنے پاؤں پر ابھی تک پروین کے چہرے کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ انگلیوں کے قریب

کوئی نمی سی تھی۔شاید یہ پروین کی حسین آنکھوں سے بہنے والے آنسو تھے.......... یہ سب کیا ہے؟ یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ سوال ایک چیخ بن کر نبیل کے سینے سے ابھرا۔پچھلے ڈیڑھ دو ماہ میں نبیل نے پروین کی طرف سے اپنا دھیان ہٹانے کی بے حد کوشش کی تھی۔مگر یہ دیوانی سی لڑکی تمام کوششوں تمام رکاوٹوں کو پامال کرتی اس کے دل و دماغ میں گھستی چلی آ رہی تھی۔وہ رشتوں کی دوری کو مانتی تھی' نہ حالات کی مجبوری کو نہ ہی گذر جانے والے وقت کا اسے کوئی احساس تھا۔وہ آج بھی شاید اسی مقام پر کھڑی تھی جس مقام پر اس نے پہلے دن نبیل کو اور نبیل نے اسے دیکھا تھا۔شاید وہ لمحے امر ہو چکے تھے۔نبیل پہلی مرتبہ گاؤں آیا تھا۔صبح سویرے پھوپھو کا چکی گھمانا اسے بڑا اچھا لگا تھا۔پھوپھو کے منع کرنے کے باوجود اس نے انہیں پیچھے ہٹا دیا تھا اور خود چکی گھمانے لگا تھا...... کچھ ہی دیر بعد بکھری بکھری سی خوبرو پروین اندرونی دروازے سے باہر آئی تھی۔ماں دیکھ آج پھر تو نے مجھے نہیں اٹھایا نا.......... میری نماز پھر۔اس کی نگاہ اچانک نبیل پر پڑی تھی۔پہلی نگاہ ہائے میں مرگئی......تم...... ماں اس نے گھبرا کر ماں کو آواز دی تھی۔

وہ دوسرے کمرے میں گئی ہیں گندم لینے۔نبیل ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا تھا ہاں.......... یہی لمحے تھے جو شاید امر ہو چکے تھے.......... نبیل نے ایک آہ بھری پھر اسی طرح لیٹے لیٹے اپنے پاؤں پہ موجود نمی کو محسوس کیا...... اسے یوں لگا جیسے یہ نمی اس کے پورے جسم میں سرایت کر گئی ہے اور پھر اس کے جسم سے آگے بڑھ کر پوری دنیا اور پوری کائنات میں پھیل گئی ہے۔نبیل کا دل بھی تو اسی کائنات کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا.......... یہ دل بھی اسی نمی کے گھیرے میں تھا۔نبیل کو محسوس ہوا کہ اس کے دل کا موسم آپوں آپ بدل رہا ہے۔اس دل میں کچھ ایسے خودرو پھول کھل رہے ہیں جنہیں کھلنے سے روکنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔اس کے دل کے اندر سے آواز آئی نبیل اگر تمہاری زندگی ہزاروں سال ہو اور تم ہزاروں سال بھی کوشش کرو.......... تو پروین کو اپنے اندر سے نکال نہیں سکتے۔اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔یہ بے کار کوشش تمہیں چھوڑنا ہی پڑے گی۔بہتر ہے کہ خرابی بسیار سے پہلے چھوڑ دو۔

☆..........☆..........☆

کوئی نہیں جانتا تھا صرف پروین جانتی تھی کہ اس کے دل پر کیا بیت رہی ہے۔ وہ آخری حد تک مایوس ہو چکی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال پختہ ہو چکا تھا کہ نبیل کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں اور اگر ہے تو بس اتنی ہے جتنی ایک پھوپھی زاد سے ہوسکتی ہے۔ وہ اس بارے میں جتنا سوچتی تھی اتنا ہی اس کا دل بھر آتا تھا۔ شاید نبیل اپنی جگہ ٹھیک ہی تھا۔ وہ انگلینڈ میں پلا بڑھا تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ اس کے اردگرد حسین ترین لڑکیوں کا جمگھٹا رہا تھا۔ ایک عام دیہاتن لڑکی سے اسے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔

ایک دن آسیہ سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس کے سامنے پروین دیر تک روتی رہی اور دل کے پھپھولے پھوڑتی رہی۔ اپنی سوتی اوڑھنی سے شفاف آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے کہا آسو! ''بس اب اور حوصلہ نہیں ہے مجھ میں، میں نے ایک فیصلہ کرلیا ہے۔''

''کیا فیصلہ؟'' آسو نے چونک کر پوچھا۔

''میں............ اب اپنے ماں پیو کو اور دکھ نہیں دوں گی۔ اپنی آنکھیں بند کرلوں گی۔ وہ جس کنویں میں دھکا دیں گے اس میں گر جاؤں گی۔ وہ جہاں کہیں گے............ میں شادی کرلوں گی۔''

آسیہ نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا ''پنو! تُو تو بالکل ہی دل چھوڑ بیٹھی ہے۔ اتنی ہمت والی ہوکر ایسی باتیں کیوں کرتی ہے............'' پھر ایک دم جیسے آسیہ کے ذہن میں ایک نئی بات آئی اس نے چونک کر پروین کو خود سے علیحدہ کیا اور بولی ''اچھا ایک کام اور کر کے دیکھتے ہیں۔ آج بھلا کیا تاریخ ہے؟ بتا نا کیا تاریخ ہے آج؟''

''اٹھارہ۔'' پروین نے اشکبار لہجے میں کہا۔

''بس پھر ٹھیک ہے۔ ابھی پانچ دن باقی ہیں، تُو نے مجھے بتایا تھا نا کہ اس مہینے کی 23 تاریخ کو تیرے نبیل کا جنم دن ہے؟'' پروین نے اثبات میں سر ہلایا۔ آسیہ بولی ''ہم نبیل بھائی کی سالگرہ مناتے ہیں۔ تمہیں پتہ ہی ہوگا کہ شہری لوگ سالگرہ بڑی خوشی سے مناتے ہیں۔ میں نے ایک مرتبہ شیخوپورے میں اپنے تایا کی دھی فوزیہ کی سالگرہ دیکھی تھی اللہ دی قسمیں مزا آ گیا تھا۔ ہم اتنا لمبا چوڑا انتظام تو نہیں کرسکیں گے مگر اتنا تو کرسکتے ہیں نبیل بھائی خوش ہوجائے۔ گوگے کو سیالکوٹ بھیجوا کر میں اس سے چھوٹا سا کیک بھی منگوالوں گی۔ دہی پکوڑیاں، جلیبیاں اور اس طرح کی دوسری چیزوں کا انتظام یہاں سے ہی ہوجائے گا۔''

''مگر؟''

''اگر مگر کچھ نہیں۔'' آسیہ نے پروین کو ٹوکا۔ ''ہم یہ سالگرہ بالکل خفیہ رکھیں گے اگر تجھے اپنے ابے کا ڈر ہے تو ایسا کرتے ہیں کہ میں یہ سالگرہ اپنے گھر منالیتی ہوں۔ میری سس اور سورا دونوں دس پندرہ دن کے لئے اپنی وڈھی دھی کی طرف گئے ہوئے ہیں۔ گھر میں بس گوگا اور میں ہی ہوتے ہیں۔'' آسیہ شرارت سے ایک آنکھ دبا کر بولی۔

''تو سالگرہ سے کیا ہوگا؟''

''سب کچھ ہوجائے گا۔ نبیل بھائی کی یہ سالگرہ تمہاری طرف سے ہوگی۔ نبیل کو آخر تک یہ پتہ نہیں چلے گا کہ اس کی سالگرہ منائی جارہی

ہے۔ جب اسے اچانک پتہ چلے گا تو وہ کتنا خوش ہوگا۔ اس جھلّے کو پتہ چلے گا کہ تم اس سے کتنا پیار کرتی ہو۔ سالگرہ کے بعد میں اور گوگا تجھے اور نبیل کو ایک کمرے میں بند کر دیں گے۔ میں دروازے کے باہر سے آواز دے کر نبیل بھائی کو بتاؤں گی کہ جب تک تم دونوں میں صلح نہیں ہو جاتی تمہیں باہر نہیں نکالا جائے گا۔ مجھے پکا یقین ہے اس شغل میلے کے دوران ہی تم دونوں کی بات بن جائے گی۔''

''تم خواہ مخواہ چکروں میں پڑی ہوئی ہو۔ مجھے پتہ ہے کہ کچھ نہیں ہوگا۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کہ وہ آئے گا ہی نہیں۔''

''آئے گا ضرور آئے گا۔'' آسیہ زور دے کر بولی۔

پھر اس نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور پروین کو بتانے لگی کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ وہ قریباً ایک گھنٹہ اسی بارے میں باتیں کرتی رہیں۔

..........تین چار دن پلک جھپکنے میں گذر گئے۔ آسیہ کے گھر سالگرہ کا پروگرام برقرار تھا بس اس میں تھوڑی سی تبدیلی ہوئی تھی اس سے پہلے تو صرف آسیہ گوگے اور پروین کو اس پروگرام کا پتا تھا مگر اب نبیل کو بھی پتہ چل گیا تھا۔ پتہ نہیں کیسے اسے شک پڑ گیا تھا کہ اسے بار بار 23 تاریخ کو آسیہ کے گھر آنے کے لئے کہا جا رہا ہے تو اس میں کوئی بھید ہے اگر پروین کی سہیلی آسیہ نے اس کی دعوت ہی کرنا تھی تو وہ کسی اور دن بھی کی جا سکتی تھی..........پھر نبیل کو اپنی تاریخ پیدائش بھی یاد آ گئی تھی اور وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ دراصل اس کی سالگرہ منائی جا رہی ہے۔

اس نے پہلے تو آسیہ اور پروین کو صاف منع کر دیا تھا کہ وہ اس قسم کا کوئی پروگرام نہ بنائیں۔ لیکن آسیہ اس کے گلے میں پڑ گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ یہ سالگرہ ہوگی اور ضرور ہوگی۔ پاس سے شیدے نے بھی لقمہ دے دیا تھا۔ وہ بولا تھا ''یار سالگرہ نہ سہی..........تمہاری تندرستی کا جشن ہی سہی۔ سیانے کہتے ہیں کہ خوشی کا موقع ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہیے۔''

پھر نبیل کی نظر پروین کی معصوم صورت پر پڑی تھی اور پتہ نہیں کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی وہ رضامند ہو گیا تھا۔

جس دن آسیہ اور پروین نے آسیہ کے گھر سالگرہ کا پروگرام بنایا تھا' اسی دن نبیل کو سیالکوٹ جانا پڑ گیا۔ اس کی دوا بالکل ختم ہو گئی تھی وہ شیدے کے ساتھ صبح سویرے گاؤں سے نکل گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بہت لیٹ بھی ہوا تو دوپہر دو ڈھائی بجے تک دوا لے کر واپس آ جائے گا۔ سالگرہ کا پروگرام شام پانچ چھ بجے کا تھا۔ شیدا اور نبیل سیالکوٹ پہنچے۔ سیالکوٹ کے سب سے بڑے میڈیکل اسٹور سے انہیں تمام دوائیں مل گئیں۔

جس وقت وہ واپس جانے کا سوچ رہے تھے مطلع ابر آلود ہو گیا اور ہلکی بوندا باندی ہونے لگی۔ اس بوندا باندی نے سردی میں کافی اضافہ کر دیا۔

نبیل نے بس پر جانے کے بجائے ٹیکسی کار لے لی۔ بارش اور کیچڑ میں سفر ذرا مشکل ہو گیا تھا۔ راستے میں ایک جگہ ٹائر بھی پنکچر ہوا' گاؤں کے مضافات میں پہنچتے پہنچتے انہیں چار بج گئے۔ بمشکل پندرہ بیس منٹ کا سفر اور تھا۔ نبیل کو امید تھی کہ پروین اور آسیہ وغیرہ کو اس کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ مگر پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے سب کچھ اتھل پتھل کر دیا..........ابھی وہ نہر سے ڈھائی تین میل دور تھے۔ ویران رُکھوں کے اندر سے گذر کر دہ کچے راستے پر مڑے تو ایک جھنڈ کے پاس انہیں ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی نظر آئی۔ وہ اپنے حلیے سے کوئی فقیرنی ہی لگتی تھی۔ اس نے اپنی ایک ٹانگ آگے کو پھیلا کر ٹاہلی کے ایک درخت سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ آسمان پر اندھیرا سا چھایا ہوا تھا اور بارش اب تیز ہو گئی تھی۔ عورت بری طرح

بھیگی ہوئی تھی۔ اس نے فریادی نظروں سے ٹیکسی کار کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے رکنے کی التجا کی۔

شیدا ڈرائیور سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''چلتے رہو یار کہیں کوئی نوسر باز ہی نہ ہو۔ بیٹھے بٹھائے مصیبت پے جائے۔''

گاڑی آگے نکل گئی۔ مگر پتہ نہیں نبیل کو کیا ہوا۔ شاید عورت کی فریادی نگاہوں نے اس پر اثر کیا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو ٹیکسی کار روکنے اور پھر ریورس کرنے کے لئے کہا۔ وہ لوگ عورت کے قریب پہنچ گئے اس کے بال تقریباً سارے سفید ہو چکے تھے۔ جسم تھوڑا سا فربہ تھا اور وہ بے حد بوسیدہ لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کے پاس ایک چھوٹی سی گٹھڑی بھی تھی۔ وہ بار بار اپنے پاؤں کی طرف اشارہ کر رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ وہ گر گئی ہے۔ اس کا سوجا ہوا پاؤں دیکھ کر دور ہی سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ پاؤں بری طرح مڑ گیا ہے یا شاید ٹوٹ گیا ہے۔ عورت کو فوری طور پر اسپتال پہنچائے جانے کی ضرورت تھی۔ نبیل نے بے قراری سے رسٹ واچ کو دیکھا اس کے پاس ٹائم بہت کم تھا۔ ایک طرف یہ ستم رسیدہ عورت تھی..........دوسری طرف نمناک آنکھوں والی پروین تھی۔ جو پہلے ہی اس کی طرف سے بہت دکھی ہو رہی تھی۔ جس کی حسین آنکھوں میں دن رات اشکوں کی قطار لگی رہی تھی۔ وہ آسیہ کے گھر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ نبیل نے خود کو ایک دوراہے پر محسوس کیا۔ وہ کئی لمحے تک شدید تذبذب میں رہا۔ پھر اسکے دل و دماغ نے مصیبت زدہ عورت کے حق میں فیصلہ دیا......اس نے سوچا کہ پروین اور آسیہ وغیرہ کی ناراضگی تو پھر بھی دور کی جاسکتی ہے۔

وہ موسلا دھار بارش میں گاڑی سے نکل آیا اور شیدے کے ساتھ عورت کی طرف بڑھا عورت کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو نمودار ہوئے.........تھوڑی ہی دیر بعد نبیل اور شیدا اس نامعلوم عورت کو ٹیکسی میں بٹھائے تحصیل اسپتال کی طرف لے جا رہے تھے۔

☆..........☆..........☆

شاید وہ پروین کے انتظار کی آخری شام تھی۔ شاید وہ اس کی امید کا آخری دن تھا۔ پروین' آسیہ اور گوگا بے چینی سے نبیل اور اس کے دوست کا انتظار کرتے رہے۔ چھ بجے پھر سات..........پھر آٹھ..........پھر رات کے ساڑھے نو بج گئے۔

سب کچھ دھرے کا دھرا رہ گیا تھا۔ آنسوؤں کا ایک آبشار سا چپکے چپکے پروین کے حلق میں گر رہا تھا۔ وہ خاموشی کی زبان میں آسیہ سے کہہ رہی تھی تم سے کہا تھا نا آسو تم میرا دکھ بڑھانے کے سوا کچھ نہیں کرو گی۔ وہ نہیں آئے گا۔ کیونکہ اس نے نہیں آنا..........

پھر وہ بڑے پُر مژدہ لہجے میں آسیہ سے مخاطب ہوئی۔ ''آسو! مجھے گھر چھوڑ آؤ اباّ اور ماں بڑے پریشان ہوں گے۔ میں نے تو کہا تھا کہ شام کے فوراً بعد آ جاؤں گی۔''

آسیہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری تھی اور اٹھ کر پروین کے ساتھ چل دی تھی۔ بوندا باندی اب رک چکی تھی مگر کیچڑ کی وجہ سے دونوں کو سنبھل سنبھل کر چلنا پڑ رہا تھا۔ گھر پہنچ کر پروین کو معلوم ہوا تھا کہ نبیل اور شیدا ابھی تک نہیں آئے۔ شاید گوگے کا یہ خیال درست تھا کہ وہ دونوں زرعی نمائش دیکھنے کے لئے سیالکوٹ میں ہی رک گئے ہوں گے۔

گھر واپس آتے ہی غمزدہ پروین پر ایک اور مصیبت ٹوٹ پڑی تھی۔ ابا نے کبھی اس سے تلخ لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ ہمیشہ اس کے ساتھ

مٹھڑا بول ہی بولا تھا۔ مگر اس دن ابا نے سخت لہجے میں پروین سے پوچھا کہ وہ اتنی دیر تک آسیہ کے گھر میں کیا کر رہی تھی۔

پروین نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ ’’کچھ بھی نہیں ہم.........میں تو بس بارش کی وجہ سے رک گئی تھی۔‘‘

زندگی میں پہلی مرتبہ پروین کو اپنے باپ کی نگاہوں میں غصے کی سرخی دکھائی دی۔ ابا نے ایک بھرپور نگاہ پروین پر ڈالی پھر جنت بی بی سے مخاطب ہو کر بولے۔ ’’جنتے! تُو اس کو اپنی زبان میں سمجھا۔ اسے بتا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔‘‘

پھر وہ تیز قدموں سے باہر نکل گئے تھے۔

پروین نے چونک کر دیکھا ماں کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں کی چمک تھی۔ ماں پروین کو کمرے میں لے گئی اور لرزیدہ آواز میں اسے بتایا کہ اس کے اباجی کو کسی طرح معلوم ہو گیا ہے کہ تم اور آسیہ نبیل کی سالگرہ منانے کے چکر میں پڑی ہوئی تھیں۔

پروین بھونچکا رہ گئی اس کا ملوک جسم خشک پتے کی طرح کانپنے لگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آسیہ، گوگے اور رشیدے کے سوا اس بات کا کسی کو بھی پتہ نہیں تھا۔ پھر یہ بات ابا تک کیسے پہنچ گئی؟ اس بے چاری کو کیا خبر تھی کہ گھر کا بھیدی لنکا ڈھاتا ہے اور ایک ایسا بھیدی ان کے درمیان میں موجود ہے.........وہ گوگے کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتی تھی کہ وہ آسیہ کا شوہر ہے اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ شوکے کا بڑا پکا مخبر بھی ہے.........اور ہر معاملے میں اس کا راز داں بھی ہے.........اس کے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ سالگرہ منانے والی بات شوکے کے راز داں گوگے کے ذریعے اس کے والدین تک پہنچی ہے۔

پروین سر جھکائے کھڑی تھی۔ جنت بی بی نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ’’پینو پُتر! دیکھ میں تیرے سامنے ہتھ جوڑتی ہوں۔ کہتی ہو تو پاؤں بھی پڑ جاتی ہوں.........تُو اب پرچھانویں کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دے اگر نہیں چھوڑے گی تا.........تو کسی دن اپنی مری ہوئی ماں کا منہ دیکھے گی.........میں سچ کہتی ہوں منہ دیکھے گی۔‘‘

جنت بی بی اپنی ہچکیاں روکنے کی کوشش کرتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ پروین اپنی جگہ پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے نبیل کسی متحرک شے پر کھڑا ہے یہ شے اس سے دور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ نبیل کسی دھند میں گم ہوتا چلا جا رہا ہے وہ کماد اور سرسوں اور گندم کے کھیتوں سے آگے چلا گیا ہے روہی نالے کے پار.........ڈوبو مٹی کی دوسری جانب.........بہت دور.........بہت دور۔

اگلے روز صبح سویرے پروین نے سوجی سوجی آنکھوں کے ساتھ ماں کے غمزدہ چہرے کی طرف دیکھا اور کہا ’’ماں تُو اور ابا جہاں چاہتے ہیں میں وہاں شادی کر لوں گی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔‘‘

جنت بی بی نے بے اختیار بیٹی کو گلے سے لگا لیا۔ دونوں ہی رونے لگی تھیں۔

☆.........☆.........☆

بے سہارا عورت کو تحصیل اسپتال میں داخل کرانے کے بعد نبیل اور شیدے کو رات وہیں رہنا پڑا تھا۔ عورت کے ٹخنے میں فریکچر تھا۔ اسے سردی بھی لگی ہوئی تھی جس کے سبب اسے تیز بخار ہو چکا تھا۔ عورت تیز بخار کے سبب غنودگی کی کیفیت میں تھی۔ نبیل اور شیدے کے بار بار پوچھنے کے باوجود وہ اپنا نام پتہ بتانے سے قاصر رہی تھی۔ اگلے روز نبیل نے ایک ذمے دار بزرگ کو نامعلوم عورت کے علاج معالجے کے لئے چند سو روپے دیے تھے اور شیدے کے ساتھ واپس گاؤں پہنچ گیا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ پروین اور آسیہ وغیرہ کو کل شام بے حد مایوسی ہوئی ہوگی .... پروین کے بارے میں نبیل کو یقین تھا کہ وہ اس سے بہت خفا ہوگی .... مگر جب اس نے سہ پہر کے وقت گھر آ کر پروین کو دیکھا تو وہ اسے تقریباً نارمل ہی نظر آئی۔ ہاں کچھ خاموش خاموش تھی۔ پھوپھو گلی میں گھومتی مرغیوں کو اکٹھا کرنے کے لئے باہر نکلیں تو نبیل چپکے سے پروین کے پاس پہنچا۔ وہ اس وقت کمرے میں بیٹھی اسکول کی بچیوں کے پرچے چیک کر رہی تھی۔

''مے آئی کم اِن ٹیچر؟'' نبیل نے ذرا ادا سے کہا۔

''آئیں۔'' وہ عام سے انداز میں بولی۔

''مجھے واقعی بہت افسوس ہے پروین .... کل میں نے تمہارا اور آسیہ کا پروگرام خراب کر ڈالا۔ دراصل بات ہی ایسی تھی۔ میں گڑبڑا کر رہ گیا تھا۔''

پھر نبیل نے رک رک کر سارا واقعہ پروین کے گوش گزار کر دیا۔ پروین بس خاموشی سے سنتی رہی۔ اس نے کوئی سوال جواب نہیں کیا۔ بس آخر میں بولی ''چلو اچھا ہوا۔''

اس سے پہلے کہ نبیل جواب میں کچھ کہتا۔ پھوپھو جنتے مرغیوں کو ہانکتی ہوئی صحن میں داخل ہو گئی۔ پروین جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اس نے مرغیوں کو ڈھانپنے والا ٹوکرا اٹھایا اور مرغیوں کو بند کرنے میں ماں کی مدد کرنے لگی۔ نبیل اسے دیکھتا رہا اور اس کے ہونٹوں پر ایک بڑی دھیمی سی غیر محسوس مسکراہٹ دکھائی دیتی رہی۔ جس رات اس نے اپنے پاؤں پر ایک ریشم جیسا نرم اور حسن لمس محسوس کیا تھا اس کو اپنے دل کا موسم بدلا سا محسوس ہونے لگا تھا۔ اسے یہی لگا تھا کہ وہ پروین کسی کوہی نالے جیسی تیز اور توانا صحت سے تادیر نگاہیں چرا نہیں سکتا اور اگر ایسا کرے گا تو پروین کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھ بھی دھوکا کرے گا .... ان دنوں وہ بار بار غور کر رہا تھا کہ کیا وہ کھل کر پروین کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کر ڈالے اب وہ جب کبھی اکیلا ہوتا تھا اور اس کی نگاہوں کے سامنے اپنے بچے کی شبیہہ آتی تھی تو اس کے ساتھ ساتھ پروین کی شبیہہ بھی آ جاتی تھی۔ وہ تصور کی نگاہ سے اپنے بچے اور پروین کو ایک ساتھ دیکھنے لگتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کا بچہ انگلینڈ میں نہیں۔ یہیں اس سوندھی سوندھی خوشبو والے گاؤں میں ہے۔ وہ بچہ پروین کی گود میں ہے۔ پروین اس بچے کو اٹھائے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چلی جا رہی ہے۔ اس کے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں۔ اس کے چہرے پر بچے کے لئے محبت کی بارش سی ہو رہی ہے .... پچھلے چند دنوں میں نبیل کے تصور نے یہ منظر کئی بار دیکھا تھا .... اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ منظر تصور سے حقیقت تک کا سفر کرنے سے پہلے ہی ناپید ہو چکا ہے۔

واقعی نبیل بالکل بے خبر تھا۔ جب اسے پتہ چلا کہ پروین کی منگنی ایک قریبی بھٹہ خشت کے جواں سال مالک شوکت عرف شوکے سے ہو رہی ہے تو وہ حیران رہ گیا۔ مگر اس کے حیران یا پریشان ہونے سے یہ کام رکنے والا تو نہیں تھا........ نبیل کو زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ پھوپھو اور پھوپھانے اس منگنی سے پہلے نبیل سے اس موضوع پر بات تک نہیں کی۔ اور کچھ نہیں تو وہ پروین کا ماموں زاد تو تھا........ اور پھر پچھلے کئی ماہ سے اسی گھر میں مقیم تھا کم از کم اتنا حق تو اس کا تھا کہ رسمی انداز میں اس کی رائے پوچھ لی جاتی یا منگنی سے پیشتر رسماً اسے بتا دیا جاتا۔ مگر نبیل کو تو تب پتہ چلا تھا جب اگلے روز منگنی تھی۔

نبیل نے شوکے کو بس ایک دو بار دور سے دیکھا تھا۔ وہ گھنی مونچھوں اور سرخ چہرے والا قدرے فربہ اندام شخص تھا۔ اس کے طور اطوار میں ایک طرح کی خودسری اور لاپرواہی نظر آتی تھی۔ وہ پہلی نظر میں نبیل کو کوئی اچھا آدمی نہیں لگا تھا........ اگلے روز ہی شوکے نامی اس بندے کے ساتھ پروین کی منگنی ہوگئی۔ چار پانچ بزرگ آئے۔ فربہ جسموں والی تین چار دیہاتی عورتیں تھیں۔ ان میں سے ایک نے ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود کثرت سے گہنے پہن رکھے تھے۔ معلوم ہوا کہ وہ پروین کی ہونے والی جیٹھانی ہے۔ یہ سب کچھ اتنا آنا فانا ہوا تھا کہ نبیل بھونچکا رہ گیا تھا۔

جس روز پروین کی منگنی ہوئی اس روز نبیل کے سینے میں کوئی شے ٹوٹ گئی۔ اس شے کے ٹوٹنے کا چھنا کا اتنا زوردار تھا کہ نبیل کا سارا جسم جھنجھنا گیا۔ اس ٹوٹنے والی شے کی کرچیاں اس کے پورے بدن میں پھیل گئیں۔ وہ رات کو گاؤں سے باہر کماد کے ایک کھیت کے کنارے بیٹھ کر دیر تک سوچتا رہا........ وہ تو پروین کی آنکھوں میں چھپے پیغام سے نظریں چرایا کرتا تھا۔ وہ تو سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اسے نظر انداز کرتا رہا تھا۔ وہ ہرگز ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ پروین کی نئی نویلی زندگی کے ساتھ اس کی ٹوٹی پھوٹی زندگی نتھی ہو۔ پھر آج اس کے دل کی حالت یہ کیوں ہو رہی تھی۔ آج کیوں اس کے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔

اچانک اسے اپنے خیالوں سے چونکنا پڑا۔ کسی نے بڑے آرام سے اسکے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس نے تیزی سے مڑ کر دیکھا۔ سامنے شیدا کھڑا تھا سردی سے بچنے کیلئے اسنے کھیس کی بکل مار رکھی تھی۔ ''یار! تم اکیلے یہاں بیٹھے ہو میں سارے پنڈ میں تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔''

''بس یونہی ہوا کھانے آ گیا تھا۔''

''ہوا کھانے آ گئے تھے یا غم کھانے؟''

''کیا مطلب؟''

''میں سب جانتا ہوں میرے یار۔ تیرا کچھ بھی مجھ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ مجھے پتہ ہے آج تیرا دل اسی طرح ٹوٹ رہا ہے جس طرح گنا بیلنے میں جانے کے بعد ٹوٹتا ہے۔ مگر تجھ سے بھی تو بیوقوفی ہوئی ہے۔ میں تجھ سے کتنا کہتا رہا ہوں کہ اپنے آپ سے جھوٹ مت بول پروین تجھے پسند کرتی ہے اور تو اس کو کرتا ہے۔ مگر تجھ پر تو کچھ اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔''

''یہ دل کے معاملے عجیب ہوتے ہیں شیدے! دل تو کبھی کبھی اپنے آپ سے بھی جھوٹ بولتا ہے بہر حال جو ہونا تھا ہو گیا۔'' نبیل نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''بس تیرے جیسے پھڑ یہی کہتے ہیں کہ جو ہونا تھا ہو گیا۔'' شیدے نے اس کے قریب ٹھنڈی گھاس پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

نبیل بولا ''چل شیدے اب واپس چلیں۔''

''کہاں؟............گھر؟''

''نہیں............واپس انگلینڈ، اب تو یہاں دل نہیں لگے گا۔ایک دم سب کچھ پرایا پرایا سا ہو گیا ہے۔''

''یعنی تو مانتا ہے ناکہ پنڈ کی اصل خوبصورتی بس اس کی وجہ سے ہی تھی۔''

''شاید تو ٹھیک کہتا ہے یہاں بیٹھ کر یہی سوچ رہا ہوں۔ یہ دیکھ وہی کھیت ہے' وہی پگڈنڈی ہے' وہی بوٹے ہیں' وہی نہر کنارے چاندنی میں چمکتے ہوئے رُکھ بھی وہی ہیں۔لیکن ان سب کی خوبصورتی کو گرہن لگ گیا ہے۔لگتا ہے کہ ان کے اندر سے کوئی شے کم ہو گئی ہے۔............چل شیدے۔اب یہاں سے چلے چلیں............نہیں تو دم گھٹنے لگے گا۔''

''پر اتنی جلدی بھی کیسے جا سکتے ہیں۔ پہلے ٹکٹ کنفرم کرانی پڑے گی۔اوپر سے تجھے پتہ ہی ہے کہ دھند کی وجہ سے ساری پروازیں اگے پچھے ہوئی ہیں۔رستے بھی بڑے خراب ہیں۔کل دینو نائی اور صدیق سلائی والی مشین لینے سیالکوٹ گئے تھے۔ادھے رستے سے ہی واپس آ گئے۔بتانے لگے کہ نالے کی وجہ سے آگے راستہ بند ہے۔''

''بس یار!اب تو لگتا ہے کہ یہاں جتنے دن بھی گذریں گے سولی پر ہی گذریں گے۔''

''یار ایسی باتیں کیوں کرتا ہے اس گاؤں نے تجھے نئی حیاتی دی ہے۔تیرے مُردہ پنڈے میں جان ڈالی ہے۔پروین اور اس کے گھر والوں نے جتنی ہماری خدمت کی ہے بھلا کون کرتا ہے۔''

''اوئے پاگل خانے!اسی لئے تو کہتا ہوں کہ ہنستے ہنستے یہاں سے چلے جائیں۔اچھی اچھی یادیں لے کر اچھی اچھی باتیں سن کر............ یہ نہ ہو کہ جو نئی رت آنے والی ہے اس میں سارے پھل سارے پتے جھڑ جائیں۔''

''نئی رت؟ یہ کیا شاعروں مشاعروں والی باتیں کر رہا ہے۔''

''تجھے پتہ ہے منگنی کے بعد پروین کی شادی بھی بڑی جلدی ہونے والی ہے۔سمجھو کہ سارے مہینے ڈیڑھ کی بات ہے۔'' نبیل نے بجھے لہجے میں کہا۔

''واقعی؟'' شیدا حیران ہو کر بولا۔جواب میں نبیل نے اثبات میں سر ہلایا۔شیدے نے کماد کا ایک لمبا پتا توڑ کر اسے درمیاں میں سے چیرنا شروع کیا اور پُر سوچ لہجے میں بولا ''مجھے لگتا ہے یار! کہ یہ شوکا اچھا بندہ نہیں ہے۔یہ صرف پروین سے شادی کرنے کے لئے ہی مٹھا بنا ہوا ہے۔وہ چاہتا ہے کہ یہ کام جتنا چھیتی چھیتی ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔میرا تو یہ بھی خیال ہے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ سالگرہ منانے والی گل کا پتہ بھی پروین کے ابا جی کو شوکے کی وجہ سے ہی چلا ہو۔''

نبیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔بس سر جھکائے اور کھال کے پانی میں چاند کا ٹوٹا پھوٹا عکس دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔اچانک شیدے کی

آنکھوں میں چمک سی نمودار ہوئی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی خیال آیا ہے۔

یہ تیسرے چوتھے روز کی بات ہے۔ پروین اسکول میں تھی۔ اسکول میں بچیوں کی تعداد اب کافی زیادہ ہوگئی تھی پروین کو کافی محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ چھٹی کے وقت تک وہ تھک کر چُور ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسکول کے احاطے میں بکائن کے نیچے کرسی ڈالے بیٹھی تھی اور ایک پاؤں کرسی کے اوپر رکھ کر اپنے پاؤں کی انگلیوں کو خود ہی دبا رہی تھی۔ ماسی برکتے جو چوکیدار کے فرائض بھی انجام دیتی تھی اندر آئی۔ اس نے بتایا کہ کوئی ملنے آیا ہے۔ پہلے تو پروین کے ذہن میں یہی خیال آیا کہ شوکا ہوگا۔ اکثر وہی یہاں کا ''دورہ'' کیا کرتا تھا مگر پھر فوراً ہی پروین کو اپنا خیال بدلنا پڑا۔ شوکے کو تو ماسی برکتے اچھی طرح جانتی تھی۔ یقیناً یہ کوئی اور ہی تھا۔ پروین نے ماسی سے پوچھا تو وہ بولی ''وہ جی.........آپ کے گھر جو شہری پروہنے ٹھہرے ہوئے ہیں ان میں سے ایک ہے۔''

پروین کا دل اچھل سا گیا۔ پروین کی اجازت سے ماسی آنے والے کو اندر لے آئی۔ وہ شیدا تھا ''شیدے تم یہاں کیسے؟'' پروین ذرا حیران ہو کر بولی۔

''آج آپ سے ایک بہت ہی ضروری گل کرنی ہے پروین بی بی۔'' شیدا خلافِ معمول بے حد سنجیدہ تھا۔

پروین نے ایک نظر شیدے کی خاموش آنکھوں کی طرف دیکھا پھر وہ اسے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے آئی۔ یہ اس کے دفتر کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ چند رسمی باتوں کے بعد شیدا اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ اس نے اپنی بات ان الفاظ سے شروع کی۔ ''پروین بی بی مجھے آپ کے ذاتی معاملوں میں دخل دینے کا کوئی حق تو نہیں مگر نبیل کا گہرا دوست ہونے کی وجہ سے میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں.........اور وہ بات یہ ہے پروین بی بی کہ آپ اور نبیل دونوں ایک بچی گل سے اپنی نظریں چرا رہے ہیں۔ اور نظروں کی یہ چوری آپ دونوں کے لئے بعد میں بہت مصیبتیں کھڑی کرے گی۔''

''م.........میں کچھ سمجھی نہیں شیدے۔''

جواب میں شیدے کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کا سیدھا سادہ چہرا سچائیوں کا آئینہ دار تھا اور اس چہرے پر ایک دوست کا سچا دکھ بارش کی طرح برس رہا تھا۔ شیدے نے الف سے ے تک پروین کو نبیل کے بارے میں اور اس کے خیالات کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ شاید نبیل خود بھی اپنی دلی کیفیت بیان کرتا تو اتنے موثر اور گداز پیرائے میں بیان نہ کر سکتا۔ آخر میں شیدا بولا ''اور پروین بی بی! میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ انگلینڈ میں بھی نبیل بابو ہر وقت ہر گھڑی آپ کو یاد کرتا رہا ہے۔ میں نے بے شمار دفعہ اسکی آنکھوں میں آپ کا غم اور آپ کی یادیں دیکھی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آپ نے نبیل کی گل پر پورا یقین نہ کیا ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ نبیل کی والدہ سچ مچ آخری سانسوں پر پہنچ گئی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو وہ کبھی اس ادھی ولایتی ادھی پاکستانی چڑیل سے شادی نہ کرتا۔ میں آپ کو کیا بتاؤں پروین بی بی آپ کے غم نے نبیل کو کس طرح توڑا مروڑا ہے۔''

شیدے کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی.........پروین کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور وہ بار بار اپنے ہونٹ بھینچتی تھی۔ ایک گھمبیر دکھ جو ایک غبار کی طرح اس کمرے کی فضا میں ٹھہر گیا تھا۔ بہت دیر بعد پروین کے ہونٹوں سے ایک زخمی زخمی آواز نکلی۔ ''وقت بہت آگے نکل

گیا ہے شیدے۔ ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اب........کیا ہو سکتا ہے۔''

☆............☆............☆

پروین اب نبیل سے دور دور ہی رہتی تھی۔ ایک عجیب سی جھجک اس میں نمودار ہو چکی تھی۔ وہ خود کو ہمہ وقت مصروف رکھتی تھی۔ سہ پہر تک اسکول میں رہتی۔ گھر آتے ہی گھر کے کام کاج میں جت جاتی۔ ہانڈی روٹی' کپڑے دھونے' برتن مانجھنے' بستر بچھانے' ابے کے لئے چائے بنانے' اس کا حقہ تازہ کرنا' اس کی ٹانگیں دبانیں........غرض پروین کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کے پاس فارغ وقت نہ ہو........مگر پھر بھی اس کے دل کو سکون نہیں تھا۔ نماز پڑھ کر وہ دیر تک مصلّے پر بیٹھی رہتی اور اپنے دل کے سکون کے لئے دعا مانگتی۔ اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں' پورے بدن میں درد کی لہریں پھیل جاتیں۔ جس دن سے شیدے نے اس سے اسکول میں ملاقات کی تھی اور اس کے ساتھ نبیل کے حوالے سے باتیں کی تھیں اس کے دل کا درد دوگنا ہو گیا تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد دعا کرتے ہوئے اکثر نبیل کا نام بھی اس کی دعا میں شامل ہو جاتا' وہ نبیل کے سکون اور اس کی خوشی کے لئے بھی دعا گو ہوتی۔

ایک روز نماز پڑھ کر وہ مصلّے سمیٹ رہی تھی کہ اندر سے ابے کی آواز آئی۔ وہ پروین کی ماں سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا۔ ''پینو کی ماں! صبح نبیل پتر پتہ ہے کیا کہہ رہا تھا؟''

''کیا کہہ رہا تھا؟''

''کہہ رہا تھا کہ وہ اب واپس جانا چاہتا ہے۔ ماں اس کے لئے بہت پریشان ہو گی۔ میں نے کہا' پتر! جہاں اتنے دن ٹھہرا ہے پندرہ دن اور رک جا۔ اب تھوڑے دن تو رہ گئے ہیں شادی میں۔''

''پھر؟''

''آگے سے کچھ بولا نہیں۔ بس سوچنے لگ گیا۔''

ماں نے دروازہ بند کر دیا تھا لہٰذا باتوں کی آواز آنا بند ہو گئی۔ پروین اپنی جگہ کھڑی لرزتی رہی۔ نبیل کے جانے کی بات سن کر اسے یہی لگا تھا جیسے کسی نے اس کے سینے کے اندر ہاتھ ڈال کر اس کا کلیجہ کھینچ لیا ہو۔ یہ سوچ کر وہ غم کے پانی میں ڈوب گئی تھی کہ نبیل اس گاؤں کو سونا چھوڑ کر یہاں سے چلا جائے گا۔ ہمیشہ کے لئے........پھر وہ کبھی اس کی صورت نہ دیکھ سکے گی۔ جیسے اپنے ماموں حسنے کی صورت نہیں دیکھ سکی تھی۔ یہ کھیت' یہ درخت' یہ رستے' یہ گلیاں' ساری زندگی اس کی راہ تکتے رہیں گے۔ پھر اس دنیا میں جینے کے لئے کیا رہ جائے گا۔

اس کا دل ایسی دیوانی سوچیں کیوں سوچتا تھا۔ جب وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے پر کاٹ چکی تھی تو پھر اس کا دل اڑنے کیلئے کیوں پھڑ پھڑاتا تھا۔ کیا اس دل کو معلوم نہیں تھا کہ پنچھی کتنا بھی ہمت والا ہو' پروں کے بغیر اڑ نہیں سکتا۔ یہ بات پروین کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی تھی۔

جمعے کے دن پروین نے سارے گھر کی صفائی کی۔ خاص طور سے ابے کے کمرے کو تو بالکل شیشہ بنا دیا۔ ابے کا کمرہ صاف کرتے ہوئے

کئی بار اس کا دل بھر آیا۔ وہ اب اس گھر میں مہمان تھی۔ اس کے بعد کون اتنی محنت سے ابے کا کمرہ صاف کیا کرے گا۔ کون اس کی ٹانگیں دبائے گا۔ ایسے ہی اَن گنت سوال اس کی ملوک جندڑی میں کانٹے چبھوتے رہتے تھے۔ کئی دن سے ماں اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ وہ سر میں کچی گھانی کا تیل لگا کر اچھی طرح نہائے اس کے بال بالکل روکھے پھیکے ہو رہے ہیں۔ ماں کی بات مانتے ہوئے اس نے سر میں تیل لگایا اور نہائی بھی۔ نہا کر وہ اوپر چھت پر چلی گئی اور اپنے بال سکھانے لگی۔ نبیل کو شیدا اپنے ساتھ دائرے پر لے گیا ہوا تھا۔ پروین کا ارادہ تھا کہ بال سکھانے کے بعد نبیل کے کمرے کو بھی سنبھال دے گی مگر اسی دوران آسیہ آ گئی.......... دونوں سہیلیاں چھت کے ایک گوشے میں سمٹ کر دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ آسیہ نے پروین کو بتایا کہ شوکے کے گھر والوں نے شادی کی تیاری زور شور سے شروع کر دی ہے۔ شوکے کی ماں تو تھی نہیں، اس کی بڑی بھابی ہی سارے کام کر رہی تھی۔ وہ گہنے اور کپڑے وغیرہ لینے کے لئے لاہور گئی ہوئی تھی.............. آسیہ نے ذرا جھجکتے ہوئے پروین کو یہ بھی بتایا کہ بدھ کے روز شوکے نے اپنے ڈیرے پر یاروں دوستوں کے ساتھ منگنی کی خوشی منائی ہے وہاں ناچ گانا ہوا ہے اور نشہ وغیرہ بھی کیا گیا ہے۔

آسیہ نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا ”پینو! کتنا اچھا ہوتا کہ اللہ نے تیری گل نبیل باؤ کے ساتھ بنا دی ہوتی۔ کتنا سوہنا جوڑا ہوتا تمہارا۔ اس شوکے کے ساتھ تو سچی بات ہے تیرا کوئی جوڑ نہیں۔ شوکے اور نبیل میں اتنا ہی فرق ہے جتنا زمین اور آسمان میں ہوتا ہے۔“ پھر آسیہ نے چند لمحے توقف کیا اور بولی۔ ”پینو! کیا اب.......... کچھ نہیں.......... ہو سکتا؟“

پروین نے جھرجھری لے کر آسیہ کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”رب دا واسطہ آسو اب ایسی باتیں نہ کر.......... میری جان فنا ہوتی ہے۔ تم میں سے کوئی شوکے کو اتنا نہیں جانتا جتنا میں جانتی ہوں۔ پہلے اور بات تھی.......... پر اب تو میں اس کی منگ بن چکی ہوں۔ تجھے پتہ ہے کہ شیر کے منہ سے بُرکی (نوالہ) چھیننا کتنا مشکل ہوتا ہے۔“

اس کا مطلب ہے کہ تُو خود کو بُری کی سمجھتی ہے۔ اس کے باوجود سب کچھ چپ چاپ سہ رہی ہے۔“

”اب تو یہ سب کچھ سہنا ہی پڑے گا آسو۔ شوکا اوپر سے نرم نظر آتا ہے لیکن اندر سے اتنا سخت اور کڑوا ہے کہ تو سوچ بھی نہیں سکتی اور اب تو وہ ہر طرح کی بات کرنے کا حقدار بھی بن چکا ہے.......... تجھے پچھلے سال کی بات یاد ہے نا.......... شہر سے لمبے بالوں والے دو لڑکے یہاں تصویریں بنانے آئے تھے۔ وہ دس پندرہ دن یہاں رہے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکے کو رات کے وقت کسی نے مار مار کر بے ہوش کر دیا تھا اور اس کے سارے کپڑے اتار کر اسے پنڈ کے پچھواڑے روڑھی پر ننگا پھینک دیا تھا۔“

آسیہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں یاد ہے۔“

”تمہیں پتہ ہے اس لڑکے کو کس نے مارا تھا اور اس کا قصور کیا تھا؟“

”کس نے مارا تھا؟“ آسیہ نے پوچھا۔

”اسے شوکے نے مارا تھا اور اتنا مارا تھا کہ وہ پاؤں پر چل کر نہیں بلکہ چارپائی پر گاؤں سے گیا تھا۔ اس کا قصور یہ تھا کہ ایک دن اس لڑکے نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ میری تصویر بنانا چاہتا ہے۔ میں نے اسے جھڑک دیا تھا۔ بس یہ بات کسی طرح شوکے تک پہنچ گئی تھی.......... تو اسے ٹھیک

سے جانتی نہیں ہے آسودہ اندر سے بڑا سخت ہے۔''

''پھر کیا ہوگا پنو! تو نبیل کو بھول کر چپ چاپ شوکے کی ڈولی میں بیٹھ جائے گی؟''

پروین نے کوئی جواب نہیں دیا بس سر جھکائے بیٹھی رہی۔

آسیہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا'' پتہ نہیں کیوں پنو! مجھے لگتا ہے کہ مجھ سے یہ سب کچھ دیکھا نہیں جائے گا۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ دو تین ہفتوں کے لئے اپنی خالہ کے پاس نارووال چلی جاؤں.........واپس آؤں تو سب کچھ ہو چکا ہو۔''

دونوں دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ اسی دوران نبیل اور شیدا بھی آگئے۔ نبیل بے دھیانی میں اوپر چھت پر چلا آیا۔ پروین اور آسیہ کو دیکھ کر وہ ذرا سا ٹھٹکا۔ اس سے پہلے کہ وہ واپس چلا جاتا آسیہ نے آواز دے کر اسے بلا لیا۔ وہ ان کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ہونٹوں پر پھیکی سی ہنسی سجا کر اس نے کہا'' کپڑوں شپڑوں کی باتیں ہو رہی ہوں گی۔ ظاہر ہے شادی بیاہ کے موقعے پر ایسی ہی باتیں ہوا کرتی ہیں۔''

اوڑھنی کی اوٹ سے پروین نے عجیب دکھ بھری نظروں سے نبیل کو دیکھا مگر بولی کچھ نہیں آسیہ نے کہا'' بھاجی! آپ کا اندازہ غلط ہے۔ یہاں خوشی کی نہیں غم کی باتیں ہو رہی تھیں۔''

''ارے.........خوشی کے موقعے پر کیا غم، یہ تو ہنسنے کھیلنے اور گیت گانے کے دن ہیں۔'' نبیل نے کوشش کی تھی اس کے باوجود آواز میں چھپا ہوا بے پناہ درد نہاں نہیں رہ سکا۔

''کچھ لوگوں کے لئے تو شاید یہ واقعی خوشی کا موقع ہوگا۔'' پروین نے غم سے چُور لہجے میں کہا اور آنسو آنکھوں میں سمیٹتی ہوئی تیزی سے نیچے چلی گئی۔

اگلے تین چار روز پروین نے شدید ترین ذہنی کشمکش اور ناقابلِ برداشت دکھ میں گذارے تھے۔ کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا تھا کہ بس جو کچھ بھی ہوتا ہے اب جلد سے جلد ہو جائے۔ کبھی وہ آنے والی ساعتوں کے پہاڑ جیسے غم کے بوجھ سے ٹوٹ کر بکھر بھی جاتی تھی۔ اس نے اسکول سے چھٹی لے لی تھی اور کڑھائی سلائی کے کاموں میں مصروف ہو گئی تھی۔ جب کسی وقت تنہائی ملتی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی اور جی ہلکا کر کے پھر سے کام میں مصروف ہو جاتی۔ ایک دو بار ایسا بھی ہوا کہ دل کی بے کلی انتہا کو پہنچی اور وہ سکونِ دل کی خاطر شاہ مدین کے مزار پر جانے کا سوچنے لگی۔ پھر ایک روز ہمت کر کے اس نے آسیہ کو ساتھ لیا اور شاہ جی سے ملنے کے لئے مزار شریف پر جا پہنچی۔

شاہ جی کی شخصیت میں ایک عجیب قسم کا سحر تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اپنے پاس آنے والے عقیدت مند کے دل میں بھی جھانک لیتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں کچھ باتیں عجیب ضرور تھیں۔ مگر مجموعی طور پر ان سے ملنے والا بے حد متاثر ہوتا تھا۔ اس روز بھی شاہ جی نے پروین کے ساتھ کئی الجھی سلجھی باتیں کیں اور پھر کئی منٹ تک اس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھے رہے.........

شاہ جی سے ملنے کے بعد پروین اور آسیہ نے لمبا سفر طے کیا اور ڈھلتی شام سے پہلے ہی گاؤں واپس پہنچ گئیں۔ ابھی وہ چھپڑ کے کنارے تک ہی آئی تھیں کہ اچانک ایک طرف سے بوسیدہ سے کپڑوں والی ایک ادھیڑ عمر عورت نکلی اور اس نے پروین کا بازو پکڑ لیا۔ پہلے تو پروین اور آسیہ ڈر

ہی گئیں۔ مگر جب عورت بولی تو اس کا لہجہ حلیم محسوس ہوا۔ ''ادھر آؤ میری دھی رانیو! میں تم دونوں سے ایک گل کرنا چاہتی ہوں۔'' عورت نے کہا اور پروین کو تقریباً کھینچتی ہوئی ٹاہلی کے درختوں کے نیچے لے گئی۔ آسیہ بھی پروین کے ساتھ تھی۔ ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں میں پروین نے دھیان سے عورت کا چہرہ دیکھا۔ اس کا رنگ گندمی اور بال کھچڑی تھے۔ ایک تسبیح اس کے گلے میں جھول رہی تھی۔ ہاتھوں میں کسی دھات کے کڑے تھے۔ اس نے بڑی محبت سے پروین کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''دھی رانی! اپنے آپ سے جھوٹ مت بول۔ سچ کا پلہ پکڑ سچ کا...... تو اپنے مامے کے پتر سے ویاہ کرنا چاہتی ہے نا تو اسی سے ویاہ کر...... کیونکہ یہی سچ ہے۔ باقی فریب ہے۔ میں تیرے مامے کے پتر کو جانتی ہوں۔ وہ بڑا اچھا منڈا ہے۔ تیری زندگی سکھی ہو جائے گی...... ہاں سکھی ہو جائے گی......''

''مگر اماں جی...... آپ ہیں کون؟'' آسیہ نے پوچھا۔

''دیکھ پُتر! بڑوں کی گل کو درمیان میں ٹوکا نہیں کرتے۔ پہلے مجھے اپنی گل پوری کرنے دے...... میں جانتی ہوں کہ جو گل میں نے کہی ہے، اسے پورا کرنے میں تم کو ایک بندے کا خوف ہے...... تم کو شوکے کا خوف ہے...... مجھے پتہ ہے تمہارے والدین کو بھی شوکے کا بڑا خوف ہوگا۔ شوکا واقعی ڈاہڈا بندہ ہے، لیکن میرے لئے وہ ڈاہڈا نہیں ہے۔ میں اس سے جو بھی کہوں گی اس کو ماننا پڑے گا۔ اس کو ماننا پڑے گا...... بس اب تم دونوں مجھ سے زیادہ سوال جواب نہ کرنا۔ جو میں نے تم سے کہنا تھا وہ کہہ دیا ہے۔''

اس سے پہلے کہ پروین یا آسیہ اس اجنبی عورت سے کچھ پوچھیں، گلی کے موڑ پر گوگا دکھائی دیا۔ پروین اور آسیہ گوگے کی طرف دیکھنے لگیں۔ عورت واپس مڑی اور لنگڑاتی ہوئی درختوں میں اوجھل ہو گئی۔ دونوں اپنی جگہ گم صم اور حیران کھڑی تھیں۔ یہ عورت ان سے کیا کہہ گئی تھی۔ وہ نبیل اور شوکے کے بارے میں اور دوسری باتوں کے بارے میں کیسے جانتی تھی؟ انہوں نے اس عورت کو پہلے کبھی گاؤں میں دیکھا نہیں تھا۔

پروین اور آسیہ آپس میں اس نامعلوم عورت کی باتیں کرتے ہوئے ہی گھر پہنچیں تھیں۔ پروین کی غیر موجودگی میں بھینس کا دودھ ماں نے دھویا تھا۔ اب وہ دودھ ابالنے میں مصروف تھی۔ چولہے کے قریب وہ کچھ کھوئی کھوئی سی بیٹھی تھی۔ اسے پروین اور آسیہ کی آمد کا پتہ ہی نہیں چلا۔ پروین بڑے آرام کے ساتھ پیچھے سے گئی اور ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''شکر اللہ کا تم آ گئیں۔ میرا تو دل ڈر رہا تھا جنت بی بی نے پروین اور آسیہ کا سر چومتے ہوئے کہا۔

''ہم کوئی بالڑیاں تو نہیں تھیں چاچی۔'' آسیہ نے کہا۔

''اس لئے تو ڈر آتا ہے۔'' جنت بی بی نے ٹھنڈی سانس لی۔ پھر سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے بولی۔ ''ویسے بھی آج ایک بڑی عجیب گل ہوئی ہے۔''

''کیسی گل ماں؟'' پروین نے بے تابی سے پوچھا۔

''پیشی کی نماز کے تھوڑی دیر بعد ایک عورت آئی تھی یہاں۔ میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھی ادھیڑ عمر تھی۔ کچھ عجیب سی باتیں کر گئی ہے وہ۔ میرا تو سوچ سوچ کر دماغ پولا ہو رہا ہے۔''

ادھیڑ عمر عورت کا ذکر سن کر پروین اور آسیہ ذرا چونک گئیں۔ پروین نے ماں کے قریب پیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ماں تُو تو بجھارتیں بوجھا رہی ہے کون عورت تھی وہ؟''

جنت بی بی نے کہا۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہوا ہے لیکن ٹھیک سے یاد نہیں پڑتا .... بس عجیب طرح کی الٹی سیدھی باتیں کرتی رہی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ ٹھیک نہیں ہے۔ تم اپنی لڑکی کی زندگی خراب کر رہے ہو۔ اس کی شادی وہیں کرو جہاں اس کی شادی ہونی چاہئے .... میں نے پوچھا کہاں ہونی چاہئے؟ بولی یہ تم بڑی اچھی طرح جانتی ہو مجھ سے مت پوچھو۔ تمہاری بیٹی کا نصیب تمہارے گھر کے اندر سے جاگے گا' باہر سے نہیں جاگے گا۔ میں بہت پوچھتی رہی کہ تم ہو کون۔ کہنے لگی کہ جلدی تمہیں پتہ چل جائے گا۔ بس یہ سمجھ لو کہ اوپر والے نے مجھے تمہاری اور تمہاری بیٹی کی مدد کے لئے بھیجا ہے۔ میں نے پوچھا تم کیا مدد کرو گی۔ کہنے لگی۔ تمہاری دھی رانی کے رستے کے کانٹے صاف کر دوں گی۔''

''کوئی اور بات بھی کی اس نے؟'' پروین نے پوچھا۔

''لگتا ہے کہ وہ نبیل کو بھی جانتی ہے۔ بڑی تعریفیں کر رہی تھی اس کی .... اسے یہ بھی پتہ ہے کہ نبیل تیرے مامے کا پتر ہے اور ولایت سے یہاں آیا ہوا ہے۔''

اسی دوران دین محمد کھنکار کر گلا صاف کرتا ہوا اندر داخل ہو گیا اور جنت بی بی کو خاموش ہونا پڑا۔

☆.........☆.........☆

جو کچھ ہوا تھا اتنا آناً فاناً ہوا تھا کہ نبیل کو کچھ سمجھ ہی نہیں آئی تھی۔ پروین کا والہانہ جذبہ اور اٹل ارادے دیکھ کر نبیل کے دل کا موسم تبدیل ہو اٹھا۔ وہ ایک بار پھر سے پروین کے بارے میں سوچنے اور اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہوا تھا مگر اس سے پہلے کہ اس کی دلی کیفیت کا اظہار پروین پر ہو پاتا۔ اچانک ہی اس کی منگنی ہو گئی تھی .... اور اب سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

نبیل کا دل یہاں سے اچاٹ ہو گیا تھا وہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا مگر پھوپھا دین محمد کسی طرح اسے اجازت دینے پر آمادہ نہیں تھے۔ پھوپھو کا بھی یہی خیال تھا کہ شادی سے پہلے اسے واپس نہیں جانا چاہیے۔ پھوپھو ہر وقت اداس اور غمزدہ نظر آتی تھیں۔ نبیل جب بھی ان کی طرف دیکھتا تھا اسے یہی محسوس ہوتا تھا کہ وہ اب پچھتا رہی ہیں۔ وہ پروین کی دگرگوں حالت دیکھ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے ہونے والے داماد نے منگنی کے بعد اپنے ڈیرے پر جو جشن منایا تھا اس کی خبروں نے بھی جنت بی بی کو ملول کیا تھا۔ جنت بی بی پنج وقت کی نمازی اور پرہیزگار تھیں۔ پروین بھی ان کے نقش قدم پر چلی تھی۔ مگر داماد صاحب کے طور اطوار کی جو تازہ جھلک نظر آئی تھی وہ کچھ خوش آئند نہیں تھی۔

منگنی کے بعد ایک مرتبہ دائرے میں شوکے سے نبیل کی ملاقات ہوئی تھی۔ شوکے کی نظروں میں نبیل کو عجیب سا تمسخر اور تکبر دکھائی دیا تھا۔ اس نے نبیل سے ایک دو باتیں کی تھیں مگر ان باتوں میں بھی مذاق کا رنگ تھا۔ نبیل نے واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ کہ شوکا اندر سے کچھ باہر سے کچھ

ہے۔ شاید اس کی تربیت میں ہی کوئی کمی رہ گئی تھی۔ یا پھر بچپن کی محرومیاں تھیں جن کے سبب اس کے کردار میں کجی تھی۔

پروین کا رنگ ان دنوں ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ پھر ایک روز صبح سویرے شیدے نے اسے بتایا۔ "یار تم آرام سے سوڑہے ہو۔ نیچے حکیم صاحب آئے ہوئے ہیں.......... پروین بی بی کی طبیعت خراب ہے۔"

نبیل جلدی جلدی بالوں میں انگلیاں پھیر کر اور چپل پہن کر نیچے اترا تھا۔ پروین کو تیز بخار تھا۔ کھانسی بھی ہو رہی تھی۔ پھوپھو اور پھوپھا دونوں بڑے دل گرفتہ نظر آتے تھے۔ بخار تو خیر آج چڑھا تھا مگر پروین کی حالت کئی دنوں سے بیماروں جیسی ہی تھی۔

بخار تین چار دن رہا اور اس نے پروین کو مزید کمزور کر دیا۔ وہ کچھ کھاتی پیتی بھی نہیں تھی یوں لگتا تھا کہ زندگی سے ہی بیزار ہو گئی ہے۔

نبیل اکثر دیکھتا تھا کہ پھوپھو جنت کی آنکھیں رو رو کر سوجی ہوئی تھیں.......... اب وہ لوگ واضح طور پر سمجھ گئے تھے کہ ان سے غلط فیصلہ ہوا ہے۔ نیک بیٹیاں بولتی نہیں.......... لیکن نیک بیٹیوں پر جو کچھ بیتتی ہے وہ تو جسم و جان پر ظاہر ہو ہی جاتی ہے۔ پروین کی حالت خاموشی کی زبان میں پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ اسے جس بندھن میں باندھا جا رہا ہے وہ خوشیوں کا بندھن نہیں۔ روتی سسکتی مجبوریوں کا بندھن ہے لیکن اب کیا ہو سکتا تھا کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر پھوپھا دین محمد اور پھوپھی جنت اس رشتے کو ختم کرنے کا سوچتے تو شوکا انہیں زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دیتا۔ شاید پروین نے ٹھیک ہی کہا تھا شوکے جیسے بندے سے اس کی منگ کو چھیننا شیر کے منہ سے نوالہ چھیننے کے مترادف تھا.......... وہ شیر تو شاید نہیں تھا مگر اس کے اندر کوئی بے رحم جانور ضرور چھپا ہوا تھا۔ نبیل کو یہ بے رحم جانور اس کی سرخی مائل آنکھوں سے جھانکتا نظر آیا تھا۔

پروین کی بیماری کی وجہ سے پھوپھا دین محمد نے شوکے اور اس کے گھر والوں سے درخواست کی کہ رخصتی کی تاریخ ایک مہینہ آگے کر دی جائے۔ بہت لیت و لعل کے بعد شوکے کے گھر والوں نے صرف پندرہ دن اور دیئے ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھ دی کہ تاریخ مزید آگے نہیں بڑھے گی۔

ایک دن نبیل کمرے میں بیٹھا تھا۔ پھوپھو جنت اس کے لئے مکئی کی روٹی اور ساگ لے کر آئیں۔ ساتھ میں چاٹی کی لسی اور مکھن بھی تھا۔ نبیل کی طبیعت اب بالکل ٹھیک تھی۔ پرہیزی کھانوں سے اس کی خلاصی ہو چکی تھی.......... وہ بہت کچھ کھانا چاہتا تھا مگر پتہ نہیں کیوں کھا نہیں سکتا تھا۔ اچھی سے اچھی چیز بھی اس کے حلق میں اٹک جاتی تھی۔ غم کا ایک پھندا سا لگا ہوا تھا اس کے گلے میں۔ مکئی کی روٹی اور ساگ کھانے کی حسرت بھی کئی روز سے اس کے دل میں تھی لیکن آج یہ سب کچھ اس کے سامنے آیا تو لقمہ حلق میں پھنسنے لگا۔

پھوپھو سامنے بیٹھی دیکھ رہی تھی۔ پتہ نہیں اس کے دل میں ایک دم کیا آیا۔ اس نے بانہیں کھول کر نبیل کو اپنے سینے سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کوشش کے باوجود اس کی آواز بلند ہوتی چلی جا رہی تھی۔

نیچے کمرے میں لیٹی پروین تک بھی ماں کے رونے کی مدھم آواز پہنچی۔ چارپائی پر لیٹے لیٹے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ رونے کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اپنی جان تو نہیں لے سکتی تھی۔ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو کر ہی رہنا تھا۔ وہ سوچنے لگی شاید اگر اس روز وہ اور آسیہ مل کر سالگرہ منانے کے چکر میں نہ پڑتیں تو یہ سب کچھ اتنی جلدی نہ ہوتا۔ انہیں کچھ اور مہلت مل جاتی کچھ دن اور وہ ان تپتی ہوئی زنجیروں سے آزاد رہتی.......... انسان بس سوچتا ہی رہتا ہے کہ یہ ہوتا تو کیا ہوتا' مگر جو کچھ ہونا ہو وہ تو ہو کر ہی رہتا ہے۔ پر کبھی کبھی اس پراسرار عورت کی شبیہ پروین

کی نظروں میں گھومتی جو ایک روز چھپڑ کنارے ٹاہلی کے درختوں تلے پروین اور آسیہ کو ملی تھی۔ پتہ نہیں کیوں اس عورت کی آواز اب بھی پروین کے کانوں میں گونجتی تھی۔ اس نے کہا تھا میں جانتی ہوں کہ تم کو شوکے کا خوف ہے.......... مجھے پتہ ہے تمہارے والدین کو بھی شوکے کا بڑا خوف ہوگا۔ شوکا واقعی ڈاہڈا بندہ ہے۔ لیکن میرے لئے وہ ڈاہڈا نہیں ہے۔ میں اس سے جو بھی کہوں گی اسے ماننا پڑے گا۔ جو شخص ڈوب رہا ہو اسے تنکے کا سہارا بھی بہت بڑا سہارا لگتا ہے۔ پروین سوچتی شاید وہ عورت واقعی کچھ کر سکتی ہو۔ شاید وہ واقعی کچھ کر گزرے۔ شاید وہ شوکے کو منا سکتی ہو.......... پھر اپنی خام خیالی پر پروین کو خود ہی حیرت ہونے لگتی۔ شوکے کو اپنی جگہ سے ہلانا پہاڑ ہلانے کے برابر تھا۔ پروین اسے لڑکپن سے جانتی تھی۔ ایک بار جو بات اس کے منہ سے نکل جاتی تھی وہ لوہے پر لکیر ہوتی تھی۔ پروین جانتی تھی کہ اب یہ شادی والی بات بھی لوہے پر لکیر ہو چکی ہے۔ شوکا اب ٹلے گا نہیں۔ اسے اب شوکے کے گھر جانا ہی ہوگا۔

☆..........☆..........☆

دھوپ کافی تیز تھی بکائن کے گھنے درخت کے نیچے بھینسیں آرام کر رہی تھیں۔ بھٹے کے اندر چھپڑ کے نیچے پنکھا چل رہا تھا۔ لمبے قد کا شوکا درمیانے قد کے گوگے کے ساتھ واقعی ایسے نظر آتا تھا جیسے اونٹ کے ساتھ بھیڑ۔ شوکا گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا' گوگا اس کی ٹانگیں دبا رہا تھا۔ ساتھ ساتھ اس کی نظر بھٹے پر کام کرتے ہوئے مزدوروں پر تھی۔ آٹھ دس ننگ دھڑنگ بندے گیلی مٹی اپنے پاؤں سے گور ہے تھے ایک درجن پاس بھی کھڑے تھے۔ ان میں مزدور عورتیں اور بچے بھی تھے۔ یہ لوگ گوئی ہوئی مٹی کو سانچوں میں ڈال رہے تھے اور اینٹیں ہر طرف قطاروں کی صورت میں نظر آنے لگی تھیں۔

شوکے نے سردائی کا گلاس پی کر اپنی نوکدار مونچھوں کو انگلی کی مدد سے تھوڑا سا مزید اوپر اٹھایا اور بولا۔ ''تیری ہون والی مالکن کا کیا حال ہے اب؟'' گوگا سمجھ گیا کہ شوکے کا اشارہ پروین کی طرف ہے۔

وہ بولا۔ ''اب تو تڑپتی پھرتی ہے چھوٹے صاحب۔ پر ماسی جنتے اور چاچا دین محمد کچھ کچھ چپ چپ سے ہیں۔''

''کیوں بھئی ان کو کیا تکلیف ہے؟''

''میرا خیال ہے صاحب جی پچھلے سے پچھلے ہفتے منگنی کے بعد آپ نے ڈیرے پر جو موج میلہ کیا تھا وہ چاچے چاچی کو اچھا نہیں لگا۔''

''اوئے بدبختماں! یہ موج میلہ ہم نے کوئی پہلی بار کیا تھا۔ جوان جہان مردوں کے یہ سلسلے تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ ابھی تو میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ شادی کے بعد دیکھنا کیا کرتا ہوں۔ ٹھیک ٹھاک جشن کرنا ہے، سیالکوٹ سے بھی آٹھ دس یار بیلی آرہے ہیں۔''

''وہ تو سب ٹھیک ہے صاحب جی.......... پر.......... میرا مطلب ہے کہ ذرا ویاہ تو ہو لینے دیں۔''

''اوئے! تیرا کیا مطلب ہے میں ڈرتا ہوں کسی سے۔ تو بھی جانتا ہے کہ میں برا بندہ نہیں ہوں۔ لیکن جو میرے دل میں آئے وہ میں کرتا ضرور ہوں۔ کسی کو برا لگے تو سو وار لگے۔''

''مگر دیکھونا جناب! پروین ابھی آپ کی منگ ہے بیوی تو نہیں۔ آپ کے نام تو نہیں لگی ابھی۔''

''اوئے مورکھا! جی داروں کی منگ سمجھو بیوی ہی ہوتی ہے۔'' شوکے نے مونچھیں مروڑ کر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ وہ تصور میں اپنی ہونے والی بیوی کا خوبصورت سراپا دیکھ رہا ہے اور اس حوالے سے اس کے دماغ میں مزے دار خیال آ رہے ہیں۔ اس نے سگریٹ سلگا کر ایک لمبا کش لیا اور گوگے سے بولا۔'' جا بندوں کو ذرا دبکا شبکا لگا کر آ.......... منگل تک تین ٹرالیوں کا آرڈر پورا کرنا ہے۔''

شوکے کے حکم پر گوگا اٹھ ہی رہا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ بوسیدہ لباس والی ایک ادھیڑ عمر عورت اندر داخل ہوئی اور شوکے سے سات آٹھ قدم دور کھڑی ہو کر اسے یک ٹک دیکھنے لگی۔ یہ وہی عورت تھی جسے کچھ دن پہلے نبیل نے درختوں سے اٹھا کر اسپتال پہنچایا تھا۔ عورت کی چال میں ابھی تک نمایاں لنگڑاہٹ موجود تھی۔ اس کی آنکھوں میں شاید آنسوؤں کی نمی تھی۔ دیکھنے کا انداز ایسا تھا کہ شوکا اور گوگا دونوں ہی چونک گئے۔ عورت تھوڑا سا لنگڑاتی ہوئی دو قدم اور آگے آئی۔ پتہ نہیں کیوں شوکے کو اس کی صورت کچھ پہچانی سی لگ رہی تھی۔

''کیا بات ہے مائی؟'' شوکے نے پوچھا۔

عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس شوکے کی طرف دیکھتی رہی۔ عورت کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھوں کا پانی بھی کانپ رہا تھا۔ اس کے دیکھنے کے انداز سے گڑبڑا کر شوکے نے اپنے منہ چڑھے ملازم گوگے کی طرف دیکھا۔'' کون ہے یہ مائی؟'' اس نے گوگے سے پوچھا۔

گوگا بولا۔'' پتہ نہیں جی۔ بس ایک دو وار پنڈ میں گھومتے دیکھا ہے اسے۔''

شوکا ایک بار پھر مڑ کر مائی کی طرف دیکھنے لگا۔ مائی آہستہ آہستہ چلتی گوگے کے بالکل قریب چلی آئی۔ وہ سیدھا شوکے کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ اب اس کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بہنے لگے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور شوکے کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ شوکا تھوڑا سا بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔

''تم کون ہو اماں؟'' شوکے نے پوچھا۔

''اماں ہی ہوں پتر...... تیری اماں ہی ہوں...... تیری بے بے ہوں۔ بھول گیا اپنی بے بے کو......'' وہ زارو قطار رو رہی تھی۔

''بے.......... بے۔'' شوکے کے ہونٹوں سے تحیر آمیز آواز نکلی۔'' کون بے بے؟'' وہ جیسے لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔

''تیری بے بے.......... جو ایک دن تجھے برآمدے میں سوتا چھوڑ کر اور تیرا منہ چوم کر کہیں دفع ہو گئی تھی۔''

شوکے نے آنکھیں سکیڑ کر بڑے غور سے اپنے سامنے کھڑی عورت کو دیکھا۔ اس کے ذہن کے پردے پر ماضی کی ایک فلم سی چلنے لگی تھی.......... جب اس کی ماں اسے چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ کچے ذہن کا ایک نوعمر لڑکا تھا۔ اسے ٹھیک سے یاد نہیں تھا کہ کتنی عمر تھی اس کی؟ شاید آٹھ نو سال.......... اسے بس دھندلی دھندلی سی ایک شبیہہ یاد تھی.......... ایک گم صم سی صورت' جو شوکے کے باپ سے ڈری سہمی رہتی تھی۔ جو شوکے کے باپ کی گھن گرج کے سامنے بڑی دھیمی آواز میں بولتی تھی۔ پھر ایک دن وہ چلی گئی تھی۔ شوکا کچھ دن تو اداس رہا تھا مگر جلد ہی اس کا باپ اسے اپنے ساتھ لاہور لے گیا تھا۔ لاہور بہت بڑا شہر تھا۔ سیالکوٹ سے بھی بڑا۔ وہاں وہ لوگ تین چار مہینے رہے تھے۔ ان تین چار مہینوں میں شوکا بہت کچھ

بھول گیا تھا.......... آنے والے ماہ وسال میں اس نے اپنی ماں کے بارے میں اڑتی اڑتی کئی باتیں سنی تھیں۔ کسی نے کہا تھا وہ مرگئی۔ کسی کا خیال تھا کہ وہ خاوند کے ظلم سے اکتا کر کہیں چلی گئی۔ کچھ لوگ غلط قسم کی باتیں بھی کرتے تھے مگر ایسی تمام غلط یا صحیح باتیں شوکے کے کانوں میں بس اس وقت تک پڑیں جب تک وہ لڑکا تھا۔ مگر جب وہ جوان ہوا اور ذرا ذراسی بات پر اس کی آنکھوں میں خون اترنے لگا تو کسی کو جرات نہیں ہوئی کہ اس قسم کے موضوعات پر اس کے سامنے زبان کھول سکے۔ اسی طرح اٹھارہ انیس برس گزر گئے تھے.......... اور آج.......... اس چمکدار اور گرم صبح کو ایک کمرے کے اندر ایک عورت اچانک اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی اور اسے بتا رہی تھی کہ وہ اس کی ماں ہے اور وہ واپس آ گئی ہے۔

شوکے کی نگاہیں بدستور عورت پر جمی تھیں۔ دھندلے نقوش اجاگر ہونے لگے تھے۔ دل گواہی دینے لگا تھا کہ عورت جو کہہ رہی ہے وہ درست ہے۔ شوکے کی آنکھیں پوری کی پوری کھلی ہوئی تھیں۔ عورت ایک بار پھر آگے بڑھی اور شوکے سے چمٹ گئی۔ وہ اس کا منہ سر چومنے لگی۔ اس کے کندھے، اس کا سینہ، ہر جگہ اپنے ہونٹ ثبت کرنے لگی۔ شوکا بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سپاٹ تھا۔ گوگا بھی گم صم کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

عورت رو رو کر بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ پھر وہ شوکے کے بازو پکڑ کر اسے ساتھ والے کمرے میں لے آئی۔ دونوں چارپائی پر بیٹھ گئے۔ عورت اشک بار لہجے میں بولی۔ ”تُو نے مجھے پہچان لیا ہے نا شوکے؟“

شوکا گھمبیر لہجے میں بولا۔ ”میں نے تیری شکل پہچان لی ہے۔ پر تجھے نہیں پہچان سکا اور شاید کبھی پہچان بھی نہیں سکوں گا۔ تو کیا چیز ہے..........؟ تُو نے.......... تُو نے ایسا کیوں کیا میرے ساتھ؟ کیوں کیا میرے ساتھ؟“

”پُتر! میں اب آ گئی ہوں تو تجھے سب کچھ بتاؤں گی بھی.......... میں بتاؤں گی سب کچھ۔“

”مجھے کچھ نہیں سننا ہے تجھ سے۔ بس تُو چلی جا یہاں سے.......... اگر میری زندگی سے نکل گئی تھی تو بس نکلی ہی رہ.......... اب واپس مت آ۔“ شوکے جیسے پتھر دل کی آواز بھی آنسوؤں کے بوجھ سے بیٹھ گئی تھی۔

عورت نے ایک بار پھر شوکے کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ کربناک انداز میں رو رہی تھی اور کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ شوکے کا سر جھکا ہوا تھا۔

کافی دیر تک شکوے شکایتوں، آنسوؤں اور سسکیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر جذبات کا چڑھا ہوا دریا اتر گیا.......... دوپہر ہونے والی تھی۔ دھوپ کچھ اور چمکدار کچھ اور گرم ہو گئی تھی۔ شوکے کی ماں شوکے کو اپنی اٹھارہ انیس سال پرانی روئیداد سنا رہی تھی۔ اس کی آواز کہیں بہت دور کسی کنوئیں سے آتی محسوس ہوتی تھی۔

وہ کہہ رہی تھی۔ ”اللہ بخشے تیرا پیو ارادے کا بڑا پکا تھا۔ بس جس دن سے مجھے دیکھا تھا اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ ویاہ کرے گا تو مجھ سے ورنہ کنوارہ ہی بیٹھا رہے گا۔ میری منگنی برادری کے ہی ایک منڈے سے ہو گئی ہوئی تھی اس کا نام گلزار تھا۔ ہم ایک دوجے کو تھوڑا بہت پسند بھی کرتے تھے۔ منگنی جب لمبی ہو جائے تو رشتے داری میں کئی طرح کی باتیں ہو جاتی ہیں۔ ہمارے بڑوں میں بھی کچھ باتیں ہو گئی ہوئی تھیں اور کسی وقت تو لگتا تھا کہ منگنی ختم ہو جائے گی۔ پھر جب اللہ بخشے تمہارے پیو سراج محمد کی قسمت نے زور مارا تو منگنی سچ مچ ٹوٹ گئی اور میں دوہنی بن کر تیرے پیو کے گھر آ

گئی..........رب سوہنے کو حاضر ناظر جان کر کہتی ہوں شوکے جب میں ایک بار تیرے پیو کے گھر آ گئی تو میں نے ہر پرانی بات بھلا دی۔ چار چھ مہینوں میں ہماری اتنی محبت ہوگئی تھی کہ میں تجھے بتا نہیں سکتی..........آنے والے مہینوں اور سالوں میں یہ محبت کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھتی گئی۔ پہلے تیری ایک بہن ہوئی وہ اللہ کو پیاری ہوگئی پھر تو ہوا۔ ہمارے ویہڑے میں رونق لگ گئی۔ تیرے آنے سے ہماری محبت اور بھی گوڑھی ہوئی۔ سب کچھ تھا پر ایک بات ایسی تھی جو ہمیشہ دکھی رکھتی تھی۔ اللہ بخشے تیرے پیو کے دماغ میں یہ شک بیٹھا ہوا تھا کہ میں اب بھی گلزار سے محبت کرتی ہوں اور جب اکیلی ہوتی ہوں تو اس کا نام لے لے کر ہوکے بھرتی ہوں۔“

شوکے کی ماں صادقہ نے ایک لمحہ توقف کر کے اوڑھنی کے پلو سے آنسو پونچھے اور بولی۔ ”پتر! پورے ست سال میں نے اپنی جندڑی کو رولا اور اس کوشش میں لگی رہی کہ تیرے پیو کے دماغ سے یہ وہم نکل جائے۔ اسے یقین آ جائے کہ میں اب صرف..........اور صرف اس سے محبت کرتی ہوں۔ وہی میری جند جان کا مالک ہے اور میرے سر کا سائیں بھی..........پر پتر اللہ بخشے سراج کے شک نے میری ایک نہیں چلنے دی۔ میں اندر ہی اندر روگی ہوگئی تھی۔ سراج کا شک شام سویرے زہریلے ناگ کی طرح مجھے ڈنگ مارتا رہتا تھا۔ میں تڑپتی تھی، وہ بھی تڑپتا ہوگا مگر اپنے دماغ سے شک کو نہیں نکالتا تھا۔ پھر مجھے لگنے لگا کہ میں پاگلوں جیسی ہو جاؤں گی۔ جب سب کچھ میری برداشت سے باہر ہو گیا پتر تو ایک رات میں نے تیرے سوئے پڑے پیو کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ تیرا منہ چوما اور چپ چاپ گھر سے نکل گئی۔“

شوکے کی ماں صادقہ کی آنکھیں ایک بار پھر چھلک پڑی تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر اتھرو پونچھتی رہی۔ پھر ایک کربناک آہ بھر کر بولی۔ ”اللہ جانے میرا فیصلہ صحیح تھا یا غلط، پر میں چلی گئی تھی۔ میرے سوہنے پتر! تجھے نہیں پتہ میں نے پچھلے اٹھارہ ورے کس طرح گزارے ہیں۔ میں دن رات آگ پر چلتی رہی ہوں۔ جلتی بھی نہیں تھی مرتی بھی نہیں تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ میں پاگل ہوگئی ہوں۔ میں نے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں پتر۔ پہلے کراچی کا ایک اللہ ترس بزرگ مجھے اپنے گھر لے گیا تھا۔ میں ڈھائی تین سال وہاں رہی۔ پھر وہ اپنے رب کو پیارا ہو گیا۔ اس کی اولاد کا سلوک مجھ سے اچھا نہ رہا۔ میں حیدرآباد آ گئی وہاں ایک گھر میں کئی سال روٹی کپڑے پر کام کرتی رہی، اپنی جان رولتی رہی۔ پھر بیمار ہوئی اور وہاں سے بھی نکال دی گئی۔ ملتان آ گئی۔ پورے دو سال فقیروں کے حال ایک مزار پر پڑی رہی۔ میری کہانی بڑی لمبی ہے پتر! بڑے زخم ہیں میرے پنڈے پر۔ جتنے چھیلوں گی، اتنا ہی لہو دے گا..........اتنا ہی لہو دے گا۔“ بولتے بولتے صادقہ کی ہچکی بندھ گئی اور اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا۔

ماں پتر بڑی دیر کے بعد ملے تھے۔ دکھیاری ماں نے ان گنت موسم اپنے پتر کا مکھڑا دیکھنے کی اڈیک میں گزارے تھے۔ اب وہ دیکھ رہی تھی اور بس دیکھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ شام ہوئی اور پھر رات ہوگئی۔ وہ شوکے کو اپنے پاس سے اٹھنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ گوگے سے کہہ کر شوکے نے رات کا کھانا بھی وہیں بیٹھے پر منگوا لیا۔

کھانا کھاتے ہوئے شوکے نے کہا۔ ”بے بے! تو کتنی سخت دل والی ہے۔ کیا ایک بار بھی تیرے دل میں نہیں آئی کہ ابے کا یا میرا منہ دیکھے؟“

”یہ بات دل میں آتی تھی پتر! ضرور آتی تھی اور کبھی کبھی تو صبح شام آتی تھی۔ پھر میں یہاں سے اتنی دکھی ہو کر گئی تھی..........اور میں نے

تیرے پیو کو اپنا منہ نہ دکھانے کی اتنی بڑی قسم کھائی ہوئی تھی کہ میرے پاؤں اس پنڈ کی طرف اٹھ ہی نہیں سکتے تھے۔ مجھے پتہ ہے میرے جانے کے بعد تیرے اللہ بخشے پیو نے اور دوجے لوگوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ صادقہ نے وہی کیا ہے جس کا ڈر تھا۔ وہ گلزار کے ساتھ نکل گئی ہے۔ پر مجھے تیری قسمے پتر! میں نے اپنے ویاہ کے ایک سال بعد ایک میلے میں آخری وار گلزارے کی شکل دیکھی تھی۔ گلزارا اسی گاؤں میں رہا ہے اور مجھے مائی سیداں نے بتایا ہے کہ تین چار سال پہلے فوت ہوا ہے.......... اب بھی میں اس پنڈ میں اس لیے آئی ہوں کہ سراج اور گلزارا دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں.......... اب بس مجھے تیری مانگ تھی پتر۔ تجھے دیکھنے کی پیاس تھی۔ اب میرا مرنا آسان ہو جائے گا پتر۔''

''یہ اگلے روز کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا شوکا اب ماں کو گھر لے آیا تھا۔ ماں پتر دونوں کمرے میں بیٹھے تھے۔ شوکا بولا۔'' بے بے! کل تو نے کہا تھا کہ تجھ سے ایک گل کہنی ہے۔ وہ کیا گل تھی؟''

صادقہ کی نگاہ کافی کمزور ہو چکی تھی اور آنکھوں سے ہر وقت پانی بہتا رہتا تھا.......... اس نے آہستگی سے اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے اور شوکے کے سر پر ممتا بھرا پیار دیتے ہوئی بولی۔''اس پنڈ میں ایک کڑی ہے پتر۔ اس کا نام پروین ہے۔ وہ دین محمد کی دھی ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے شوکے! تُو پروین سے ویاہ کر رہا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟'' شوکے نے سینہ پھلا کر اقرار میں سر ہلایا۔

صادقہ بولی۔''پتر تو اس کڑی سے ویاہ نہیں کرے گا۔ وہ کڑی تیرے لیے نہیں ہے۔ میں اپنی نوں خود لے کر آؤں گی۔''

''بے بے! یہ تو کیا کہہ رہی ہے؟ پینو.......... پینو میری ضد ہے۔ میں نے اس سے ویاہ کرنا ہی کرنا ہے۔''

''دیکھ پتر! میرے ان جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھ۔ تیری دکھیاری ماں اپنے سارے دکھوں کے بدلے تجھ سے ایک گل.......... بس ایک گل کہہ رہی ہے۔ تُو اس کڑی سے ویاہ نہیں کرے گا۔ وہ تیرے لیے نہیں ہے۔''

''میرے لیے ہے یا نہیں۔ پر میں نے اسے اپنے گھر لانا ہے۔ چاہے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔'' شوکا بے اختیار ہو کر غرایا۔

صادقہ کا رنگ ایک دم زرد ہو گیا۔ وہ چند لمحے ٹکٹکی باندھ کر شوکے کو دیکھتی رہی۔ پھر انگلی اٹھا کر ہیجانی لہجے میں بولی۔''ایک بار.......... یہی گل.......... بالکل یہی گل تیرے اللہ بخشے پیو نے بھی کہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ مجھے ویاہ کر لائے گا۔ چاہے کچھ بھی کرنا پڑے اور اس نے مجھے ویاہ لیا تھا۔ پر اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ تجھے پتہ ہے نا کہ کیا ہوا تھا؟ تیرے پیو کی کہانی تیرے سامنے ہے پتر! کہیں تیری کہانی تیرے پیو کی کہانی سے نہ مل جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے پتر! کہیں ایسا نہ ہو جائے۔'' مائی صادقہ کی آنکھوں میں غم ہی غم نظر آنے لگا تھا۔

''بے بے! اک گل میں تجھے صاف کہہ دینا چاہتا ہوں۔ میں جان تو دے سکتا ہوں پر اپنی منگ نہیں چھوڑوں گا۔ تُو اپنے اور میرے پیار کا اندازہ لگانا چاہتی ہے تو کوئی اور گل مجھ سے منوا لے۔''

''نہ پتر! ایسی گل نہ کر۔ تُو اسی رستے پر چل رہا ہے جس پر تیرا اللہ بخشے پیو چلا تھا۔ تجھے پتہ بھی ہے کہ وہ کڑی پروین اپنے مامے کے پتر کو چاہتی ہے۔ تُو اس سے شادی کر لے گا۔ وہ کڑی سب کچھ بھول بھی جائے گی۔ سر سے پیر تک تیری بھی بن جائے گی۔ پھر بھی تیرے دل میں شک تو رہے گا۔ تُو ساری حیاتی اسے شبہے کی نظروں سے دیکھے گا۔ وہ ہنسے گی تو تجھے لگے گا کہ وہ مامے کے پتر کے لیے ہنسی ہے۔ روئے گی تو لگے گا کہ مامے

کے پُتر کے لیے روتی ہے۔ تیری ساری حیاتی اگ میں سڑنے لگے گی پُتر! یہ کام نہ کر.......... دیکھ میں تیرے سامنے ہتھ جوڑ دیتی ہوں۔ یہ کڑی تیرے لیے نہیں، یہ کسی اور کے لیے ہے اور جو کڑیاں کسی اور کے لیے ہوتی ہیں۔ ان کو اپنا بنا لیا جائے تو پھر گھروں کے ویہڑوں میں شک کا زہریلا بوٹا اگتا ہے اور اس کی زہریلی چھاں میں سب کچھ مر جاتا ہے۔''

''بے بے! تُو نے آتے ساتھ ہی دل ساڑنے والی باتیں کیوں شروع کر دی ہیں؟''

''یہ دل ساڑنے والی باتیں نہیں پُتر۔ یہ تو سڑنے گلنے سے بچانے والی باتیں ہیں۔ دیکھ جس طرح اس منڈے نبیل کے لیے دین محمد کی کڑی ہے۔ اس طرح تیرے لیے بھی کہیں نہ کہیں ایک کڑی ہوگی۔ وہ تیرے لیے ہوگی شوکے.......... اس کے دل میں تیرا پیار سوہنے رب نے اتار کر رکھا ہوا ہوگا۔ وہ ضرور ہوگی شوکے.......... وہ کہیں نہ کہیں ضرور تجھے اڈیک رہی ہوگی۔ میرے سوہنے پُتر تو دین محمد کی کڑی کا خیال دل سے نکال دے۔ تو اپنی کہانی اپنے پیو کی کہانی سے وکھری کر لے۔'' ادھیڑ عمر صادقہ کی آنکھیں مسلسل آنسو برسا رہی تھیں۔

شوکے نے بے چینی سے اپنے سر کو دائیں بائیں حرکت دی اور بولا ''یہ نہیں ہوسکتا بے بے.......... یہ نہیں ہوسکتا۔''

''میرے سوہنے پُتر! اپنی ماں کی یہ اک گل من لے۔''

''یہ گل میں نہیں من سکتا.......... میں جانتا ہوں بے بے! تو ایسا کیوں کہہ رہی ہے۔ مجھے تحصیل ہسپتال کے ڈاکٹر نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہ ولائتی لمڈ ہینگ (نبیل) تجھے بیلے سے اٹھا کر ہسپتال لے کر گیا تھا۔ تُو اس کے اسی احسان کا بدلہ چکانا چاہتی ہے۔ ایک احسان کے بدلے اپنے پُتر کی پوری حیاتی برباد کرنا چاہتی ہے۔''

''نہیں میرے پُتر! ایسی کوئی بات نہیں۔ جو تُو کہہ رہا ہے وہ بھی ٹھیک ہے۔ اس منڈے نے مجھے ویرانے سے اٹھا کر ہسپتال پہنچایا تھا اور یہ کوئی چھوٹا احسان نہیں تھا۔ حیاتی بچانے والا تو سوہنا رب ہوتا ہے لیکن وہ منڈا وسیلہ بنا ہے۔ پر جو بات میں تجھ سے کہہ رہی ہوں۔ وہ اس لیے نہیں کہہ رہی کہ نبیل نے مجھے ہسپتال پہنچایا۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں نے اپنی حیاتی کے اٹھارہ سال روتے ہوئے گزارے ہیں.......... تجھے پتہ نہیں پُتر کہ..........''

''مجھے سب پتہ ہے بے بے۔'' شوکے نے تیزی سے ماں کی بات کاٹی۔ ''تو میرا سر بھی منگ لے تو میں دینے کو تیار ہوں مگر مجھ سے وہ گل نہ منوا جو میں من نہیں سکتا..........''

اتنے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ شوکے کی بڑی بھرجائی وندناتی ہوئی اندر آ گئی۔ وہ اونچی لمبی فربہ اندام عورت تھی اور چہرے سے سخت گیر نظر آتی تھی۔ وہ ماتھے پر تیوری ڈال کر بولی۔ ''شوکے! مجھے تو جنت بی بی اور دین محمد کی نیت میں ہی فتور لگتا ہے۔ شاید اس ولائتی منڈے کی وجہ سے ان کے ارادے ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں۔''

''کیوں اب کیا ہوا؟'' شوکا بھی تیوری ڈال کر بولا۔

''پینو کی ماں نے مجھے بلایا تھا۔ کہہ رہی ہے کہ ویاہ کی تاریخ ایک ڈیڑھ مہینہ اور آگے کر دو۔ پینو کی طبیعت ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں

ہوئی۔ چنگی بھلی بیٹھی بھانڈے دھورہی تھی۔ ماں کی باتیں سنو تو لگتا ہے کہ ہسپتال کی واڑ میں پڑی ہے۔''

شوکے کی تیوری کچھ اور بڑھ گئی۔ انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولا۔'' لگتا ہے کہ پنو کے ساتھ ساتھ اس کے ماں پیو کی طبیعت بھی اب ٹھیک کرنی پڑے گی۔'' وہ ایک دم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''کک کہاں جارہا ہے پتر؟'' صادقہ ایک دم پریشان ہو کر بولی۔

''آج فیصلہ کر کے ہی چھوڑوں گا۔'' شوکا غرایا۔ اس کا سرخ رنگ مزید سرخ ہو کر انگارے کی طرح ہو گیا تھا۔

''میری بات سن پتر!'' صادقہ نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

وہ دروازے کے پاس پہنچا تو بھرجائی نے بھی اس کا بازو پکڑا لیکن وہ اس کا ہاتھ جھٹکتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کی آنکھوں میں شک اور غصے کے بھانبھڑ جل رہے تھے۔

☆..........☆..........☆

پروین بھوری بھینس کے آگے چارہ رکھ کر بڑے دلار سے اس کے پنڈے پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ بھینس کا کٹا اپنا سر پروین کی ٹانگ کے ساتھ رگڑ رہا تھا جیسے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پروین نے لاڈ سے اس کے سر پر چپت لگائی۔ آج کئی دنوں بعد پروین کی طبیعت تھوڑی سی اچھی ہوئی تھی۔ ماں نے پروین کے بڑے بھائی فضل دین کو بھی شہر سے بلا رکھا تھا۔ فضل سامنے چارپائی پر بیٹھا نبیل سے باتیں کر رہا تھا۔ پروین نے ایک دو بار چور نظروں سے نبیل کو دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی غم کی پرچھائیاں صاف نظر آتی تھیں۔ وہی غم جو پروین کو بھی دن رات اندر سے کھا رہا تھا۔ کھوکھلا کر رہا تھا.......... پروین کا ابا برآنڈے میں تھا اور ذرا کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹا ہوا تھا۔ گندم کی کٹائی کا کام بڑا تھکا دینے والا ہوتا ہے اور اس نے دین محمد کو نڈھال کر دیا تھا۔

اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ پروین کی ماں نے دروازہ کھولا۔ پروین نے جلدی سے گھونگھٹ نکال لیا۔ اس کا چڑی جیسا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ دروازے میں شوکا کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ گاؤں کی مسجد کے امام مولوی عطا نظر آ رہے تھے۔

شوکے کی گھن گرج والی آواز پروین کے کانوں میں پڑی۔ وہ پروین کے بھائی فضل سے کہہ رہا تھا کہ وہ بیٹھک کا دروازہ کھلوائے۔

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ پروین کے ساتھ ساتھ دیگر گھر والے بھی چونک گئے تھے۔ پروین کے بھائی فضل نے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور آنے والوں کو بیٹھک میں بٹھایا۔ مگر شوکا دندناتا ہوا برآنڈے میں آ گیا۔ اس کی حرکات و سکنات میں عجیب جارحانہ پن نظر آ رہا تھا۔ وہ پروین کے ابا اور بھائی فضل کو لے کر برآنڈے کے ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔ اندر سے باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ نبیل کا دوست شیدا گھر کے سامنے والے کنویں سے نہا کر آیا تھا۔ اس کے بال بھیگے ہوئے تھے اور گردن میں تولیہ تھا۔

اس نے جنت بی بی سے پوچھا۔'' ماں جی! کوئی پڑدے نے وغیرہ آئے ہیں؟''

جنت بی بی نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر ہاں میں جواب دیا۔ نبیل نے اشارے سے شیدے کو پاس بلایا اور اسے لے کر اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پروین ماں کے ساتھ برآمدے میں آن کھڑی ہوئی۔ اندر سے باتوں کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں یہ آواز اتنی اونچی ہوگئی کہ ماں بیٹی کو صاف سنائی دینے لگی۔

شوکا بڑے طیش سے کہہ رہا تھا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے چاچا کہ تم لوگوں کی نیت خراب ہوگئی ہے۔''

دین محمد بھی بلند آواز سے بولا۔ ''شوکے! یہ تو کیسی باتیں کر رہا ہے؟ یہ تو سوچ تو کس کے گھر میں ہے؟ کیا نکاح اور رخصتی وغیرہ کی باتیں اس طریقے سے کی جاتی ہیں۔ یہ تو.......... بڑوں کے کرنے کی باتیں ہیں۔ تیرے لیے تو مناسب ہی نہیں کہ تو اس طرح کی باتیں منہ سے نکالے.......... جا یہاں سے..........اور اپنے کسی بڑے کو بھیج۔''

''بڑوں کو ساتھ ہی لے کر آیا ہوں چاچا..........تو بس اپنی طرف سے دو گواہوں کا انتظام کر۔''

فضل نے غصے سے کہا۔ ''شوکے! مجھے لگتا ہے کہ تیرا دماغ ہل گیا ہے۔ اوئے بدبختا اس طرح گل کرتے ہیں نکاح کی..........؟''

''اوئے فضلے! زبان سنبھال کر بات کر۔ میں تیری بڑی عزت کر رہا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ میرے منہ سے بھی کچھ نکل جائے۔''

فضل مزید بلند آواز میں بولا۔ ''اوئے تو نکال لے منہ سے.......... جو سانپ کڈنا ہے کڈ لے.......... ہماری بہن ہے۔ کوئی گاجر مولی نہیں ہے کہ تُو اس طرح اکھاڑ کر لے جائے گا۔''

''اکھاڑنے پر آ جاؤں تو اکھاڑ بھی سکتا ہوں، لیکن جو کام عزت سے ہو وہ چنگا ہوتا ہے اور اپنی عزت اب تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے۔''

''شوکے! میں کہتا ہوں زبان سنبھال کر بات کر، میں تیرا منہ توڑ دوں گا۔''

پھر شاید دونوں میں ہاتھا پائی ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ دین محمد نے چیخ چیخ کر دونوں کو روکا تھا۔ پروین اور جنت بی بی دروازے کے پاس کھڑی تھیں اور یوں کانپ رہی تھیں جیسے دونوں کو لرزے کا بخار چڑھ گیا ہو۔ فضل اور شوکا دونوں غرا رہے تھے۔

پھر کمرے کے اندر شوکے کی ذرا ہانپتی ہوئی آواز آئی۔ ''دیکھ چاچا! پہلے تو میں صرف نکاح کے لیے آیا تھا..........اب میں..........اسی وقت رخصتی لے کر جاؤں گا۔ اگر نہ لے کر جاؤں گا تو مجھ سے بڑا کنجر اس پورے علاقے میں کوئی نہیں..........تو ابھی تیار کر اپنی کڑی کو۔''

فضل گرجا۔ ''شوکے! اب اگر میری بہن کا نام تیری زبان پر آیا تو خدا کی قسم فساد ہو جائے گا۔ تیرے لیے اس وقت بہتر یہی ہے کہ یہاں سے دفع ہو جا۔''

''میں ہو جاتا ہوں دفع لیکن میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ میری گھر والی میرے ساتھ جائے گی۔ تمہیں اس کو تورنا پڑے گا۔ ابھی اسی گھڑی۔''

شوکا ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ اس کا لہجہ اچانک ہی انتہائی خطرناک ہو گیا تھا۔

پھر شوکا پھنکارتا ہوا نکلا۔ جنتے اور پروین سہمی ہوئی چڑیوں کی طرح ایک دروازے کی اوٹ میں ہو گئیں۔ بوڑھا دین محمد شوکے کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شوکا بار بار اس کا ہاتھ جھٹک دیتا تھا۔ صحن کے درمیان میں پہنچ کر شوکا گھوما اور زور سے آواز دے کر بولا۔

''چاچی جنتے کہاں ہے تو؟ اپنی دھی کو تیار کر میں اسے ساتھ لے جانے آیا ہوں۔''

''پتر شوکے! میری بات تو سن............ دیکھ اس طرح کی باتیں اس طرح سے نہیں کرتے تماشا لگ جاتا ہے۔ تو اس طرح کر............''

''میں نے اب کسی طرح نہیں کرنا۔ تم سب کی نیت کا پتہ مجھے چل گیا ہے۔ تم نے چپ چپیتے کڑی اس ولایتی منڈے کے ساتھ ٹور دینی ہے۔ میں کوئی دودھ پیتا کاکا نہیں ہوں۔ چلو اسے تیار کرو۔ میں اپنی گھر والی کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔'' شوکے کا چہرہ زیادہ سرخ ہو جانے والی اینٹ جیسا ہو گیا تھا۔

دین محمد جانتا تھا کہ شوکے کی ہر جگہ شنوائی ہے۔ پولیس والوں سے بھی اس کی یاری دوستی ہے۔ وہ اس پھڈے کو زیادہ بڑھانا نہیں چاہتا تھا اس لیے منت ترلے پر آ گیا تھا۔ فضل جوان تھا اس لیے اس کا چہرہ رنگ پر رنگ بدل رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ بے تحاشہ شور سن کر نبیل اور شیدا بھی کچی سیڑھیوں پر آن کھڑے ہوئے تھے۔ اڑوس پڑوس کے لوگ دیواروں کے اوپر سے جھانکنے لگے تھے۔

شوکا پھنکارتا ہوا بیٹھک میں داخل ہوا اس نے مولوی عطا صاحب سے کہا۔ ''مولوی جی! آپ فارم نکالیں۔ نکاح شروع کریں۔''

شوکے کے ساتھ آنے والے اس کے تایا اور بڑے بھائی نے بھی کہا۔ ''آہو جی! آپ نکاح شروع کرو۔''

شوکا سینہ پھلا کر ٹانگیں چوڑی کر کے سامنے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ یہی وقت تھا جب فضل تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس نے شوکے کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے اسے اٹھایا۔ شوکے نے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر اپنے سر کی خوفناک ٹکر فضل کے منہ پر ماری۔ پھر اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ لڑھکتا ہوا باہر گلی میں جا گرا۔ باہر شام کا ویلا تھا۔ سورج کا لال سرخ تھال دور نہر پار آم کے رُکھوں کے پیچھے چھپتا جا رہا تھا۔ اس سرخ تھال سے نکلنے والی آخری کرنیں گھروں کی کچی دیواروں پر پڑ رہی تھیں اور ان دیواروں میں بھوسے کے تنکے چمکتے نظر آتے تھے۔ دیواروں کے اوپر اور کواڑوں کے پیچھے یہاں وہاں حیران چہرے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ شوکے کی ٹکر اتنے زور سے لگی تھی کہ فضل کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ فضل اٹھتا۔ شوکے نے بڑی وحشت کے عالم میں قریب پڑی کسی اٹھائی۔ الٹی کسی کا زوردار وار اس نے فضل کی گردن پر کیا۔ فضل وہیں تیورا کر گر پڑا۔ جنت بی بی اور پروین ننگے سر چیختی ہوئی باہر نکلیں اور فضل کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگیں۔ اس کی ناک سے خون فوارے کی طرح نکل رہا تھا۔ گردن پر لگنے والی شدید چوٹ نے اس کا رنگ ہلدی کر دیا تھا۔

یہ سارا منظر اب نبیل کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ نبیل کا قد کافی لمبا تھا۔ شانے چوڑے اور کاٹھی مضبوط تھی۔ اپنے باپ حسنے کی طرح اس کے سینے میں بھی ایک دلیر دل دھڑکتا تھا۔ ایک گبھرو کا دل جو خطرے کو دیکھ کر لرزتا نہیں بلکہ اندرونی حرارت سے سنسنا اٹھتا ہے۔ نبیل اور شیدے نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر دونوں تیزی سے شوکے اور اس کے ساتھیوں پر جھپٹے۔ نبیل کے دو بھرپور مکوں نے شوکے کے اگلے دانت ہلا دیئے اور وہ لڑکھڑاتا ہوا گلی میں بندھی ایک گائے کے قدموں میں جا گرا۔ شیدے نے بڑی جرأت سے شوکے کی پھینکی ہوئی کسی اٹھائی تھی۔ شوکے کا بڑا بھائی شیدے پر جھپٹا تو اس نے وار خالی دے کر کسی کی ضرب اس کے سر پر لگائی۔ عقب سے شوکے کے تایا نے شیدے کو جکڑنا چاہا تو شیدے نے اس کے منہ پر بھی کسی کی دستی دے ماری............ لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ غیر متوقع تھا۔ ماسی زینب کے مکان کی اوٹ سے ایک دم آٹھ دس

بندے نکلے اور لڑائی میں کود پڑے۔ وہ لاٹھیوں سے مسلح تھے۔ ایک دو کے پاس رائفلیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ نبیل نے شوکے کو گندی نالی کے قریب گرا لیا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ اس پر پوری طرح قابو پا سکتا۔ رائفل کے کندے کی زوردار ضرب اس کی کنپٹی پر لگی اور وہ ایک طرف کو جھک گیا۔ شوکا نیچے سے اٹھا اور نبیل کو روئی کی طرح دھنکنے لگا۔ دوسری طرف شیدا بھی لاٹھیوں کی چوٹیں کھا کر بھوسے کے ڈھیر کے قریب گر گیا تھا۔ اسے لاٹھیوں سے بچانے کی کوشش میں دین محمد کا اپنا سر پھٹ گیا تھا اور پیشانی سے خون کی دھاریں بہنے لگی تھیں۔ ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ گالیوں، للکاروں اور چیخوں سے قرب وجوار گونج رہے تھے۔ بشیر کمہار چیخ چیخ کر لوگوں کو بلا رہا تھا تاکہ وہ اس لڑائی کو رکوائیں۔ اچانک ایک طرف سے شوکے کی ماں بڑی تیزی سے برآمد ہوئی۔ شوکا اس وقت گرے ہوئے نبیل پر لاٹھی کے وار کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے جان سے ہی مار ڈالے گا۔ ماں تڑپ کے شوکے کے سامنے آ گئی۔ ''نہیں پتر! روک لے اپنا ہاتھ.........میں کہتی ہوں روک لے۔ میں کہتی ہوں روک لے۔''

اس نے دو تین لاٹھیاں اپنے ہاتھوں پر بھی کھائیں مگر شوکے کے ساتھ لپٹ کر اسے روکنے میں کامیاب رہی۔ شوکا ان لمحوں میں ایک خونخوار درندہ نظر آ رہا تھا۔ میٹھے نرم لہجے میں بات کرنے والا نجانے کہاں اُڑن چھو ہو گیا تھا اور اس کے اندر سے نہایت غصیلی اور زہریلی اصلیت نکل کر سامنے آ گئی تھی۔

وہ چنگھاڑ کر مولوی سے بولا۔ جو ایک کونے میں سمٹے ہوئے تھے۔ ''مولوی جی! تم ادھر آؤ.........چلو میرا نکاح پڑھا.........ان کی بہن کی ڈولی آج ان کے کندھوں پر ہی رکھوا کر لے جاؤں گا۔''

پھر اس نے چیخ کر گوگے کو مخاطب کیا۔ ''گوگے تو جا بشارت میراثی کے گھر سے ڈولی تیار کروا کے لا۔''

گوگے نے اثبات میں سر ہلایا اور واپس مڑا مگر شوکے کی ماں نے چیخ کر اسے روک لیا۔ ''رک جا مور کھا! تُو کہیں نہیں جائے گا۔''

''بے بے! تو بیچ میں سے ہٹ جا۔'' شوکا چیخا۔

نبیل لہولہان تھا مگر پھر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر شوکے کی طرف بڑھا۔ صادقہ نبیل اور شوکے کے درمیان تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت اتنی طاقت نجانے کہاں سے آ گئی تھی اس میں۔ اس نے ایک ہاتھ سے نبیل کو اور دوسرے سے شوکے کو روکا۔

وہ چیخ کر نبیل سے بولی۔ ''نہیں پتر! تُو آگے نہ آ.........کوئی بھی آگے نہ آئے میں اپنے بیٹے کو خود روکتی ہوں۔''

شوکا گرجا۔ ''بے بے! تو سامنے سے ہٹ جا۔ آج اگر انہوں نے اپنی بہن کی ڈولی خود میرے گھر نہ پہنچائی تو میں.........ان میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

شوکے کے ساتھ آنے والے مسلح افراد پوری طرح چوکس تھے اور شوکے کے ایک اشارے پر سب کچھ کر سکتے تھے۔ شوکے نے اپنے ایک کارندے کے ہاتھوں سے گلاب اور پھولوں والا ہار جھپٹ کر اپنے گلے میں ڈالا اور ایک بار پھر چیخ کر بولا۔ ''مولوی! میں تم سے کہتا ہوں تم ادھر آؤ۔ نکاح شروع کرو تم.........''

شوکے کا بڑا بھائی مولوی عطا کو بازو سے تھام کر بیٹھک کی طرف لایا۔ شوکا بھی بیٹھک کی طرف مڑا مگر صادقہ ایک بار پھر اس کے راستے

میں کھڑی ہوگئی۔ ''نہیں شوکے! میں تجھے یہ نکاح نہیں پڑھوانے دوں گی۔ دین محمد کی کڑی تیری ووہٹی نہیں بنے گی۔ وہ تیری ووہٹی نہیں ہے۔''

''وہ میری ووہٹی ہے۔''

''وہ نہیں ہے پتر!''

''وہ ہے۔''

''وہ نہیں ہے۔'' صادقہ اسے دھکیلتی ہوئی پیچھے لے گئی۔ سورج ڈوب گیا تھا۔ اندھیرا ہونے لگا تھا۔ کھوہ کے پاس لگی دو بیریوں پر پرندے چکرا رہے تھے۔ کھوہ چلانے والے بیل بھی جیسے چند لمحے رک کر یہ حیرت انگیز اور نہایت سنگین کشمکش دیکھنے لگے تھے۔ گلیوں میں اور چھتوں پر لوگ جمع ہوچکے تھے۔ شوکا نکاح خواں کی طرف بڑھ رہا تھا اور صادقہ اسے روک رہی تھی' پیچھے دھکیل رہی تھی۔ اس کشمکش میں دونوں کنویں کے بالکل نزدیک پہنچ گئے تھے۔ پھر اچانک وہ ہوا جس کے بارے میں کسی نے سوچا تک نہیں تھا۔ صادقہ نے شوکے کو پیچھے کی طرف دھکیلا۔ اولو کے پاس چکنی مٹی پر سے شوکے کا پاؤں پھسلا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن اسی دوران دوجا پاؤں بھی پھسل گیا۔ وہ الٹ کر کنویں میں گرا۔ پہلے اس کا سر بڑے پُرشور انداز میں کنویں کی آہنی ٹنڈوں سے ٹکرایا۔ پھر وہ کنویں کی دیوار سے ٹکراتا ہوا کوئی تیس فٹ نیچے کنویں کی تہہ میں گرا۔

صادقہ چند لمحے کے لیے سکتے میں رہ گئی اور صادقہ ہی کیا یہ منظر دیکھنے والا ہر فرد سکتے میں تھا۔ پھر صادقہ کے ہونٹوں سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ وہ کنویں کے کنارے جھک کر چند بار زور سے چیخی ''شوکے............شوکے............'' پھر دیکھنے والی آنکھوں نے ایک اور ہولناک منظر دیکھا۔ صادقہ نے بھی گہرے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ چاروں طرف سے لوگ یلغار کر کے کنوئیں کے کنارے پہنچے جو کمزور دل تھے وہ دہشت زدہ چہروں کے ساتھ دور کھڑے رہ گئے۔ کنارے پہنچنے والوں نے دیکھا۔ تین چار فٹ گہرے پانی میں صادقہ نے شوکے کو کسی بچے کی طرح اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ شوکے کا سر اس زور کے ساتھ کنویں کی دیوار سے ٹکرایا تھا کہ ایک طرف سے پچک کر رہ گیا تھا۔ اس کا جبڑا ٹوٹ کر ایک طرف لٹک گیا تھا اور وہ جھٹکوں سے سانس لے رہا تھا۔ صادقہ خود بھی بری طرح زخمی ہوئی تھی۔ اس کا دوپٹہ کنویں کے کنارے سے چار پانچ فٹ نیچے آہنی ٹنڈوں سے اٹکا ہوا تھا۔ چپل پانی میں تیر رہی تھی۔ اس کی ایک آنکھ ضائع ہوچکی تھی اور گردن پر ایک گہرا گھاؤ آیا تھا۔ اس گھاؤ سے خون نکل نکل کر پانی میں گر رہا تھا۔

''شوکے! آنکھیں کھول............شوکے میرے بچے۔ یہ کیا ہوگیا میرے بچے؟'' وہ کربناک انداز میں بول رہی تھی اور شوکے کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ رہی تھی۔ بیلوں کی جوڑی نے خود بخود چلنا شروع کر دیا تھا۔ آہنی ٹنڈیں کنویں سے پانی کھینچ رہی تھیں۔ ٹنڈوں سے رسنے والا پانی بارش کے قطروں کی طرح ماں بیٹے پر گر رہا تھا اور گلاب کے ان پھولوں پر گر رہا تھا جو شوکے کے گلے سے ٹوٹ کر پانی پر بکھر گئے تھے............ شوکے نے دو تین زوردار ہچکیاں لیں اور دیکھتے ہی دیکھتے دم توڑ دیا۔ کنویں کی نیم تاریکی میں صادقہ نے ہری ہری کائی والی گیلی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائی اور اس کے حلق سے ایک دلدوز آواز نکل کر کنویں کے اندر گونجتی چلی گئی۔

اس اثنا میں لوگوں نے بیلوں کی جوڑی کو روک دیا تھا۔ بشیر کمہار اور صدیق کے علاوہ دو تین اور باہمت نوجوان بھی آہنی ٹنڈوں کے ساتھ

لٹک لٹک کر کنویں میں اتر گئے۔ اتنی دیر میں صادقہ غش کھا کر پانی میں گر پڑی تھی۔ نوجوانوں نے زخمی صادقہ کا منہ پانی سے نکالا اور اسے کنویں سے نکالنے کی تدبیریں کرنے لگے۔

پندرہ بیس منٹ کے بعد ماں اور بیٹے کو کنویں سے نکال لیا گیا۔ بیٹا مردہ حالت میں تھا اور ماں زندہ حالت میں.........مگر وہ بھی زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکی۔ کنویں میں گرتے ہوئے اس کی گردن آہنی ٹنڈ دں سے ٹکرائی تھی اور اس بری طرح گھائل ہوئی تھی کہ ساری نسیں وغیرہ کٹ کر رہ گئی تھیں۔ مقامی ڈاکٹر دوڑا ہوا آیا۔ اس نے خون وغیرہ روکنے کی کوشش کی مگر یہ ایک بے سود کوشش تھی۔ صادقہ اس وقت کسی حد تک ہوش میں تھی۔ اس نے اپنی سلامت آنکھ کو کئی بار جھپکا پھر خون آلود چہرے والے نبیل کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ نبیل اس کے قریب جھک گیا۔ صادقہ نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ نبیل کے گال پر پھیرا۔ اس کی ایک آنکھ میں خون تھا' دوسری میں آنسو.........خون اور آنسو۔ اس نے سرگوشی کے لہجے میں اٹک اٹک کر کہا۔ ''میرے شہری پُتر! تُو شہر جائے گا نا؟ شہر جا کر لوگوں کو بتانا.........ہم پینڈو لوگ اتنے بُرے نہیں ہوتے۔''

چار پانچ منٹ بعد صادقہ پر پھر غشی طاری ہو گئی تھی.........پھر اسی حالت میں اس نے دم توڑ دیا تھا۔ اپنے ازدواجی رشتوں کی بنیاد ''شک'' پر رکھنے والوں کو ایک یادگار درس دے کر وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔

☆.........☆.........☆

شوکے اور اس کی بے بے کی کہانی ختم ہوئے اب ایک مہینہ ہونے کو آیا تھا۔ چند دن پنڈ میں اور پنڈ سے باہر ہر طرف شوکے اور صادقہ کی ناگہانی موت کا ہی چرچا رہا تھا۔ پھر حسب دستور آہستہ آہستہ اس خبر پر دوسری چھوٹی بڑی خبروں کی گرد تہہ در تہہ چڑھنے لگی تھی اور اب دائرے میں بیٹھے ہوئے لوگ شوکے اور صادقہ کے علاوہ ادھر ادھر کی باتیں بھی کرنے لگے تھے۔ فصل کی باتیں' بارش اور مہنگائی کی باتیں' لڑکیوں کے اسکول اور شاہ مدین کے مزار پر ہونے والی کسی لڑائی کی باتیں۔ دینو موچی اور بشیر کمہار کی نوک جھونک ایک بار پھر چہروں پر مسکراہٹیں لانے لگی تھی۔

دینو بولا۔ ''بشیرے! تُو بھی کھوتے کا کھوتا ہی رہے گا۔ جس طرح تیرے کھوتے بلیوں کی طرح چھیچھڑے نہیں کھا سکتے۔ اس طرح جہاز بھی سوئی گیس سے نہیں چل سکتا۔ جہاز پٹرول سے ہی چلتا ہے۔''

بشیر کمہار نے تنک کر کہا۔ ''اوئے لومڑا۔ تیرا پیو ساری عمر کچے چمڑے کی جوتی بناتا رہا ہے کہ نہیں؟ اب تُو نئی روشنی کا موچی بن گیا ہے۔ ملائم چمڑے کی فیشن ایبل گرگابی بناتا ہے اور پھر ہمارے کھیسے کاٹتا ہے۔ دنیا اسی طرح آگے کی طرف چلتی ہے۔ کیا پتہ کل کلاں جہاز بھی سوئی گیس سے چلنے لگیں۔''

چاچے حیات نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''اوئے مجھے جہاز سے یاد آیا کہ نبیل پتر بھی کل شام ولایت واپس جا رہا ہے۔''

نبیل کے واپس جانے کی بات نے ایک بار پھر سب کو اداس کر دیا۔ حسنے کا پُتر ان سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ وہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھتے تھے اور اس کی سیانی بیانی باتیں سنتے تھے۔ اس نے حسنے سے بھی بڑھ کر ان کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ جب سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ نبیل واپس

جا رہا ہے۔ انہوں نے اسے روکنے کی سر توڑ کوشش کی تھی.......... مگر اس کا ارادہ نہیں بدلا تھا۔ بس یہ تسلیاں دیتا رہا تھا کہ وہ واپس ضرور آئے گا۔ (حسنا بھی تو یہی کہا کرتا تھا کہ وہ ایک دن واپس ضرور آئے گا.......... اور وہ کبھی نہیں آیا تھا)۔

جس وقت دائرے کی دھواں دھواں فضا میں یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ نبیل اپنے کمرے میں اپنا سامان سمیٹ رہا تھا۔ یہ صبح آٹھ نو بجے کا وقت تھا اسے کل واپس جانا تھا مگر اب اس نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔ وہ آج ہی جا رہا تھا۔ ٹکٹ کا تھوڑا سا مسئلہ تھا اس لیے وہ چاہتا تھا کہ ایک دن پہلے ہی لاہور پہنچ جائے۔ لاہور میں وہ ایک رات کسی ہوٹل میں بھی کاٹ سکتا تھا.......... شیدے کو نبیل نے تین دن پہلے ہی لاہور بھیج دیا تھا۔ اسے لاہور کی سیر کا شوق بھی بہت تھا۔ اب شیدا بڑی شدت سے لاہور میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔

سامان پیک کرتے ہوئے بار بار نبیل کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ وہ چند ماہ جو نبیل نے سویر پور گاؤں میں گزارے تھے اس کی زندگی کے یادگار دن تھے۔ سویر پور گاؤں سے اسے اپنی زندگی کی ایک نئے سویر ملی تھی۔ وہ جب یہاں آیا تھا تو جاں بلب تھا۔ اب جا رہا تھا تو صحت مند تھا۔ سیانے کہتے ہیں کہ کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ نبیل کو اپنے جسم کے لیے صحت ملی تھی مگر روح کے لیے ایک لاعلاج روگ بھی مل گیا تھا۔ وہ پروین کا غم لے کر یہاں سے جا رہا تھا۔ پروین جو ایک معمہ بن کر اس کے سامنے آئی تھی.......... نبیل کو وہ ہیجان خیز رات یاد تھی جب اس نے نیم غنودگی کی حالت میں اپنے پاؤں پر پروین کا بھیگا ہوا نرم لمس محسوس کیا تھا.......... اس رات اس کے دل نے گواہی دی تھی کہ پروین اس سے محبت کرتی ہے.......... مگر آنے والے دنوں میں یہ گواہی' مایوس کن واقعات کی گرد میں چھپتی چلی گئی تھی اور پھر وہ واقعہ ہوا تھا جس نے ایک طرح سے سب کچھ ختم کر ڈالا تھا۔ پروین نے خاموشی سے منگنی کروالی تھی.......... منگنی کے بعد کئی واقعات پیش آئے تھے۔ ان میں شوکے کی موت کا واقعہ بھی تھا اور اب اس واقعے کو بھی ایک ماہ گزرنے والا تھا.......... مگر پروین کے رویے میں پھر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہی سمندر سے گہری خاموشی، جس کی تہہ کا کچھ اتہ پتہ نہیں چلتا تھا۔ وہ بہت کم نبیل کے سامنے آتی تھی۔ بات بھی صرف اتنی ہی کرتی تھی جتنی بہت ضروری ہوتی تھی۔ اس کی لاپرواہی اور بے اعتنائی اتنی نمایاں تھی کہ نبیل کا دل کٹ کر رہ جاتا تھا۔ تنہائی میں اس کی آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں اور وہ اکثر سوچتا تھا کہ اس سے نجانے کون سی خطا ہوئی ہے۔ آخر کار اس نے یہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ پھوپھو اور پھوپھا بڑے دلگیر ہوئے تھے۔ کل نبیل نے پھوپھو کی گود میں سر رکھ کر کہا تھا کہ وہ چند ماہ بعد ضرور واپس آئے گا۔ اپنے بیٹے اور اس کی دادی کو بھی ساتھ لائے گا۔ پھر ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ یہیں رہ جائیں.......... اگر ایسا ہو گیا تو پھر وہ یہاں چند مربعے زمین خریدے گا۔ ایک بڑا زرعی فارم بنائے گا۔ جس طرح پروین نے اسکول کھول کر گاؤں میں روشنی پھیلائی ہے۔ وہ جدید زراعت کے ذریعے گاؤں میں اجالا کرے گا۔

کہنے کو تو یہ ساری باتیں نبیل نے کہی تھیں مگر اسے بہت کم یقین تھا کہ وہ ایسا کرے گا۔ کوئی معجزہ ہو جاتا تو اور بات تھی ورنہ دوبارہ گاؤں کا رخ کرنا اس کے لیے دشوار تھا۔ یہ زمین اسے پیاری تھی مگر اس زمین کی روح تو پروین تھی۔ وہ اس زمین میں سے نکل گئی تھی۔ اب تو کسی وقت یہ سب کچھ اسے اجنبی سا لگنے لگتا تھا۔ اس کا اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ نہر کنارے کے درختوں میں سرسرانے والی ہوا زہریلی ہے۔ گندم' جوار اور کماد کے کھیتوں میں سانپ چھپے ہوئے ہیں۔ روہی کے پانیوں میں موت کے بھنور ہیں۔ اسے یہ سب کچھ کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ لہٰذا وہ واپس جا رہا

تھا۔شاید دوبارہ آنے کے لیے............شاید کبھی نہ آنے کے لیے۔

سامان سمیٹتے ہوئے اس نے کمرے کی الماری خالی کی تو ایک اٹیچی کیس کے پیچھے سے اسے ایک چابی والا کھلونا ملا۔موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا ایک لال رنگ کا باوا جس کی آنکھوں میں تنگ تھے۔نبیل نے کھلونے کو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔شاید یہی وہ کھلونا تھا جس کی شبیہہ نبیل کے ذہن میں ابھر ابھر کر غائب ہو جایا کرتی تھی۔اس نے اس سرخ رنگ کے کھلونے پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرا اور ماضی کے کئی نقش اسکے ذہن میں اجاگر ہو گئے............چند ہی لمحوں کے اندر کئی بھولی بسری باتیں یاد آ گئیں............یہ کھلونا............یہ کھلونا شاید اسی پنڈ کے میلے میں اسے کسی نے خرید کر دیا تھا۔کس نے خرید کر دیا تھا؟کس نے خرید کر دیا تھا؟شاید اس نے جس کے کندھوں پر بیٹھ کر وہ اس پنڈ کی سیر کیا کرتا تھا............اس نے ذہن پر زور دیا اور اسے اپنے پیارے والد کی شکل وصورت پردہ تصور پر نمایاں ہوتی محسوس ہوئی۔بہت سی باتیں یاد آ گئی تھیں۔بہت سے زخموں سے خون رسنا شروع ہو گیا تھا۔اس کے باپ کو یہ گاؤں محبوب تھا۔یہاں کے لوگ محبوب تھے۔اپنی بہن اور اپنا بہنوئی محبوب تھے۔

اس نے نبیل سے کہا تھا۔''پتر!تو اپنے گاؤں ضرور جانا۔اپنی پھوپھو اور پھوپھا سے ضرور ملنا۔''

وہ روتا رہا اور سوچتا رہا............اس کے سینے سے آہیں نکلتی رہیں۔وہ بڑبڑایا۔''ابو میں نے آپ کی بات پوری کی۔میں یہاں اس گاؤں میں آیا تھا۔یہاں رہا تھا............اور اب میں واپس جا رہا ہوں............کوئی مجھے یہاں سے واپس بھیج رہا ہے۔کچھ نہ کہنے والی'سدا چپ رہنے والی آپ کی پکھ لگتی مجھے واپس بھیج رہی ہے۔

وہ چابی والے کھلونے کو دیکھتا رہا۔ماضی کے گرد آلود خانوں سے بھولی بسری یادیں نکل نکل کر اس کی نمناک آنکھوں کے سامنے سے گزرتی رہیں۔ایک دل گداز سُر تھا جو اس کے آس پاس کہیں سے ابھر رہا تھا۔گاؤں کی خوشبو میں ڈوبا ہوا یہ سُر آج اسے کچھ اور بھی بے حال کر رہا تھا۔نبیل کے سامنے رکھا ہوا کھلونا وہی تھا جو کچھ عرصہ پہلے پروین نے شاہ مدین کے میلے سے خریدا تھا۔

☆............☆............☆

وہ پورے چوبیس گھنٹے سوچتی رہی تھی کہ نبیل سے کچھ کہے۔ اسے پنڈ چھوڑنے سے روک لے۔ اقرار محبت کے وہ دو لفظ اپنی زبان پر لے آئے جو آج تک اس کی زبان پر نہیں آ سکے۔ ساری شرم وحیا ایک طرف رکھ کر نبیل سے کہہ دے۔ میں تم سے محبت نہیں کرتی۔ میں تمہیں پوجتی ہوں اگر تم یہ پنڈ چھوڑ گئے تو شاید میں بھی چھوڑ جاؤں گی اور صرف پنڈ نہیں چھوڑوں گی یہ دنیا بھی چھوڑ دوں گی مگر الفاظ ہمیشہ کی طرح اس کے حلق میں پھنس پھنس گئے۔ اس کے کول ہاتھ پسینے میں بھیگتے رہے۔ اس کے ماتھے پر تریلیاں آتی رہیں مگر وہ کہہ کچھ نہ سکی.........

اور اب وقت گزر گیا تھا۔ اب نبیل تنہا نہیں تھا۔ اس کے اردگرد گاؤں والوں کا ہجوم تھا۔ اکثر کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ کوئی اسے گلے سے لگا کر بھینچ رہا تھا۔ کوئی سر پر پیار دے رہا تھا' کوئی منہ چوم رہا تھا۔ یہ نبیل کو وداع کرنے والوں کا ہجوم تھا اور اس ہجوم سے کچھ فاصلے پر پروین' صحن میں لگے پیڑ سے پیچھے خاموش کھڑی تھی۔ کوئی سینے کے اندر سے اس کا دل نکال کر لے جا رہا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر روئے مگر کہاں روئے۔ یہاں تو رونے کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں تھی۔ سارے گھر میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ رونا اسے اس طرح آ رہا تھا جیسے تیز بارش کے بعد ڈیک نالے میں ہڑ آتا ہے۔ اسے لگا کہ اگر وہ یہاں کھڑی رہی تو اچانک دھاڑیں مار مار کر رونے لگے گی اور سب کے سب ششدر ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگیں گے۔

آسیہ اس کے پاس ہی کھڑی تھی جونہی وہ نکلنے کی طرف گئی۔ پروین صحن سے باہر نکلی اور ہجوم سے کنی کتراتی ہوئی دوسری گلی میں آ گئی۔ گلی میں آتے ہی اس کے قدم تیز رفتاری سے اٹھنے لگے۔ کبھی وہ دوڑنے لگتی' کبھی چلنے لگتی۔ وہ دل کھول کر رونے کے لیے کوئی تنہا گوشہ چاہتی تھی.........

وہ چاچے افضل کی پیلیوں کی طرف جا رہی تھی جہاں مکئی کی اونچی فصل کھڑی تھی۔

وہ چاچے افضل کے کھیت میں نڈھال سی ہو کر ایک پگڈنڈی پر بیٹھ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ تیز سے تیز مینہ میں بھی ڈیک نالے کے اندر اتنا پانی نہیں آیا ہوگا جتنا آج پروین کی آنکھوں میں تھا۔ وہ بیٹھی رہی' وہ روتی رہی۔ اس کی حسین انکھڑیوں سے غم کے دریا بہتے رہے پتہ نہیں کتنی دیر گزر گئی۔ شاید دس پندرہ منٹ' شاید آدھ پون گھنٹہ یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ سورج اب کافی اوپر آ گیا تھا۔ ہوا میں ہریالی کی مہک پھیل گئی تھی۔ اچانک پروین کے کانوں میں گاؤں کے کوچوان تھیمے کی آواز گونجی۔ وہ منہ سے تخ تخ کی آواز نکال کر اپنے گھوڑے کو تیز کر رہا تھا۔ پروین نے کھیت میں سے سر نکال کر دیکھا اور اس کا سینہ دھڑ ادھڑ بجنے لگا۔ وہ تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ پچھلی سیٹ پر نبیل اور شیدے کے اٹیچی کیس وغیرہ رکھے تھے۔ تانگے کے پیچھے پیچھے دو گھوڑیاں جا رہی تھیں۔ ان گھوڑیوں پر ماسٹر ارشاد اور فیقا کبڈی والا تھے۔ یقیناً وہ نبیل کو بس پر چڑھانے جا رہے تھے جس راستے پر یہ لوگ جا رہے تھے وہ سخت ناہموار تھا۔ تانگہ اور گھوڑیاں بہت سست رفتار سے چل رہی تھیں۔

نبیل کی رخصتی کا منظر اتنا کربناک تھا کہ پروین کا روتا بلکتا دل سو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ اچانک ہی وہ بے اختیار ہو کر آگے بڑھی۔ چند قدم چل کر رکی' پھر بڑھی۔ پھر وہ تانگے کے پیچھے چلنے لگی' کبھی وہ چل رہی تھی' کبھی دوڑ رہی تھی۔ اس کے کبوتر جیسے سفید ملوک پاؤں ننگے تھے۔ ان پاؤں میں کانٹے چبھ رہے تھے' ٹوٹ رہے تھے' لہولہان کر رہے تھے مگر عشق صادق ایک تند و تیز ڈیک نالہ ہی تھا جو اسے اپنے ساتھ بہائے چلا جا رہا تھا۔ وہ نبیل کو پکارنا چاہتی تھی۔ پہلی بار.........اور شاید آخری بار.........مگر آواز اس کے ہونٹوں تک آ کے رک جاتی تھی۔ سینے سے ہونٹوں تک کا

مختصر فاصلہ.........وہی ''مختصر فاصلہ'' جو مشرقی عورت کی شرم و حیا طے نہیں کر سکی۔ سفید اونچی پگڑی والے دین محمد کی بیٹی بھی یہ فاصلہ طے نہیں کر پا رہی تھی۔ نبیل اس سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔

تانگے میں اگلی نشست پر بیٹھے بیٹھے نبیل کے ہونٹوں سے ایک سرد آہ سی نکلی۔ نہر کی پٹڑی کے پاس سے تانگے کو گھوم جانا تھا۔ سو یہ پورا گاؤں نبیل کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا.........شاید ہمیشہ کے لیے۔ اس نے آخری بار گھوم کر گاؤں کی طرف دیکھا۔ اس کی نظر پہلے گاؤں پر پڑی.........پھر گاؤں والی پر.........اس نے پروین کو دیکھا۔ دو کھیتوں کے درمیان بڑی تیزی سے چلتے چلتے وہ لڑکھڑا کر رک گئی تھی۔ سورج کی کرنیں براہ راست اس کے حسین چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ یہ چہرہ خاموش تھا مگر خاموشی کی زبان میں چیخ چیخ کر اسے پکار رہا تھا.........پھر وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر ذرا نشیبی جگہ پر چلی گئی۔ چری کے کھیت نے پروین کو نبیل کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔

''تھے تانگہ روکو۔'' نبیل نے بے چین ہو کر کہا۔

تانگہ پہلے ہی سست رفتاری سے چل رہا تھا اب رک گیا۔ گھوڑیاں بھی رک گئیں۔ ماسٹر ارشاد اور رفیقا کبڈی والا نبیل کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ کوچوان سمیت ان تینوں میں سے کسی نے وہ منظر نہیں دیکھا تھا جو نبیل نے دیکھا تھا۔

نبیل نے ان سے کہا۔ ''تم یہیں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔''

پھر وہ جست لگا کر تانگے سے اترا اور بے اختیار چری کے کھیت کی طرف دوڑا۔ اس کے سینے میں جیسے دھڑکن کے گولے پھٹ رہے تھے۔ وہ نشیب میں پہنچا تو سامنے ہی پروین کھڑی نظر آئی۔ اس نے ایک ٹنڈ منڈ کیکر کے ساتھ ٹیک لگا رکھی تھی اور چہرہ دوپٹے میں چھپا کر ہچکیوں سے روتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا پورا جسم جیسے زلزلے کی زد میں تھا.........

نبیل نے اسے شانوں سے تھام لیا۔ ''پروین.........پروین۔'' اس نے کانپتے لہجے میں اسے آواز دی۔

پروین نے چہرہ بدستور اوڑھنی میں چھپا رکھا تھا۔ وہ اسی طرح روتے ہوئے بولی۔ ''مجھے میری غلطی کی اتنی بڑی سزا نہ دیں۔ آپ یہی چاہتے تھے نا کہ میں اپنی زبان سے کہوں کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ میں کہہ دیتی ہوں۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں.........میں محبت کرتی ہوں.........میں کرتی ہوں۔''

یہ چند لمحے جیسے صدیوں پر بھاری تھے۔ یہ چند الفاظ ہزار دنوں کی گفتگو سے زیادہ پُر اثر تھے۔

نبیل نے جذبات کے سامنے بے بس ہو کر پروین کو بانہوں میں بھر لیا۔ ''غلطی تو میری ہے پروین! معافی تو مجھے مانگنی ہے.........میں کیوں تیرے پیار کو نہ سمجھ سکا۔ معافی تو مجھے مانگنی ہے۔'' اس نے پروین کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ پروین کے ننگے زخمی پاؤں کانپتے چلے جا رہے تھے۔

ان دونوں کو ''چری'' کی بلند قامت فصل نے اپنے اندر یوں چھپا رکھا تھا کہ ہر نگاہ سے اوجھل کر دیا تھا۔ پروین نے ایک دلدوز ہچکی لے کر اپنا تر بتر چہرہ اوپر اٹھایا اور نبیل سے لپٹ گئی۔ اس کے بدن میں موتیے کی کچی کلیوں کی مہک تھی۔

''مجھے معاف کردو پروین.......... مجھے معاف کر دو۔ مجھے تمہاری چاہت کی شدت کا اندازہ نہیں تھا۔'' نبیل بولتا چلا گیا اور اس کے تر بتر چہرے کو چومتا چلا گیا۔

کھیت' درخت' پگڈنڈیاں' پرندے' ہوائیں اور ان کے اوپر چمکتا سورج اور اس کے اوپر نیلگوں آسماں..........اور اس سے آگے پوری کائنات..........سب کچھ ایک دم مسکرا اٹھا تھا۔ قدرت نے ایک دم ہی نبیل کے دامن میں خوشیوں کے انبار لگا دیئے تھے..........اور اسے معلوم نہیں تھا کہ خوشیوں کے ان انباروں میں ایک اور بہت بڑی خوشی شامل ہونے والی ہے۔ عین اس وقت جب چری کے اس کھیت میں پروین اور نبیل ایک دوجے کی بانہوں میں تھے..........ایک کار لاہور سے سوہے پور گاؤں کے لیے روانہ ہو رہی تھی۔ اس کار میں شکیل' سومی اور نبیل کی والدہ موجود تھیں۔ انوری بیگم کی گود میں نبیل کا ہمکتا ہوا بیٹا تھا..........انوری بیگم نے برسوں بعد آخر اپنی قسم توڑ دی تھی۔ وہ سوہے پور جا رہی تھی۔ سوہے پور جو اس کے بیٹے کا گاؤں تھا جو اس کے پوتے کا گاؤں تھا..........کار میں لگے ہوئے کیسٹ پلیئر پر نغمہ گونج رہا تھا۔ ''سوہنی دھرتی' اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے۔'' کرائے کی کار کا لاہوری ڈرائیور اس نغمے کی دھن پر مست نظر آ رہا تھا۔

ختم شد